بسم الله الرحمن الرحيم

CONTENTS

Sr. No.	Article	Author	Page No.
1.	A Critical Study of Western Agenda in the Perspective of Cultural War	Dr. Muhammad Akram Sajid / Dr. Umer Hayat	05
2.	The New Muslim Generation in Japan: Challenge and Future	Muhammad Arif Mateen / Dr. Sher Ali	26

ضیائے تحقیق

جلد ۵ | جولائی تا دسمبر ۲۰۱۴ء | شمارہ ۹

ISSN:2225-613X Indexed by ISLAMICUS

سرپرستِ اعلیٰ

ڈاکٹر محمد علی

(وائس چانسلر)

مُدیرِ اعلیٰ

ڈاکٹر ہمایوں عباس

چیئرمین: شعبہ علومِ اسلامیہ وعربی

ڈین: فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ

مُدیر

ڈاکٹر عمر حیات

معاون مُدیران

ڈاکٹر یاسر عرفات اعوان، ڈاکٹر افتخار احمد خان

شعبۂ علومِ اسلامیہ وعربی

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

E-mail:drhumayunabbas@gcuf.edu.pk

E-mail:drumarhayyat@yahoo.com

Phone:041-9201559

مجلسِ مشاورت

ملکی	غیرملکی
پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی صدر مرکزِ تحقیق، فیصل آباد	***Dr. Llioyd Ridgeon*** گلاسگو یونیورسٹی، برطانیہ
ڈاکٹر غلام شمس الرحمٰن بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان	**ڈاکٹر حافظ محمد منیر** جامعہ الازہر، مصر
پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی پنجاب یونیورسٹی، لاہور	**ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم** جامعہ ہمدرد نئی دلی، انڈیا
ڈاکٹر حافظ محمد سجاد علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد	***Dr. Edan Aslan*** یونیورسٹی آف ویانا
ڈاکٹر محمد فاروق حیدر گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور	**غلام زرقانی** آسٹن، امریکہ
ڈاکٹر محمد اکرم ورک پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، کامونکی	**ڈاکٹر جعفر اسماعیل جافعی** یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ، ساؤتھ افریقہ
ڈاکٹر معراج الاسلام ضیاء پشاور یونی ورسٹی، پشاور	ڈاکٹر شاہ کوثر مصطفیٰ **بنگلہ دیش**

Zia-e-Tahqeeq

Vol: 5 | July - Dec 2014 | Issue No.9

Patron in-Chief
Dr. Muhammad Ali
Vice-Chancellor

Chief Editor
Dr. Humayun Abbas
Chairman: Department of Islamic Studies & Arabic
Dean: Faculty of Islamic and Oriental Learning

Editor
Dr. Umar Hayat

Co-Editors
Dr. Yasir Arfat Awan, Dr. Iftikhar Ahmad Khan

Department of Islamic Studies & Arabic
Government College University, Faisalabad.
E-mail:drhumayunabbas@gcuf.edu.pk
E-mail:drumarhayyat@yahoo.com
Phone:041-9201559

ADVISORY BOARD

International

Dr. Llioyd Ridgeon
Glasgow University, Glasgow, U.K.

Dr. Hafiz M. Munir
Al Azhar University, Egypt

Dr. Ghulam Yahya Anjum
Hamdard University,
New Delhi (India)

Elif Medeni
University of Vienna

Ghulam Zarquani
Houston, USA

Dr. Ja'afar Ismail Jafaee
University of South Africa, S.A

Dr. Shah Kausar Mustafa
University of Dhaka, Bangladesh

National

Dr. Muhammad Ishaq Qureshi
Markaz-e-Tahqeeq, Faisalabad.

Dr. Abdul Quddoos Sohaib
Bahauddin Zakariya University, Multan.

Dr. M. Hammad Lakhvi
Punjab University, Lahore.

Dr. Hafiz Muhammad Sajjad
(AIOU, Islamabad)

Dr. Muhammad Farooq Hyder
G.C University, Lahore

Dr. Muhammad Akram Virk
Govt. Postgraduate College, Gurjanwala

Dr. Merajul Islam Zia
Peshawar University, Peshawar

زبان زد عالم

شرکاء کا تعارف

ڈاکٹر نائلہ صفدر	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، جی سی یونی ورسٹی، لاہور
محمود الحسن	ایم فل سکالر، شعبہ اسلامیات وعربی، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر مطلوب احمد	ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج آف کامرس، فیصل آباد
ڈاکٹر یاسر عرفات اعوان	لیکچرار شعبہ علومِ اسلامیہ وعربی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد
قاری رمضان نجم باروی	پی ایچ ڈی اسکالر (شعبہ علوم اسلامیہ وعربی) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر محمد اکرم ورک	پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز) کامونکی
ڈاکٹر محمد زمان چیمہ	اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ
ڈاکٹر زیبا افتخار	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، کراچی
ذاکرہ پروین	پی ایچ۔ ڈی (اسکالر) شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر ہمایوں عباس	ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر حافظ امجد حسین	لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ پوسٹ گرایجوایٹ کالج، سمندری
ڈاکٹر محمد حامد رضا	اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈاکٹر حمیرا ناز	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی
ڈاکٹر محمد احسن قریشی	پی ایچ ڈی (اسلامیات)، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
مريم صديقة	الباحثة والمدرّسة ب دی بی ایس و سی بفیصل آباد
الدكتورافتخار احمد خان	والأستاذ المساعد بقسم الدراسات الاسلامية والعربية بجامعة الكلية الحكومية بفيصل آباد
دكتورةعمرانه شهزادى	الاستاذة المساعدة بالقسم العربى بجامعة الكلية الحكومية، فيصل آباد
Dr. Muhammad Akram Sajid	Ph.D Scholar, Islamic Studies, G C University, Faisalabad
Muhammad Arif Mateen	Ph.D Scholar, Islamic Studies, G C University, Faisalabad
Dr. Sher Ali	Assistant Professor, Islamic Studies, G C University, Faisalabad

فہرست

اداریہ ۹

سیرت النبی ﷺ کا تقویمی مطالعہ مکی عہد کے تناظر میں — نائلہ صفدر
۱۱

اردو سفرناموں میں عہدِ مکی کے آثارِ سیرت نبوی ﷺ — محمود الحسن / مطلوب احمد
۲۴

تحریک استشراق —— مبدا و اہداف پر تنقیدی نظر — یاسر عرفات اعوان
۳۹

اسلامی مکاتبِ فکر میں اتحاد کی صورت — قاری رمضان نجم باروی
۵۲

قتلِ غیرت کی شرعی حیثیت — ڈاکٹر محمد زمان چیمہ / محمد اکرم ورک
۷۰

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور علم السیر — زیبا افتخار
۹۳

اسبابِ زوالِ خلافتِ عثمانیہ کا تحقیقی مطالعہ — ذاکرہ پروین / ہمایوں عباس
۱۰۶

فقہ ابن حزم میں ''دلیل'' بطور مصدر، ماہیت و اقسام — حافظ امجد حسین / محمد حامد رضا
۱۲۳

پُر امن اور اعتدال پسند معاشرے کی تشکیل و ضرورت اسلام کی روشنی میں — حمیرا ناز
۱۴۴

مسئلہ افراطِ آبادی: اسلامی تعلیمات اور جدید سائنس کی روشنی میں — محمد احسن قریشی
۱۵۹

قصص النساء فی القرآن الكريم دراسة وعبر — مريم صديقة/افتخار احمد خان
۱۷۴

فن التفسير عند القاضي ثناء الله بانی بتی — عمرانه شهزادی
۱۸۳

مقالہ نگاران کرام سے ضروری گزارش

۱۔ مضمون تحقیقی وتنقیدی نوعیت کا ہو۔

۲۔ ضخامت ۱۵ سے ۲۰ صفحات تک ہو۔

۳۔ مضمون کی تلخیص Abstract انگریزی زبان میں مضمون کے ہمراہ ارسال کیا جائے۔

۴۔ مضمون کے ساتھ Soft Copy بھی ارسال کی جائے۔

۵۔ متنازعہ نوعیت کے مضامین شامل اشاعت نہیں ہوں گے۔

۶۔ موصول ہونے والے مضامین Evaluation Committee کو ارسال کئے جائیں گے جس کی رپورٹ کی روشنی میں اشاعت کا فیصلہ ہوگا۔

۷۔ حوالہ جات مضمون کے اختتام پر درج کئے جائیں۔

ترتیب حوالہ

(ا۔ قرآنی حوالہ: نام سورہ (نمبر شمار) آیت نمبر

ب۔ حوالہ حدیث: نام مؤلف، کتاب کا نام، باب کا نام، مطبع مع سن اشاعت، رقم الحدیث، ص:

ج۔ حوالہ کتاب: مصنف کے نام کا معروف حصہ، پورا نام، کتاب کا نام، ترجمے کی صورت میں مترجم کا نام، ادارہ اشاعت وسن اشاعت، جلد نمبر، صفحہ نمبر

مضامین ارسال کرنے والے معزز محققین سے گزارش ہے کہ مذکورہ شرائط کی پابندی کریں۔ شکریہ

نوٹ: مجلس ادارت کا تحقیق نگار کی رائے سے کلیتاً متفق ہونا ضروری نہیں۔

سیرت النبی ﷺ کا تقویمی مطالعہ مکی عہد کے تناظر میں

ڈاکٹر نائلہ صفدر☆

Abstract:

"The life of MOHAMMAD (ﷺ) the last Prophet, is the best role model for all the human generations to come in every respect. The authenticity & finality of his prophetic status has been declared by Allah Almighty. So there is no doubt that Seerah of the Prophet (ﷺ) is unique one there is all the qualities, necessary for a complete personality. Allah orders everyone to have faith in the Prophethood of MOHAMMAD (ﷺ) and follow him step to step for ultimate success. So the study of Seerah in the most important need of mankind especially of the Muslims. The Seerah is divided into two major portions, the period of Makkah and the period of Madinah. The following article is a chronological study of the Seerah related to Makkan period of the Holy Prophet (ﷺ)."

Keywords: Seerah, Study of Seerah, Chronological order, Makkah, Adjacent of Makkah.

محمد ﷺ کی حیات کا مطالعہ ہر دور میں ہر انسان کے لیے مشعلِ راہ رہا ہے۔ مختلف انداز اور جہات سے اس ذات اقدس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اہل علم کے لیے باعث سعادت اور اہل عمل کے لیے باعث بلندی درجات اور وسیلۂ نجات قرار پاتا ہے۔ حصول سعادت کی خاطر یہ سلسلہ آپ ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی جاری ہو گیا تھا (جب دیگر ادیان کی کتب مقدسہ میں ایک آنے والے ھادی کی بشارت دی گئی اور دنیا اس کی منتظر دکھائی دی) اور یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے گا مگر خیر و برکت میں کمی واقع نہ ہو گی۔

حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ پر قلم اٹھانے کی سعادت حاصل کرنے والوں نے آپ ﷺ کی سیرت کے مختلف گوشوں کو فلاح انسانی کے لیے صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا اور بارک بینی سے واقعات کا

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علومِ اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور

جائزہ لینے کے بعد اختلافی روایات میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اختلافی امور کی وجوہات سامنے ہوں تو اشکالات جنم نہیں لے لیتے بصورت دیگر یہ ذہنی الجھاؤ کا باعث بن سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کی حیات کے واقعات کے تاریخی (سن) بیان میں بھی قدیم و جدید مصادر سیرت میں اختلافات موجود ہیں جن کی کچھ بنیادی وجوہات ہیں۔ اس مقالے میں ان وجوہات کو بیان کیا گیا ہے اور آپ ﷺ کی مکی زندگی کے چند چیدہ چیدہ واقعات زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہوئے بعض تحقیق طلب امور کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف ادوار میں پیش کی گئی علماء و محققین کی کاوشوں کا ایک خلاصہ زمانی ترتیب اور قول راجح کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبی ﷺ کی تاریخ کے بیان میں سیرت نگاروں نے قبل از بعثت واقعات کے لیے عربی تقویم، شمسی تقویم، اور عام الفیل کا استعمال کیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے اہم ترین واقعات میں میلا د النبی ﷺ، بعثت نبوی اور ہجرت شامل ہیں اس لیے دیگر تقاویم کے ساتھ بعد از بعثت واقعات کے لیے ''نبوی'' یا بعثت، اور بعد از ہجرت واقعات کے لیے ہجری سال استعمال کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ قبل از ہجرت واقعات کا حتمی تقویمی ریکارڈ دستیاب نہیں۔ بعثت نبوی سے قبل عرب میں کوئی باقاعدہ کیلنڈر رائج نہ تھا۔ عرب اپنی مرضی سے مہینوں میں ردوبدل کر لیا کرتے تھے اور بعض اوقات سال کے تیرہ یا چودہ مہینے بنا دیا کرتے تھے اعلان نبوت سے قبل نسئی کی جاتی رہی لیکن اس بات کا اندازہ تحقیق کے باوجود نہیں ہوسکتا کہ کس کس سال میں نسئی کی گئی۔ اہل عرب میں قلمس[۱] جس کا نام حذیفہ بن عبد بن فقیم بن عدی بن عامر بن ثعلبہ بن حارث مالک بن کنان بن خزیمہ تھا، نے نساۃ کا آغاز کیا اس نے حلال مہینے کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا[۲] اس کے بعد اس کے بیٹے عباد بن حذیفہ نے یہ دستور جاری رکھا پھر قلع بن عباد، امیہ بن قلع اور عوف بن امیہ نے اسی طریقے کو جاری رکھا۔ پھر ابوثمامہ جنادہ بن عوف[۳] نے اسی پر عمل پیرا ہوا جو اس خاندان کا آخری فرد تھا۔ اہل عرب کا دستور تھا کہ وہ حج سے فارغ ہو کر اس کے پاس جمع ہو جاتے اور وہ چار اشہر حرام[۴] رجب ذوالقعدہ، ذو الحجہ، اور محرم کو حرام قرار دیتا اور جب ان میں سے کسی مہینے کو حلال کرنا چاہتا تو محرم کو حلال کر دیتا اور صفر کو اس کی جگہ رکھ لیتا تا کہ اشہر حرام کی تعداد پوری رہے اہل عرب اس سال صفر کو اشہر حرام میں شمار کرتے۔ نسات قابل فخر گردانا جاتا اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جو بنوفراس بن غنم بن ثعلبہ بن مالک بن کنانہ کے ایک شخص عمیر بن قیس بن جِذلُ الطِّعان[۵] نے کہے جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔

''اَلَسنَا النَّاسِئِینَ عَلٰی مَعَدٍ شَھُورَ الحِلِّ نَجعَلُھَا حَرَامًا''[۶]

(کیا ہم وہ لوگ نہیں ہیں جو معد کے زمانے میں نساۃ کرتے تھے ہم حلال مہینوں کو حرام کر دیتے تھے۔)

مہینوں میں نسئت کے دو طریقے تھے ایک تو وہ جو ابن اسحٰق کے حوالے سے بیان ہوا کہ محرم کو حلال اور صفر کو حرام کر دیتے۔ تا کہ خوب غارت گری کریں اور اپنے دشمنوں سے بدلہ لیں[۷] اور دوسرا یہ

کہ وہ شمسی سال میں غور وفکر کے بعد ہر سال حج کو اپنے مقررہ وقت سے مؤخر کر دیتے۔وہ ہر سال حج کو گیارہ دن یا اس سے زیادہ مؤخر کرتے۔اس لیے نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا۔

"اِنَّ الزَّمَانَ قَدِاستَدَارَ کَھَیئَتِہٖ یَومَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الاَرضَ"(۸)

(زمانہ نے اسی طرح گردش کی ہے جس طرح اس نے اس دن گردش کی تھی جب اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق کی تھی۔)

حجۃ الوداع اس سال ہوا تھا جس سال حج اپنے وقت پر لوٹ آیا تھا۔سورۃ البقرہ آیت ۱۲۹ سے استدلال کرتے ہوئے امام سہیلی اپنے استاد شیخ ابوبکر کی رائے بیان فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ رب العزت نے دیگر عبادات مئوقتہ کو چھوڑ کر صرف حج کا ذکر کیا ہے یہ اس بات پر تاکید ہے کہ اہل عرب حج سے متعلق چاند کا اعتبار کریں اور عجمیوں کے شمار پر اعتبار نہ کریں۔اسی وجہ سے اہل عرب حج میں عجمی مہینوں کا اعتبار نہیں کرتے۔(۹)

عرب میں سال کو موسم کے مطابق بارہ ماہ میں تقسیم کیا جاتا تھا جن میں، محرم (متبرک) صفر (توشہ دان کو خالی کر دینا)، ربیع الاول (موسم بہار کا پہلا مہینہ) ربیع الثانی (موسم بہار کا دوسرا مہینہ) جمادی الاول (پہلا خشک مہینہ) جمادی الثانی (دوسرا خشک مہینہ) رجب جس کی تعظیم کی جاتی ہو، اسے رجب المرجب بھی کہتے ہیں، شعبان (کونپلیں پھوٹنے کا مہینہ) رمضان (گرمی کا مہینہ)، شوال (اتصال کا مہینہ)، ذوالقعدہ (صلح امن اور آرام کا مہینہ) ذوالحجہ (حج کا مہینہ) قدیم عرب قمری سال پر کاربند تھے جس میں ۳۵۴ دن، آٹھ گھنٹے ۴۸ ثانیے تھے، جو باری باری انتیس اور تیس دنوں کے بارہ مہینوں پر تقسیم کئے جاتے تھے۔اپنے قمری سالوں اور یونانیوں اور رومیوں کے شمسی سالوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے اور ہر ماہ کے اپنے صحیح موسم میں لانے کی خاطر عرب ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اضافہ کر دیا کرتے تھے۔قمری سال کے بارہ مہینوں میں کبیسہ کا ایک اور مہینہ بڑھا دیتے۔اس سے مہینوں کے ناموں اور موسموں میں قدرے مطابقت قائم رہتی تھی۔چونکہ لوند کے سال (سال کبیسہ) میں عرب لوگ رسومات قبیحہ مناتے تھے اس لیے یہ قاعدہ ترک کر دیا گیا۔اس وقت سے مہینوں کے ناموں اور موسموں میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔(۱۰) ان وجوہات سے مہینوں میں اختلاف آیا اور یہی اختلاف واقعات سیرت النبی ﷺ کے بیان میں موجود ہے۔

یمن کے حبشی نژاد ابرہہ الاشرم کے خانہ کعبہ کو گرانے کی نیت سے لشکر جرار کے ساتھ آنے کے واقعہ نے عرب میں خاص اہمیت حاصل کی انہوں نے عامَ الفیل کے نام سے ایک نئے سن کا آغاز کیا۔ عیسوی سال ۵۷۰ء تھا۔اسی سال حضرت محمد ﷺ کی پیدائش ہوئی۔(۱۱)

جہاں تک سن اور تاریخ کا تعلق ہے۔اس امر میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے تاریخ ڈالنا شروع کی ابن عساکر تاریخ دمشق میں انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا۔تاریخ کی

ابتدا مدینے میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے ہوئی۔ اصمعی کا بھی یہی کہنا ہے کہ ہجرت کے ماہ ربیع الاول سے تاریخ کا آغاز ہوا۔ حاکم نے ابن جریج کے واسطے سے اور انہوں نے ابو سلمہ سے انہوں نے ابن شہاب زہری سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینے تشریف لائے تو آپ نے تاریخ کا حکم دیا چنانچہ ربیع الاول سے تاریخ ڈالی گئی۔ یہ روایت معضل ہے۔ محفوظ (اگر حدیث صحیح اور حسن کا راوی اپنے سے زیادہ قوی راوی کے مخالف روایت کرے تو راجح کا نام محفوظ اور مرجوح کا نام شاذ ہے) روایت یہ ہے اور ابن عساکر کا بھی یہی کہنا ہے کہ اس کی بابت حکم عمرؓ کے زمانے میں صادر ہوا۔ انہوں نے تاریخ کی ابتدا ہجرت نبوی سے اور سال ہجرت کے ماہ محرم سے کی۔ ۱۱ر ربیع الاول سے محرم تک پیچھے جانے کی وجہ یہ ہے کہ ہجرت کے فیصلے کی ابتدا محرم ہی سے ہوئی۔ اس لیے کہ بیعت ذی الحجہ کے دوران ہوئی اور یہی ہجرت کی تمہید تھی۔ چنانچہ بیعت اور ہجرت کے فیصلے کے بعد پہلا چاند جو دکھائی دیا وہ محرم کا تھا۔ اس لیے یہ عین مناسب تھا کہ اسے تاریخ کا نقطہ آغاز قرار دیا جائے۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ محرم سے ابتدا کی یہ سب سے زوردار توجیح ہے۔ (۱۲)

علم ریاضی و نجوم کے حساب سے بھی تواریخ کا تعین ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے لیکن کسی رائے کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ریاضی و علم نجوم کا حساب بھی مختلف ہوسکتا ہے۔ دوشنبہ کا دن ہجرت محمد ﷺ کی حیات مبارک میں بڑا اہمیت کا حامل ہے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ دوشنبہ کو پیدا ہوئے دوشنبہ کو نبوت سے سرفراز کئے گئے، دوشنبہ کو مکہ سے مدینہ ہجرت کے لیے نکلے اور دوشنبہ کو مدینے میں تشریف فرما ہوئے (شاید قبا مراد ہے) دوشنبہ کو اس دار فانی کو خیرباد کہا۔ اور دوشنبہ کو ہی حجر اسود کو بیت اللہ میں نصب فرمایا۔ (۱۳) آپ ﷺ کی تاریخ پیدائش کے تعین میں علامہ قسطلانی لکھتے ہیں اہل زیج کا اس قول پر اجماع ہے کہ آٹھ ربیع الاول کو پیر کا دن تھا۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے محمود فلکی پاشا پر بھروسہ کرتے ہوئے نو ربیع الاول کو پیر کا دن قرار دیا ہے۔ (۱۴) جب یہ اختلافات موجود ہیں تو لامحالہ اسی ذریعے کو فوقیت حاصل ہوگی جو ان میں سب سے زیادہ مستند ہے اور اس کے لیے صحابہ کرام، تابعین، مفسرین، محدثین اور قدیم سیرت نگاروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

جہاں تک حضرت محمد ﷺ کی ذات باقدس کا تعلق ہے آپ ﷺ کی اس جہان فانی میں آمد سے قبل ہی دھوم تھی کہیں حضرت عیسیٰ کی بشارت ''احمد'' کے نام سے جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے (۱۵) یا نصاریٰ کی کتاب مقدس انجیل کی روشنی میں حضرت عیسیٰ کے ارشاد کے حوالے سے جس میں المُنحَمَنّا کے نام سے ایک آنے والے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو سریانی زبان کا نام ہے جس کا معنی محمد ﷺ ہے۔ رومی زبان میں اسے البرَ قلیطِس ﷺ کہتے ہیں۔ (۱۶) اور کہیں بھَوِش پُران کے بیان کردہ نام ''محمد'' یا ویدوں کی پشین گویوں جیسے اتھر وید کے الفاظ narashansah (وہ جس کی تعریف کی گئی یعنی محمد) اور kaurama (امن قائم کرنے والا یا ہجرت کرنے والا) کے حوالے سے اسی بابرکت ذات کا تذکرہ موجود ہے۔ (۱۷)

الغرض ہنود و یہود ہوں یا نصاریٰ سب ایک آنے والے کے منتظر تھے۔

آپ ﷺ کے والد محترم کا نام عبداللہ اور والدہ محترمہ کا نام آمنہؓ ہے۔ دونوں کا شجرہ نسب قصی بن کلاب سے ملتا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ حضرت عبداللہ کا تعلق ہاشم بن عبد مناف سے تھا جبکہ حضرت آمنہؓ کا تعلق عبد مناف بن زہرہ سے تھا۔ شجرہ نسب کے لحاظ سے عبداللہ حضرت عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب سے اور حضرت آمنہؓ، وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن قصی بن کلاب سے تعلق رکھتی تھیں۔ یعنی قصی بن کلاب کے بیٹے عبد مناف اور زہرہ تھے حضرت عبداللہ کا تعلق عبد مناف سے اور حضرت آمنہ کا تعلق زہرہ سے تھا جس نے اپنے بھائی کے نام پر اپنے بیٹے کا نام عبد مناف رکھا جو حضرت آمنہ بنت وہب کا دادا تھا۔ حضرت عبدالمطلب نے اسی مجلس میں ہالہ بنت وہیب سے نکاح کیا[۱۸] جسے سیرت نگاروں نے حضرت آمنہ کی چچازاد بہن لکھا ہے۔ جبکہ محمد حسین ھیکل کی کتاب کے ترجمہ حیات محمد میں ابو یحییٰ امام خان نے اسے وہب و وہیب کی ہمشیرہ قرار دیا ہے۔ جن سے حضرت محمد ﷺ کے عزیز چچا اور رضاعی بھائی سید الشہدا حضرت حمزہؓ پیدا ہوئے۔

اس ذات بابرکات جسے رحمۃ للعالمین قرار پانا تھا کی آمد موسم بہار دوشنبہ کے دن ہوئی اس میں کوئی اختلاف نہیں البتہ تاریخ ولادت کے متعلق مختلف اقوال ہیں آٹھ (ابن حزم، جوامع السیر ہ) جسے مولانا محمد ادریس کاندھلوی (سیرت المصطفے ﷺ) نے اختیار کیا ہے،[۱۹] نو ربیع الاول محمود فلکی پاشا کی تحقیقات کے مطابق قاضی سلیمان سلمان منصور پوری (رحمۃ للعالمین ﷺ)[۲۰] اور شبلی نعمانی (سیرت النبی ﷺ) نے اپنی کتب سیرت میں تحریر کیا ہے۔[۲۱] بارہ ربیع الاول ابن ہشام (السیرۃ النبویہ)،[۲۲] امام سہیلی (الروض الانف)[۲۳] ابن جریر طبری (تاریخ طبری)،[۲۴] ابن خلدون (تاریخ ابن خلدون)،[۲۵] ابن سید الناس (عیون الاثر)،[۲۶] ابن کثیر (السیرۃ النبویہ)،[۲۷] ابن ابی شیبہ (مصنف) ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (اعلام النبوہ)، علامہ محمد رضا (محمد رسول اللہ)، نے تسلیم کیا ہے اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔ پیر محمد کرم شاہ نے (ضیاء النبی ﷺ) میں ان کتب سے دلائل دینے کے بعد ۱۲ ربیع الاول تاریخ ولادت محمد ﷺ کو اختیار کیا ہے۔[۲۸]

جہاں تک شمسی تقویم کا تعلق ہے۔ اس میں بھی سیرت نگاروں کا کچھ اختلاف ہے۔ انسان کامل خالد علوی میں ۲۰ اپریل ۵۷۱ء،[۲۹] سیرت النبی ﷺ میں شبلی نعمانی نے ۲۰ اپریل ۵۷۱ء[۳۰] رحمۃ للعالمین میں قاضی سلیمان سلمان منصور پوری نے ۲۲ اپریل ۵۷۱[۳۱] ۲۹ اگست ۵۷۰ء سید امیر علی نے سپرٹ آف اسلام،[۳۲] ۲۰ اگست ۵۷۰ محمد رسول اللہ میں علامہ محمد رضا[۳۳] نے تحریر کیا ہے اس کے علاوہ دیگر سیرت نگاروں کے یہاں بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ سیرت نگاروں کی تحقیق میں کہیں چند یوم اور کہیں چند ماہ کا اختلاف ہے۔ جس میں ان کی علمی تحقیقات، دقیقہ رسی اور عشق رسول میں واقعات کی تہہ تک پہنچنے کا جذبہ کارفرما ہے۔

اس وقت کا مشہور واقعہ عام الفیل ہے۔ اکثر علماء نے اس کے پچاس یا پچپن یوم بعد آپ ﷺ کی پیدائش کا واقعہ تحریر کیا ہے۔ عام الفیل کے کچھ عرصہ بعد حضرت عبداللہ نے ۲۵ برس کی عمر میں یثرب میں وفات پائی۔ آپ ﷺ کی پیدائش کے مہینہ میں محرم، صفر، رجب، رمضان اور ربیع الاول کا ذکر ملتا ہے جبکہ معروف روایت ربیع الاول کی ہے۔

☆ آپ ﷺ ۱۲ ربیع الاول ۲۹ اگست ۵۷۰ء عام الفیل کے پچاس یوم بعد پیدا ہوئے۔

حضرت محمد ﷺ کو سب سے پہلے ان کی والدہ نے چند یوم پھر ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی ثویبہ اور پھر حلیمہ سعدیہ نے دودھ پلایا امام سہیلی کے بیان کے مطابق حلیمہ سعدیہ کے یہاں آپ پانچ سال ایک ماہ رہے۔(۳۴) یہ سن واقعات کے مطابق ۵۷۶ء ہوگا۔ امام سہیلی نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ سر ولیم میور نے بھی لائف آف محمد میں حضرت محمد ﷺ کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ پر ہونے کی یہی وجہ بیان کی ہے۔

☆ تکمیل رضاعت ۶ عام الفیل، ۶ میلادی، ۵۷۶ء

والدہ کے ساتھ آپ ﷺ اپنے دادا کے ننھیال گئے جہاں حضرت آمنہ مقام ابواء (حجفہ سے ۲۳ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں) پر ۵۷۷ء میں وفات پا گئیں۔

☆ وفات آمنہ ۷ عام الفیل، ۷ میلادی، ۵۷۷ء

حضرت عبدالمطلب دادا حضرت محمد ﷺ کی وفات واقعہ فیل سے آٹھ سال بعد ہوئی۔(۳۵)
سید امیر علی نے عیسوی سن ۵۷۹ء لکھا ہے آپ کی وفات صنعاء سے ایک سفر سے واپسی پر ہوئی۔(۳۶)

☆ وفات عبدالمطلب ۹ عام الفیل، ۹ میلادی، ۵۷۹ء

آپ بارہ سال کی عمر میں سفر شام پر اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ہمراہ گئے۔ ابو طالب اپنے باپ اور دادا کی طرح شام اور یمن کے ساتھ خاصے بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ وہ دمشق اور بصرہ اور شام کے دوسرے شہروں میں حجاز اور ہجر کی کھجوریں اور یمن کے عطر لے جاتے تھے اور ان کے بدلے بازنطینی اشیاء لاتے تھے۔(۳۷) اس وقت بعض سیرت نگاروں نے آپ ﷺ کی عمر نو اور دس سال بھی بیان کی ہے۔ طبری نے عمر مبارک بارہ سال لکھی ہے اور اسی کو امام سہیلی نے اختیار کیا ہے۔(۳۸) یہیں سیرت نگاروں نے راہب سے ملاقات بیان کی ہے۔ امام زہری کی کتاب سیر الزہری میں ہے کہ بحیریٰ تیماء کے یہود کا ایک متبحر عالم تھا۔ مسعودی میں ہے کہ اس کا تعلق بنو عبدالقیس سے تھا اور اس کا نام سَرجِس تھا۔(۳۹) مستشرقین کے اعتراضات کی بنا پر بعض سیرت نگاروں نے اس قصے کا انکار بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے لکھا ہے کہ اس کے متعلق حدیث قوی ترین طرق سے جامع ترمذی میں وارد ہیں اور امام ترمذی نے کہا ہے۔ ''یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں''(۴۰)

☆ سفر شام ۱۳ میلادی ۵۸۳ء

سفر شام اہل عرب کی ان جنگوں کے درمیان کا واقعہ ہے جنہیں حرام مہینوں کی حرمت قائم نہ رکھنے کی وجہ سے حرب فجار کہا جاتا ہے۔مسعودی نے ان چار جنگوں کا ذکر کیا ہے آخری جنگِ فجار البرَ اض تھی جس میں حضرت محمد ﷺ نے شرکت کی تھی۔ یہ بنو کنانہ اور بنو قیس کے مابین ہوئی تھی۔اس کے چار دن قابل ذکر ہیں۔

''ا: یوم شمطہ ۲: یوم العَبلاء ۳: یوم الشَّرب ۴: یوم الحریرہ۔''(۴۱)

ابن ہشام کے مطابق اس وقت آپ ﷺ کی عمر چودہ یا پندرہ سال تھی۔حرب الفجار شعبان میں لڑی گئی۔(۴۲)

☆حرب الفجار ۱۵ میلادی ا، ۵۸۵ء

حلف الفضول کے بارے میں اختلاف ہے امام سہیلی نے لکھا ہے کہ معاہدہ آپ ﷺ کی بعثت سے بیس سال پہلے ذوالقعدہ میں ہوا معاہدہ کرنے والوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ فضول (زیادہ لی ہوئی) چیز اس کے مالک کے حوالے کر دیں گے۔(۴۳)یعنی اامام سہیلی اسے بعثت سے بیس سال پہلے کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ابن اسحٰق کے مطابق آپ ﷺ کی عمر حرب فجار اور حلف الفضول کے وقت بیس سال تھی۔جبکہ ابن ہشام اسے حرب فجار کے فوری بعد کا واقعہ قرار دیتے ہیں جب آپ ﷺ کی عمر چودہ یا پندرہ سال تھی۔ شام کا دوسرا تجارتی سفر جس میں نسطورا راہب سے ملاقات ہوئی ۵۹۵ء میں ہوا جس کے بعد اسی سال حضرت خدیجہؓ سے نکاح ہوا۔

آپ ﷺ کی اولاد میں سب سے بڑے لختِ جگر قاسم بن محمد ﷺ کی پیدائش غالباً ۵۹۸ء میں ہوئی۔اس کے بعد زینب بنت رسول کی پیدائش ۶۰۰ء میں، رقیہ بنت رسول کی پیدائش ۶۰۳ء، ام کلثوم بنت رسول کی پیدائش ۶۰۴ء فاطمہؓ کی پیدائش ۶۰۵ء(۴۴)حضرت خدیجہؓ سے پیدا ہونے والے بچوں کی ترتیب یہ ہے پہلے قاسم جن کی نسبت سے آپ ﷺ کی کنیت ابوالقاسم تھی یہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اس بات میں اختلاف ہے کہ نبوت سے پہلے فوت ہوئے یا بعد میں۔بیٹیوں میں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثوم اور فاطمہ،بعض سیرت نگاروں نے ام کلثوم کو فاطمہ سے چھوٹی بیان کیا ہے۔پھر عبداللہ جن کی پیدائش بعد از بعثت ہوئی انہی کو طیب اور طاہر کہا جاتا ہے۔(۴۵)

تعمیر کعبہ ۶۰۵ء امام عبدالرزاق اور ابن اسحٰق نے پورے وثوق اے لکھا ہے کہ اس وقت نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک ۳۵ سال تھی۔عبدالرزاق کی اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

جیسا کہ قریش کی عادت تھی کہ وہ سال میں ایک ماہ یکسوئی سے اللہ رب العزت کی عبادت کیا کرتے تھے۔ابن اسحٰق نے سند حسن سے روایت بیان کی ہے کہ قریش دور جاہلیت میں اس عبادت کے قائل اور اس پر عامل تھے۔حضرت محمد ﷺ غار حرا میں عبادت کے لیے تشریف لے جاتے اور وہاں تحنث وتحنف

میں مشغول رہتے۔(۴۶) آپ ﷺ اعتکاف مکمل کرنے کے بعد بیت اللہ کا طواف کرتے۔آپ ﷺ کی عبادت کسی شریعت کے موافق تھی یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔قوی رائے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کے موافق ہونے کے متعلق ہے۔(۴۷)

اسی دوران سچے خوابوں(۴۸) کا سلسلہ شروع ہوا جسے وحی الٰہی کا آغاز کہا جاتا ہے۔(۴۹) یہ سلسلہ چھ ماہ جاری رہا۔فرشتہ وحی جبرائیل امین آپ ﷺ کے پاس پیغام حق لے کر حاضر ہوا۔ یہ پیغام بخاری و مسلم کی حدیث بروایت عائشہ بیداری میں نازل ہوا۔ جبکہ ابن اسحٰق کی روایت میں آپ ﷺ کے سوئے ہونے کے الفاظ درج ہیں۔امام سہیلی نے تطبیق پیدا کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس بیداری سے پہلے ایک دفعہ خواب میں بھی جبرائیلؑ آئے تھے،تاکہ آپ ﷺ کے لیے نزول وحی کو برداشت کرنا آسان ہو جائے۔کیونکہ نبوت کا معاملہ بہت عظیم اور اس کا بوجھ بہت بھاری ہے اس کے بعد آپ ﷺ مبعوث ہوئے۔(۵۰) شمس الدین شامی سیرت شامیہ میں تحریر فرماتے ہیں

حضرت محمد ﷺ عمر مبارک کے چالیسویں سال کی انتہا پر مبعوث ہوئے۔دوسرا قول چالیس سال مکمل ہو چکنے (ابن اسحٰق:۵۱۱) کے ایک دن بعد کا ہے،تیسرے قول کے مطابق دس دن بعد اور چوتھا قول چالیس سال دو ماہ(۵۱) کا ہے۔

ماہ ربیع الاول کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں البتہ تاریخ کے بارے میں بارہ ربیع الاول، دو ربیع الاول، آٹھ ربیع الاول اور دیگر اقوال ملتے ہیں لیکن پہلا قول مشہور تر ہے۔(۵۲)

☆ آپ ﷺ ۱۲ ربیع الاول ۴۱ میلادی ۶۱۰ء کو مبعوث ہوئے۔ یہاں سے نبوی سال یا سال بعثت کا آغاز ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔جس میں مکی زندگی کے تقریباً تیرہ سال اور مدنی زندگی کے دس سال شامل ہیں۔مکی زندگی کے پہلے تین برس خفیہ دعوت و تبلیغ، چار تا دس بعثت اعلانیہ دعوت و تبلیغ اور دس بعثت کے اواخر تا ہجرت مکہ سے باہر اسلام کی مقبولیت اور پھیلاؤ کے مراحل پر مشتمل ہے۔(۵۳) اس دور کے واقعات ماہ و سال کے اعتبار اور واقعاتی ترتیب میں سیرت نگاروں کے ہاں بعض اختلافات ہیں جس کی وجوہات اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ان واقعات کو جس نظر سے بھی دیکھا جائے ایک تخمینہ ہی ہوگا کسی رائے کو بھی حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ واقعات کی صحت مستند روایات سے ثابت ہے۔اور دیگر تمام بانیان مذاہب کے مقابلے میں حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ محفوظ و مامون ہے۔ چند ماہ یا دنوں ں کا اختلاف درج بالا وجوہات پر مبنی ہے۔

آپ ﷺ کی بعثت کے بعد اسی سال خفیہ دعوت کا آغاز ہوا اور حضرت خدیجہؓ، بنات النبی ﷺ ،حضرت ابوبکر صدیقؓ،حضرت علیؓ بن ابی طالب،حضرت زیدؓ بن حارثہ بن شراحبیل اور سابقین

الاولین صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی، اسی سال دو نمازوں کی فرضیت ہوئی، دو رکعت صبح کے وقت اور دو رکعت شام کے وقت، سال ایک نبوی، ۶۱۰ء تھا۔ (۵۴)

حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب قرشی عدوی ۲ بعثت کو پیدا ہوئے اسی سال کاتب وحی حضرت زید بن ثابت بن ضحاک انصاری الخزرجی نجاری کی ولادت ہوئی۔ عیسوی سال ۶۱۱ء تھا۔ (۵۵)

تین بعثت نبوی میں آپ ﷺ کو اعلانیہ دعوت کا حکم ہوا اور آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ فَاصدَع بِمَا تُومَرُ وَاَعرِض عَنِ المُشرِکِین (۵۶) تو اسی سال یا بعض علماء کے نزدیک چوتھے سال کے شروع ہونے کے بعد آپ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا۔ سورہ (الشعراء کی آیت ۲۱۴۔۲۱۵) وَ اَنذِر عَشِیرَتِکَ ...... کے بعد آپ ﷺ نے کوہ صفا پر قریش کے تمام گھرانوں کو پکارا، عیسوی سال ۶۱۳ء تھا۔

حضرت ورقہ بن نوفل کی وفات تاریخ خمیس کے مطابق اسی سال ہوئی جبکہ منتقی میں چار بعثت درج ہے۔ (۵۷)

۵ بعثت نبوی ۶۱۴ء ہجرت حبشہ ہر وہ بادشاہ جو حبشہ کا اقتدار سنبھالتا اسے نجاشی کے نام سے موسوم کیا جاتا۔ جس طرح ہر وہ بادشاہ جو ایران کا حاکم بنتا اسے کسریٰ، جو ترک کی زمام اقتدار سنبھالتا اسے خاقان اور جو جو یونان کا بادشاہ بنتا اسے اسے بطلیموس کہا جاتا۔ اس وقت حبشہ کے والی کا نام اصحمہ بن الجبر تھا۔ (۵۸) اس کا معنی عطیہ ہے۔ ہجرت حبشہ اولیٰ میں گیارہ یا بارہ مرد اور چار یا پانچ مسلمان عورتیں شامل تھیں اس سال کے آخر یا ۶ بعثت کے شروع میں دوسری ہجرت ہوئی۔ حبشہ ہجرت کرنے والوں کی تعداد کم عمر بچوں کو چھوڑ کر تراسی تھی یہ تعداد اس وقت ہوگی جب حضرت عمار بن یاسر کو ان میں شامل کیا جائے۔ (۵۹) جن کی ہجرت کے بارے میں سیرت نگار متردد ہیں۔

جب کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں کو تکالیف دی جانے لگیں تو آپ ﷺ دار ارقم میں سکونت پذیر ہو گئے اور چھپ کر اہل ایمان کے ساتھ نمازیں ادا کرنے لگے۔ یہ واقعہ ۶ بعثت ۶۱۵ء کا ہے۔

اسی سال عیسوی ۶۱۶ء حضرت حمزہ اور حضرت عمرؓ ایمان لائے۔ حضرت ابوبکرؓ کی والدہ ام الخیر سَلمیٰ بنت صَخر بھی اسی سال ایمان لائیں۔

۷ بعثت ۴۸ میلادی ۶۱۶ء شعب اَبی طالب میں محصوری کا واقعہ کتب سیرت میں ملتا ہے، حبشہ سے ناکامی کے بعد مشرکین نے مسلمانوں کی ایذا رسانی میں اضافہ کر دیا پھر ایک قرارداد منظور کی کہ کوئی شخص بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھے گا۔ خرید و فروخت نہ کرے گا بلکہ بات چیت تک بھی نہ کرے گا۔ (۶۰)

یہ محاصرہ بعثت کے ساتویں سال محرم میں شروع ہوا اور ابن اسحٰق کے مطابق دو یا تین سال جاری رہا۔ فتح الباری جلد نمبر ۷، ص ۱۹۲ میں ہے کہ موسیٰ بن عقبہ نے تین سال یقینی طور پر بتائے ہیں۔ (۶۱)

۸ نبوی ۴۸ میلادی ۶۱۷ء میں جنگ بعاث ہوئی۔ یہ جنگ ہجرت سے پانچ سال قبل لڑی

گئی۔اس میں اوس وخزرج کے دو کے سوا تمام سردار مقتول ہو گئے۔اشاعت اسلام کے حق میں اس جنگ کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے حضرت عائشہؓ اس کے دوررس نتائج پر تبصرہ فرماتی ہیں جنگ بعاث اہلِ مدینہ کے دخول اسلام کے سلسلہ میں آپﷺ کی آمد سے قبل اللہ تعالیٰ نے بپا فرمادی۔چنانچہ آپﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان کی جمعیت پراگندہ ہو چکی تھی۔اوران کے سردار قتل ہو چکے تھے۔یعنی ان قبیلوں کے تمام سردار جو تکبر اور جہالت کے باعث اسلام سے نفرت کرتے تھے اور طبیعت کی سختی کے باعث کسی اور کے حکم کو ماننا ان پر دشوار تھا۔سب مارے گئے صرف عبداللہ بن ابی سلول اور ابوعامر بن راہب جسے بنی پاک نے فاسق کا نام دیا تھا باقی رہ گئے۔عام باشندے جنگوں کی تباہی سے تنگ آ کر کسی رہنما کی تلاش میں تھے ایسی صورت میں حضورﷺ کی ذات امیدوں کا مرکز بن گئی اور وہ جلد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اس طرح قبل از ہجرت مدینہ کی فضا اسلام کے لیے سازگار ہو چکی تھی۔(۶۲)

اسی سال معجزہ شق القمر ظہور پذیر ہوا۔یہ معجزہ روایات صحیحہ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت حذیفہؓ بن یمان، حضرت جبیرؓ بن معطم، حضرت عمرؓ بن خطاب وغیرھم نے اس کی روایت ہے۔(۶۳)

شعب سے باہر آنے سے قبل حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ولادت ہوئی۔آپ کی ولادت ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی۔تذکرۃ القاری میں ہے کہ آپﷺ کی وفات کے وقت حضرت عبداللہؓ بن عباس کی عمر تیرہ سال تھی۔۱۰ نبوی، ۵۰ میلادی، ۶۱۹ء شعب ابی طالب کی محصوری سے آپﷺ کا خاندان باہر آیا۔(۶۴) زہری نے بیان کیا ہے کہ شعب سے خروج کے وقت آپﷺ کی عمر ۴۹ سال تھی۔

۱۰ نبوی ۶۲۰ء میں حضرت ابو طالب کی وفات ہوئی۔آپ کی وفات کے بارے میں سات رمضان کا قول معروف ہے جبکہ نصف شوال اور یکم ذوالقعدہ کے اقوال بھی ملتے ہیں۔(۶۵)

اسی سال آپﷺ کی زوجہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کا وصال ہوا۔مشہور روایت کی بنا پر حضرت ابو طالب کی وفات کے تین روز بعد جبکہ ڈیڑھ ماہ اور پچاس روز بعد کے اقوال بھی ملتے ہیں۔ آپؓ کا وصال ۱۰ رمضان المبارک ۱۰ بعثت کو ہوا۔آپؓ کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی کیونکہ اس وقت تک نماز جنازہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔(۶۶)

اسی سال حضرت خدیجہؓ کے وصال کے چند یوم بعد شوال میں آپﷺ نے حضرت سودہ بنت زمعہ سے نکاح فرمایا۔حضرت خدیجہ کے بعد پہلی خاتون جنہیں ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔جب آپﷺ نے ہجرت فرمائی تو آپﷺ کے گھر میں سودہ کے بغیر کوئی عورت نہ تھی۔(۶۷)

حضرت عائشہؓ سے نکاح بھی اسی سال ہوا جب آپؓ کی عمر چھ سال تھی۔(۶۸) رخصتی نکاح کے تین برس بعد شوال میں بعد از ہجرت نو سال کی عمر میں ہوئی۔(۶۹) آپؓ نو برس محمدﷺ کی معیت میں

رہیں۔وصال نبوی کے وقت آپؓ کی عمر اٹھارہ برس تھی۔(۷۰)

۲۰ شوال بعض روایات کے مطابق ۲۷ شوال ۱۰ نبوی ۶۲۰ء کو آپ ﷺ نے سفر طائف کی مشکلات کا سامنا کیا۔حضرت خدیجہؓ اور حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد حضور ﷺ کو ان مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا جس کی قریش ان کی زندگی میں جرات نہ کر سکے۔اس وقت آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے تا کہ بنوثقیف سے کچھ نصرت طلب کر سکیں۔محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے۔آپ ﷺ بنوثقیف کے سرداروں کے پاس گئے جو آپس میں بھائی تھے۔عبد یا لیل بن عمرو بن عمیر،مسعود بن عمرو بن عمیر،حبیب بن عمرو بن عمیر بن عوف بن عقدہ بن غیرہ بن غیرہ بن عوف بن ثقیف ان میں سے ایک کی زوجیت میں قریش کی شاخ بنوجمح کی ایک عورت تھی۔مگر ان سے بھلائی کی بجائے مایوسی ہوئی،(۷۱) مگر آپ ﷺ نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ایسی اولاد پیدا کرے گا جو خدائے یکتا کی عبادت کریں گے اور اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔(۷۲)

جب ابتلاء و آزمائش کا دور اپنی انتہاء کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو معراج کی عزت سے سرفراز فرمایا۔معراج نبوی کے بارے میں مختلف اقوال ہیں فتح الباری میں باب معراج میں معراج کی تاریخ کے متعلق دس اقوال نقل کئے گئے ہیں۔الرحیق المختوم میں چھ اقوال درج ہیں۔(۷۳) سیرت طیبہ سے متعلقہ واقعات میں اس واقعہ سے متعلق سب سے زیادہ روایات آئی ہیں لیکن ہر روایت میں جداگانہ طور پر اشارے پائے جاتے ہیں کسی روایت میں اس سفر کے تمام واقعات نہیں ملتے۔(۷۴) سبل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد میں محمد بن یوسف الدمشقی نے ان روایات کو جمع کر کے واقعہ ترتیب دیا ہے۔(۷۵) اگر سفر طائف شوال ۱۰ نبوی میں ہوتا ہے اور رجب کے مہینے میں معراج اکثر مفسرین لکھتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ رجب اگلے سال کا ہو گا اس طرح معراج ۲۷ رجب ۱۱ نبوی میں ہوئی۔

معراج کے بعد آپ ﷺ نے دعوت و تبلیغ کی مہم کو مزید تیز کر دیا۔آپ نے مختلف قبائل (بنو کلب بنوفزارہ،بنو عامر بن صعصعہ،بنوحنیفہ،بنوشیبان،بنوحارث،بنوکندہ،بنومرہ،سہیلی ابن ہشام المقریزی نے ان کے نام گنوائے ہیں) اور مختلف مقامات پر (ذوالمجاز،مجنہ،عکاز) دعوت اسلام دی۔لیکن خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔

۱۱/ بعثت ۶۲۰ء بیعت عقبہ اولیٰ انصار کو دعوت اسلام بنواوس اور بنوخزرج اسلام کے طفیل انصار کے شرف سے ملقب ہوئے،ان الفاظ کے معانی امام سہیلی نے بیان کئے ہیں کہ الخزرج ٹھنڈی ہوا کو کہتے ہیں علماء لغت کے نزدیک یہ جنوب کی ٹھنڈی ہوا ہے۔اوس کا معنی عطیہ یا عوض ہے۔اس طرح کے اسماء جب علم ہو جائیں تو ان پر الف لام نہیں آتا۔انصار ناصر کی جمع ہے یہ فاعل کی خلاف قیاس جمع ہے اس میں ناصر کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ زائدہ ہے اس کے حذف سے اسم ثلاثی بن جاتا ہے اور ثلاثی اسم کی جمع افعال کے وزن پر آتی ہے مثلاً شاہد کی جمع اشہاد صاحب کی اصحاب آتی ہے۔(۷۶) اس سال چھ

افراد دولت اسلام سے مالا مال ہوئے اور مدینہ جا کر دعوت اسلام دی۔ عَقبٰات کے بیان میں سیرت نگاروں کے طرز بیان کی بنا پر ان کی تعداد دو یا تین لکھی گئی ہے یہ فرق انداز بیان کا ہے نہ کہ فرق واقعات کا۔

بیعت عقبہ ثانیہ ۱۱ نبوی ۶۲۱ء دوسری بیعت میں پانچ پرانے سات نئے افراد حضرت محمد ﷺ سے ملنے آئے اور بیعت کی اسے بیعت النساء بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے الفاظ وہی تھے جو قرآن کریم میں سورہ الممتحنہ میں عورتوں کی بیعت لینے کے لیے مذکور ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبد الدار بن قصی کو معلم و مبلغ بنا کر مدینہ منورہ بھیجا گیا(۷۶) جن کے وساطت سے اسلام تیزی سے مدینہ میں پھیلنے لگا۔

سید امیر علی کے الفاظ میں پہلی اور دوسری بیعت کا درمیانی وقفہ رسالت محمدی کا نازک ترین دور ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کا کامل توکل علی اللہ اور علو ہمت جس طرح اس دور میں نمایاں ہوا اس طرح کسی اور دور میں نہ ہوا۔ آپ ﷺ اپنی قوم کو بت پرستی کی لعنت میں دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہوتے لیکن آپ کے غم کو یہ امید تسکین دیتی کہ انجام کار حق باطل پر غالب آئے گا۔ ممکن ہے آپ کی زندگی اس وقت تک وفا نہ کرے لیکن باطل کا حق کے سامنے کافور ہو جانا اسی طرح یقینی ہے جس طرح تاریکی کا سورج کی کرنوں کے سامنے سے غائب ہو جانا۔(۷۷)

اس دور کے بارے میں میور کی زبان سے غیر شعوری طور پر ذیل کے کلمات تحسین بے اختیار نکل گئے ہیں:

> ''محمد اس طرح قوم کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے فتح کی امید میں انتظار کرتے ہوئے،
> بظاہر بے یار و مددگار، اپنے حامیوں کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ گویا شیر کے منہ میں
> لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس قادر مطلق پر بھروسہ کئے ہوئے جس کا پیامبر وہ
> اپنے آپ کو سمجھتے تھے اور اس بھروسے کی بدولت ثابت قدم اور مضبوط۔۔۔''(۷۸)

عقبہ ثالثہ: ۱۳ نبوی، ۵۳ میلادی، ۶۲۲ء تیسرے سال کے موسم حج میں آنے والے پانچ سو حاجیوں میں سے تہتر مسلمان مرد اور دو خواتین بھی تھیں۔ ایام تشریق میں پہاڑ کی گھاٹی میں رات کے وقت ملنے والے حضرت محمد ﷺ کو دیگر مسلمانوں کے ساتھ دعوت دیتے ہیں اور حفاظت کا یقین دلاتے ہیں۔ انساب الاشراف میں ہے کہ حضرت محمد ﷺ ان کی دعوت کو قبول فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں آج سے تمہاری خون طلبی ہی میری خون طلبی ہوگی اور تمہاری معافی ہی میری معافی ہوگی۔ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے۔ لوگوں کی کثرت کے باعث آپ ﷺ نے بارہ نقیب مقرر فرمائے اور اسعد بن زرارہ کو نقیب النقباء بنایا۔ اس تنظیم کو تاسیس مملکت اور معاہدہ اجتماعی کی ایک شکل قرار دیا جا سکتا ہے۔(۷۹)

عقبات تین ہوئیں، پہلی عقبہ اولیٰ کہلائی جو ۱۱ بعثت رجب میں ہوئی دوسری عقبہ ثانیہ جو ۱۲ بعثت رجب میں ہوئی، تیسری عقبہ ثالثہ جو ۱۳ بعثت ذوالحجہ میں ہوئی۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ تینوں

عقبات حج میں ہوئیں جن میں سے پہلی دو رجب میں جبکہ حج رجب میں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ دور جاہلیت میں مروجہ نسیء ہے جس کی بنا پر دو بیعتیں اور حج رجب کے مہینے میں واقع ہوئے۔ (۸۰)

ماہ ذوالحجہ میں ۱۳ بعثت نبوی مکمل ہونے کے بعد ۱۴ بعثت نبوی کا آغاز ہوا اور یہی سن ہجرت کا پہلا سال ہے۔ آپ ﷺ نے اسی سال عقبات کے تقریباً تین ماہ بعد مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ علامہ گازرونی نے اپنی سیرت میں سال ہجرت ۱۴ بعثت نبوی کو ہی اختیار فرمایا ہے۔ علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں و دیگر سیرت نگاروں نے نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کو ۱۳ بعثت میں قرار دیا ہے اس کی تطبیق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے پہلے سال کے نامکمل ہونے کے باعث اسے حساب میں شامل نہیں کیا کیونکہ اس سال کی ابتدا تو محرم سے تھی مگر وحی کا آغاز ربیع الاول یا رمضان سے ہوا۔ (۸۱)

☆ ہجرت ۱۴ بعثت نبوی ستمبر ۶۲۲ء میں ہوئی۔

اس کے بعد ہجری سال کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کی مدنی زندگی کے مختلف مراحل کا ذکر الرحیق المختوم میں کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے کے آغاز میں فتنے و اضطرابات برپا ہوئے اندرونی و بیرونی رکاوٹوں کا سامنا کیا گیا اور حکمت و تدبیر سے آپ ﷺ نے ان پر قابو پایا۔ یہ مرحلہ ۶ھ صلح حدیبیہ پر ختم ہوا۔ دوسرے مرحلے میں شاہان عالم کو دعوت اسلام دی گئی اور بت پرست قیادت کے ساتھ صلح ہوئی یہ مرحلہ فتح مکہ پر منتہیٰ ہوتا ہے۔ اور آخری اور تیسرا مرحلہ مختلف وفود کی آمد اور خلقت اللہ کا دین اسلام میں جوق در جوق داخل ہونا ہے اور یہ مرحلہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے اخیر یعنی ۱۱ ربیع الاول تک محیط ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سخاوت کی وجہ سے اسے قَلَمّس کہا جاتا تھا۔ سہیلی، عبدالرحمٰن بن عبداللہ، الروض الانف، محمد علی بیضون، دار الکتب العلمیہ بیروت، ج:۱ص۱۱۳

۲۔ ایضاً

۳۔ البرقی نے کلبی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ قلع بن عباد نے سات سال، امیہ بن قلع نے اکیس سال اور جنادہ بن عوف نے چالیس سال نسیٔ کی، ایضاً:ص۱۱۵

۴۔ ابن ہشام نے محرم کو اشہر حرام کا پہلا مہینہ قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض علماء ذوالقعدہ کو پہلا مہینہ کہتے ہیں کیونکہ حضور ﷺ نے جب اشہر حرام کو شمار کیا تو سب سے پہلے اسی کا تذکرہ فرمایا۔ ایضاً:ص۱۱۵

۵۔ یہ لوگوں میں سب سے دراز قد تھا۔ ہودہ اٹھانے میں مشہور تھا۔ میدان جنگ میں ہمیشہ ثابت قدم رہتا اس لیے جذلُ الطِّعان کہلایا۔ گویا وہ کسی درخت کا ایستادہ تنا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ وہ صائب الرائے تھا اس لیے اس لقب سے ملقب ہوا۔ ایضاً

۶۔ الروض الانف: ج:۱ص۱۱۶ ۷۔ ایضاً:ص۱۱۴

۸۔ الجامع الصحیح مسلم؛ کتاب القسامہ:۲۹ ۹۔ الروض الانف: ج:۱ص۱۱۴

۱۰۔ امیر علی، سید، سپرٹ آف اسلام، ترجمہ: روح اسلام از ھادی حسین، ادارہ ثقافت، کلب روڈ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص:۱۳۶

۱۱۔ مہدی رزق اللہ احمد، سیرت نبوی، مکتبہ دارالسلام ۱۴۳۰ھ، ج:۱ص۱۵۵

۱۲۔ السخاوی، شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن، الاعلان بالتوبیخ، مترجم محمد یوسف، سید، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۱۶۸

۱۳۔ الجامع الصحیح مسلم، کتاب الصیام، ۱۹۷

۱۴۔ محمد سلیمان سلمان، منصور پوری، رحمۃ للعالمین ﷺ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ج:۱ص۴۰

۱۵۔ القرآن الکریم: ۶:۶۱

۱۶۔ ابن ہشام، ابو محمد عبدالملک، الروض الانف معہ سیرت النبویہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ج:۱ص۳۹۴

۱۷۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۷۱ء، تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں، ج:۵ ص۴۶۱تا۴۷۵

۱۸۔ الروض الانف، ج:۱ص۲۷۴

۱۹۔ محمد ادریس کاندھلوی، سیرت المصطفےٰ ﷺ مکتبہ محمودیہ، س۔ن، ج:۱ص۴۵

۲۰۔ رحمۃ للعالمین: ج:۱ص۴۰

۲۱۔ شبلی نعمانی، علامہ، سیرت النبی ﷺ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۳۶۴ھ، ج:۱ص:۱۷۱

۲۲۔ السیرۃ النبویہ: ج:۱ص:۲۷۸ ۲۳۔ الروض الانف: ج:۱ص۲۸۲

۲۴۔ ابن جریر طبری، تاریخ طبری، تاریخ الرسل والملوک، مصر ۱۹۶۱ء ج:۲ص۱۲۵

۲۵۔ محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء النبی ﷺ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۵ھ، ج:۲ص۳۳

۲۶۔ ابن سید الناس، عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر، منشورات دارالآفاق الجدیدہ بیروت، ۱۹۸۲ء، ج:۱ ص۲۶

۲۷۔ ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل، السیرۃ النبویہ، داراحیاء تراث العربی، بیروت، س۔ن، ج:۱ص۱۹۹

۲۸۔ ضیاء القرآن، ص:۲ص۳۹

۲۹۔ خالد علوی، انسان کامل، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۳۱

۳۰۔ سیرت النبی ﷺ: ج:۱ص۱۷۱ ۳۱۔ رحمۃ للعالمین، ج:۱ص۴۰

32. Ameer Ali,The spirit of Islam,University paper backs ,1922, london p: 8

۳۳۔ محمد رضا، محمد رسول اللہ، بیروت، ۱۹۷۵ء، ج:۲ص۱۹

۳۴۔ الروض الانف، ج:۱ص۲۹۴ ۳۵۔ السیرۃ النبویہ، ج:۱ص۳۰۰

۳۶۔ روح اسلام،ص۸۲
۳۷۔ ایضاً،حاشیہ ص۸۲
۳۸۔ الروح الانف،ج:اص:۳۱۴
۳۹۔ ایضاً،ج:اص۳۱۲
۴۰۔ اکرم ضیاء عمری،السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ،ترجمہ:سیرت رحمت عالم ﷺ،ص۱۱۳
۴۱۔ الروض الانف،ج:اص۳۱۹
۴۲۔ السیرۃ النبویہ،ج:اص۳۱۸
۴۳۔ الروض الانف،ج:اص۲۴۲
۴۴۔ فکرونظر،سیرت نمبر،ادارہ تحقیقات اسلامی،دسمبر۱۹۹۲م،ص۶
۴۵۔ سیرت نبوی،ص:۲۱۱
۴۶۔ السیرۃالنبویہ،ج:اص۴۰۰
۴۷۔ سیرت نبوی،ج:اص۲۴۴
۴۸۔ الجامع الصحیح للبخاری،بداءالوحی۶۹۸۲
۴۹۔ الروض الانف،ج:اص۳۹۷
۵۰۔ ایضاً:ص۳۹۸
۵۱۔ ایضاً:ص۳۹۶
۵۲۔ محمد ہاشم،بذل القوہ فی حوادث سنی النبوہ،ترجمہ:سیرۃ سیدالانبیاء،مترجم:محمد علیم الدین،مظہر عالم،لاہور، ص۶۹
۵۳۔ صفی الرحمٰن مبارکپوری،الرحیق المختوم،المکتبۃ السّلفیہ،لاہور۱۹۹۹م،ص۱۰۷
۵۴۔ سیرۃ سیدالانبیاء،ص۷۰تا۷۹
۵۵۔ ایضاً:ص۸۹
۵۶۔ القرآن الکریم:۱۵:۹۴
۵۷۔ سیرۃ سیدالانبیاء،حاشیہ،ص۹۴
۵۸۔ الروض الانف ج:اص۱۰۱
۵۹۔ ایضاً؛ج:۲ص۱۰۹
۶۰۔ السیرۃ النبویہ:ج:۲ص۱۶۱
۶۱۔ سیرت رحمت عالم،ص۱۰۲
۶۲۔ السمہودی،نورالدین علی بن احمد،وفاالوفا باخبار المصطفیٰ،بیروت،۱۹۷۱م،ج:اص۲۱۸
۶۳۔ سیرت سیدالانبیاء،ص۱۱۵
۶۴۔ ایضاً:ص۱۱۷
۶۵۔ ایضاً
۶۶۔ ایضاً:ص۱۱۹
۶۷۔ ایضاً
۶۸۔ سلیمان ندوی،سید،سیرت عائشہؓ،مکتبہ مدینہ لاہور،۱۹۲۰م ص۲۶
۶۹۔ ایضاً:ص۳۲
۷۰۔ ایضاً:ص۱۰۸
۷۱۔ السیرۃ النبویہ،ج:۲ص۲۲۹
۷۲۔ الروض الانف،ج:۲ص۲۳۵
۷۳۔ الرحیق المختوم،ص۱۹۷
۷۴۔ سیرت نبوی،ج:اص۳۷۶
۷۵۔ ایضاً
۷۶۔ السیرۃ النبویہ،ج:۲ص۲۸۲
۷۷۔ روح اسلام،ص۱۲۷
۷۸۔ ایضاً
۷۹۔ محمد بن سعد،طبقات الکبریٰ،بیروت ۱۹۶۰م،ج:اس۲۲۱
۸۰۔ سیرت سیدالانبیاء،ص۱۴۰
۸۱۔ ایضاً:ص۱۴۱

اردو سفرناموں میں عہدِ مکی کے آثارِ سیرت نبوی ﷺ

محمود الحسن☆/ڈاکٹر مطلوب احمد☆☆

Abstract:

"Islam was not only revealed to the Holy Prophet (SAW), it was also consolidated by him within the national boundaries of Arabia. He was not only the Prophet, but also the statesman, the seer and the builder of Islam, both as religion, a state and society. The Seerah of MOHAMMAD (ﷺ) is a wonderful instance of the force and life that resides in him who possesses an intense faith in Allah T'ala. He will always be regarded as one of those who have had that influence over the faith, morals and whole earthly life of their fellowmen. The Makkah's land is full of the traces of the Holy Prophet (ﷺ). The writers of the Travelling Books described all details of his Seerah marks and traces which are found in different places of sacred city of Makkah with purity and sincerity i.e. Birth place, House of Arqam, cave of Hira, Cave of Thour, place of Hudaibia, well of Ze-Twaa, Mosques Jinn, Kauther & Jannat ul Mu'alla."

Keywords: Seerah traces, Makkah, House of Arqam, Hira Cave.

سرزمین مکہ نقوشِ پائے مصطفیٰ ﷺ سے بھری پڑی ہے اور اپنے اپنے سفرناموں میں نامہ نگاروں نے ان آثارِ مقدسہ کا ذکر دل کھول کر اور نہایت عقیدت سے کیا ہے۔ چونکہ ہر کسی کی کیفیات اور اسلوب اس کی ترجیحات کے مطابق جدا جدا ہیں لہٰذا کچھ نامہ نگار حج وعمرہ کے سادہ سے بیان کے بعد دیگر آثار کا ذکر برائے نام ہی کرتے نظر آتے ہیں مگر اکثریت نے اللہ تعالیٰ کے پاک گھر اور شہر رسول ﷺ کی

☆ ایم فل سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد

☆☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج آف کامرس، فیصل آباد

نسبت سے اس ''بلدالامین'' کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔

مکہ معظّمہ، جہاں تاجدار کائنات ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کے ۵۳ برس گذارے، اس کا چپہ چپہ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کے نقوش سے بھرا پڑا ہے۔ ڈاکٹر محمد شہاب الدین لکھتے ہیں:

> ''حج نامہ میں اس عظیم ہستی کا ذکر جمیل بھی بکثرت آتا ہے جو بعد از خدا بزرگ تر ہے۔ اس عظیم پیغمبر اسلام کا ذکر حج ناموں کا روشن باب ہے۔ تمام ہی حج نامہ نگار متعدد مواقع پر اس ذات جمیل سے اظہار محبت کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ مقام ولادت کو دیکھتے ہیں، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں حضور ﷺ کے سجدوں کے نشان اور مکہ و مدینہ اور حجاز کے راستوں اور گلیوں میں ان کے نشانات قدم تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح حج ناموں میں آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کے روشن نقوش بھی سمٹ کر محفوظ ہو گئے ہیں۔''(۱)

مکہ مکرمہ کا وہ مقام مقدس جہاں رسول اللہ ﷺ کی ولادت با سعادت ہوئی سفر ناموں میں اس کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مولدِ رسول ﷺ کے آس پاس کے آثار جن میں حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکانات اور شعب ابی طالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حضور ﷺ کی جائے ولادت کے بالکل نزدیک بیان کیے گئے ہیں لہٰذا ان تمام مقامات کو الگ الگ بیان کرنے کی بجائے ان کا ذکر بھی مولدِ رسول ﷺ کے ساتھ ہی کر دیا گیا ہے۔

مولدِ رسول ﷺ

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا وہ گھر جہاں تاجدار کائنات ﷺ نے آنکھ کھولی، حرم کعبہ سے کچھ ہی فاصلہ پر واقع ہے۔

اطہر اقبال، پیروز بخت قاضی اور مولانا مودودی کی رودادِ سفر لکھنے والے محمد عاصم الحداد نے جبل ابوقبیس کے دامن میں واقع گھر کو حضور ﷺ کی جائے پیدائش لکھا ہے۔ پیروز بخت قاضی نے بیان کیا ہے کہ اس پہاڑی کے دامن میں محلّہ قشاشیہ کی ایک گلی میں وہ مکان ہے جہاں حضور ﷺ کی ولادت ہوئی۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ مولدِ رسول ﷺ کی چودہ سو سال پرانی عمارت تو باقی نہیں رہی البتہ اس جگہ ایک سادہ سی عمارت ہے جس میں ایک کتب خانہ قائم ہے۔ انہوں نے اس جگہ کا فاصلہ حرم سے قریباً ایک کلومیٹر بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی محلّہ بنی ہاشم، شعب ابی طالب اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنھا کا مکان ہے جہاں حضور ﷺ ہجرت سے قبل تک مقیم رہے اور جہاں بی بی فاطمۃ الزہراء اور دیگر اولادیں پیدا ہوئیں۔(۲)

ڈاکٹر محمود الحسن عارف اس مکان کا ذکر محلّہ شعب عامر میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وقت یہ مقام باب الصفا کے سامنے واقع ہے اس پر ''مکتبہ مکہ المکرّمہ'' کا بورڈ آویزاں ہے۔ یہ ہر وقت

مقفل رہتا ہے لوگ اس کے باہر کھڑے ہوکراس کی زیارت کرتے ہیں۔(۳)

حضورﷺ کے جائے ولادت کو اب لائبریری میں تبدیل کر دیا گیا ہے مگر زائرین کو اس کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے اور وہاں پر ایک کتبہ زائرین کا منہ چڑا رہا ہے کہ یہ جگہ مصدقہ نہیں ہے۔ اس جگہ کے علاوہ عرب کی سرزمین پر کسی اور جگہ ایسے کسی کتبہ کا ذکر نہیں ملتا۔

''سفرنامہ ارض القرآن'' میں حضورﷺ کی جائے پیدائش کا بیان زرد رنگ کی ایک خوبصورت عمارت کی صورت میں ملتا ہے اور اس عمارت کولڑکیوں کا مدرسہ بتایا گیا ہے۔(۴)

جاوید جمال ڈسکوی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

> ''محلّہ شعب عامر کی ایک گلی سوق اللیل ہے جہاں پختہ سڑک نما بازار میں نیلے رنگ کے دروازے والے مکان میں ایک چھوٹی سی لائبریری ہے جس کے بورڈ پر'' مکتبہ مکۃ المکرّمہ'' لکھا ہے۔ یہ لائبریری دراصل نبی کریمﷺ کے والد محترم عبداللہ بن عبدالمطلب کا گھر ہے۔اس مکان میں حضورﷺ پیدا ہوئے۔''(۵)

اس کے بعد دیگر مکانات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صفا سے مروہ کی طرف دائیں ہاتھ اونچائی پر ایک بازار ہے جس کا نام'' شارع الصاعہ'' ہے وہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنھا کا مکان ہے اور اسے عام طور پر مولد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنھا کہا جاتا ہے۔ جبکہ محلّہ مسفلہ میں زقاق صواغین نامی ایک گلی میں امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مکان ہے اور یہی وہ مکان ہے جہاں ہجرت کی شب حضورﷺ تشریف لائے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔''(۶)

وحید قیصر نے بھی اس مکان کا جبل ابوقبیس کے دامن میں محلّہ قشاشیہ کی گلی سوق الیل میں ہونا بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ پورا علاقہ بنی ہاشم کہلاتا تھا۔یہیں وہ جگہ تھی جسے شعب ابی طالب کا نام دیا گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اہل اسلام کی انتہائی عقیدت کی وجہ سے اصل مکان اپنی اصل حالت میں ایک عرصے تک قائم رہا۔لیکن انتہائی عقیدت کے نتیجے میں کچھ بدعتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک وقت ایسا آیا جب ان بدعتوں کو ختم کرنے کے لیے حکام وقت کو کچھ سخت اقدامات کرنے پڑے۔ اس تاریخی عمارت کا تقدس ختم کرنے کے لیے آخر کار اسے ڈھا دیا گیا اور اس کے انہدام کے بھی پچاس برس بعد یہاں اہل مکہ کی درخواست پر یہ مدرسہ اور لائبریری قائم کر دی گئی۔''(۷)

یہ بھی ممکن ہے کہ محلّہ قشاشیہ اور شعب عامر ایک ہی جگہ کے دو نام ہوں کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ یہ جگہ حرم کے قریب اور جبل ابوقبیس کے دامن میں تھی۔ شورش کاشمیری نے یہاں کچھ معلومات کا

اضافہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''سہیل مجھے سیدھا اس مکان میں لے گیا جو مولد نبی ﷺ تھا لیکن اب وہاں ایک چھوٹی سی لائبریری ہے اس وقت قفل چڑھا ہوا تھا۔ یہ مکان حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے حضور کے والد حضرت عبداللہ کو ان کی شادی پر دیا تھا۔ حضور ﷺ نے عقیلؓ ابی طالب کو ہبہ کر دیا، حجاج کے عہد میں اس کے بھائی یوسف نے خرید لیا اور دار بیضا میں شامل کر دیا۔ خیزران کے عہد میں مدرسہ بنا دیا گیا۔ اب یہاں مدرسہ بھی ہے اور لائبریری بھی۔ اس پر کوئی نشان نہیں۔ تب اس شارع پر بازار تھا کہ نہیں لیکن اب بازار ہے اور گردو پیش کے دکاندار اپنے کاروبار میں لگے رہتے ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنھا کا مکان محلّہ زقاق میں ہے اس کو بیت النبی ﷺ بھی کہتے ہیں حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنھا یہیں پیدا ہوئیں۔''(۸)

مولد رسول کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ نے صلاح الدین محمود کے ''خاک حجاز کے نگہبان'' کا ایک اقتباس درج کیا ہے:

''پھر ترکوں نے ایک پہاڑ کی کوکھ میں اُس چھوٹے سے گھر کا تعین بھی کیا جس کی پہلی منزل پر شمال کی جانب قائم ایک چھوٹے سے بالکل چوکور کمرے میں کہ جہاں چہار آئینوں کی اوٹ میں چہار سمتیں ملتی تھیں، ایک بچہ جس کو کائنات کی امان تھی، ظہور میں آیا تھا۔ پھر اس بچے کو ایک بزرگ انسان نے اپنے سخت اور سورج سے کملائے ہاتھوں سے اپنی ایک چادر میں لپیٹا تھا اور وہ پگڈنڈی طے کی تھی جو اللہ کے گھر تک جاتی تھی۔ پہلی ربیع الاول کو اس کمرے کے اندر سفید رنگ کیا جاتا۔ رنگ ساز حافظ قرآن ہوتے اور پھر ربیع الاول کی اس رات جب آپ کا ظہور ہوا۔ معصوم بچے اس کمرے میں آکر قرآن کی تلاوت کرتے، اگلی صبح پرندے آزاد کرنے کا رواج تھا۔''(۹)

''ضیاء النبی'' میں ''السیرۃ الحلبیہ'' اور ''الروض الانف'' کے حوالے سے درج ہے کہ یہ مکان پہلے عقیل بن ابی طالب اور ان کی اولاد کی ملکیت میں رہا پھر حجاج کے بھائی محمد بن یوسف ثقفی نے خرید لیا۔ سفید چونے اور پلستر کی وجہ سے اسے ''البیضاء'' کہا جاتا تھا۔ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے یہ مکان حاصل کر کے اس جگہ مسجد تعمیر کر دی۔ عین ممکن ہے کہ پہلے وہاں مسجد تعمیر کرنے کا شرف خیزران (ہارون الرشید کی والدہ) نے حاصل کیا ہو۔ پھر زبیدہ خاتون مکہ مکرمہ آئی ہو تو اس نے اس مسجد کو از سرنو شایانِ شان طریقہ پر تعمیر کیا ہو۔(۱۰)

ہر قوم اپنے یادگار آثار کو قائم رکھتی ہے یہ انسان کا اپنا ذہنی تخیل ہی نہیں بلکہ قرآن مجید میں بار بار ذکر کر کے ان آثار کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ بات کتنی خوبصورت ہے کہ مقدمین اس گھر کو ربیع الاول میں سفیدی کرواتے، قرآن خوانی ہوتی اور صدقہ کے طور پر پرندے آزاد کیے جاتے۔ یہ سب کچھ

پیارے نبی ﷺ کے نام پر ہوتا جن کی بدولت انسانیت ظلم کے شکنجے سے آزاد ہوئی۔

دارارقم

مکہ مکرمہ میں پہلی باقاعدہ اسلامی درس گاہ بننے کا شرف حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے اس گھر کو حاصل ہوا جو تا قیامت دارارقم کے نام سے مشہور ہو گیا۔ دارارقم کو دعوت اسلامی کی پوری تاریخ میں جو اہمیت اور اولیت حاصل ہے وہ کسی بھی دوسری جگہ کو حاصل نہیں ہے یہی وہ جگہ تھی جہاں ہجرت سے پہلے حضور ﷺ اور صحابہ کرام کفار مکہ کے شر سے بچنے کے لیے چھپ چھپا کر جمع ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ''سفر نامہ ارض القرآن'' میں اس حوالے سے خاصی تفصیل موجود ہے۔ محمد عاصم نے اس جگہ کی تاریخی اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس فکری پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اس قدر اہم مقام کو محفوظ رکھنے کی کوئی نہ کوئی اسکیم ضرور بنانی چاہیے تھی۔ ۱۹۴۹ء میں اس مقام کی زیارت کا احوال بیان کرتے ہوتے وہ لکھتے ہیں:

> '' مکہ معظّمہ میں جتنے دوسرے آثار، گھر اور مساجد ہیں، ان کی نسبت تاریخی لحاظ سے بہرحال یقینی نہیں ہے لیکن دارالارقم کی نسبت تاریخی لحاظ سے تقریباً یقینی اور قطعی تھی۔ یہ جس جگہ پر آج سے چند سال پہلے تک قائم تھا، تمام مسلمان بادشاہوں اور امراء نے اس کی اس لحاظ سے ہمیشہ حفاظت کی کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں دارالارقم قائم تھا۔ ہر دور میں اس جگہ قرآن و حدیث کی تعلیم کا کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری رہا۔ عمارتیں اگرچہ گرتی اور پھر سے بنتی رہی ہوں گی لیکن بہرحال جگہ وہی رہی۔ آخری عمارت جسے ۴۹ء میں ہم نے خود دیکھا ہے، غالباً نویں صدی ہجری کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے دروازے پر بھی دارالارقم لکھا ہوا تھا۔''(۱۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نویں صدی ہجری کی تعمیر شدہ یہ عمارت ۱۹۴۹ء تک قائم تھی جسے بعد میں دیگر تعمیرات کی وجہ سے ختم کرنا پڑا۔ اس حوالے سے وہ مزید لکھتے ہیں کہ دارارقم کا نصف حصہ نئی تعمیرات کے سلسلے میں سڑک کے نیچے آ گیا ہے اور بقیہ نصف حصہ قریب کی دکانوں میں سے ایک دکان میں شامل کر دیا گیا ہے گویا اب دارارقم نامی کوئی عمارت مکہ معظّمہ میں موجود نہیں ہے۔(۱۲)

جاوید جمال ڈسکوی نے بھی اپنے سفر نامہ میں دارارقم کو مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کا خفیہ مرکز بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مقام کوہ صفا کی سمت بنے ہوئے دروازوں میں سے پہلے دروازے کے سامنے ہے۔ سعی کرتے ہوئے ایک دروازے پر دارارقم لکھا نظر آتا ہے۔ یہ مکان حضرت ارقم بن ابی الارقم مخزومی کا تھا اور نبوت کے پانچویں سال حضور ﷺ نے اس مکان کو اپنی دعوت اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے اجتماع کا مرکز بنا لیا تھا۔(۱۳)

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ نے بھی دارارقم کو کوہ صفا کے قریب ہی بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ سعودی حکومت نے حرم کے قریب سڑکوں کی تعمیر و توسیع کے دوران اسے مسمار کر دیا۔ لیکن انہوں نے لکھا ہے کہ

دارارقم نبوت کے چھٹے سال تک مسلسل تین سال تحریک اسلامی کا خفیہ مرکز رہا۔[۱۴]

دیگر چند سفرناموں میں بھی ان سے ملتی جلتی کچھ باتیں موجود ہیں۔ البتہ شورش کاشمیری کا یہ اقتباس متنوع معلومات اور دلچسپی سے بھرپور ہے:

''ابوبکر نے جہاں مکی زندگی گذاری تھی ہم اس مکان سے ہوتے ہوئے دارارقم پہنچ گئے۔ اب صفا کے پہلو میں اس کا نشان رہ گیا ہے۔ ایک بہت بڑی بلڈنگ جس میں کئی دکانیں اور دفاتر قائم ہیں، صفا اور مروہ کے حاشیہ پر کھڑی ہے۔ اس عمارت میں یہ مکان بھی ضم ہو چکا ہے۔ اس مکان کو بڑے شرف حاصل تھے۔ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ گیارہ یا بارہ صحابہ رضوان اللہ عنھم کے بعد ایمان لائے تھے۔ تب سرورِ کائنات ﷺ اور ان کے گیارہ بارہ ساتھی اس مکان میں چھپ کے رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہیں اسلام قبول کیا تھا۔ منصور عباس نے حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ بن عثمان کو امام حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے کی حمایت کے جرم میں قید کر دیا پھر رہائی کا وعدہ دے کر یہ مکان سترہ ہزار دینار میں خرید لیا۔ خلیفہ مہدی نے اپنی جاریہ خیزراں کو دے دیا۔ آخر یہ مظہرہ قدس جہاں قرآن پاک کی بہت سی آیتیں نازل ہوئی تھیں، شاہوں کی نذر ہو کر محو ہو گیا۔''[۱۵]

دارارقم کی بابت سفرناموں اور سیرت و تاریخ میں جو دو باتیں بغیر کسی اختلاف رائے کے موجود ہیں جن کی وجہ سے اس مقام کو دوام ملا وہ مسلمانوں کی سب سے پہلی تربیت گاہ ہونا اور اسی مقام پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایمان لانا ہے۔ نیز اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ یہاں قرآن کریم کی آیتوں کا بھی نزول ہوتا رہا۔

غارِ حرا

اعلان نبوت سے قبل معرفت الٰہی اور محبت الٰہی کے جذبہ سے سرشار ہو کر حضور ﷺ نے اس مقدس غار کو گوشۂ تنہائی کے طور پر منتخب فرما لیا تھا جہاں آپ کئی کئی دن اللہ کی یاد میں مشغول رہتے۔ نامہ نگاروں کی اکثریت نے اس مقام کا تذکرہ اپنے سفرناموں میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس پہاڑ کی چوٹی پر یہ غار ہے اُسے جبل نور کہتے ہیں۔ نسیم حجازی نے مختصر الفاظ میں اس مقام کا تذکرہ نہایت خوبصورت اور دلکش انداز میں کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

''جس نور کے لیے مشرکین مکہ نے خانہ کعبہ کے دروازے بند کر دیئے تھے، اس کے لیے اس سنگلاخ چٹان نے اپنا سینہ کھول دیا تھا۔ یہ وہ پہاڑ ہے جس نے سب سے پہلے نبوت کا جاہ و جلال دیکھا تھا اور اس کی چوٹی کے قریب وہ غار ہے جہاں سرورِ کونین ﷺ کے پاس جبرئیل امین علیہ السلام رب العالمین کا اولین پیغام لے کر آئے تھے۔''[۱۶]

یہ پہاڑ اپنی آغوش میں کائنات کی اس عظیم ہستی کو کئی ماہ و سال تک لیے رہا جس کا وجود مسعود

پوری انسانیت ہی نہیں بلکہ کل مخلوقات کے لیے منبع رحمت ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے لوگ فرط محبت سے اس پہاڑ کی غار کی زیارت کی غرض سے سفر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الحسن عارف ''جبل نور'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''جبل نور نیچے سے لے کر اوپر تک بے آب و گیاہ پہاڑ ہے جس میں یہ رمز پوشیدہ ہے کہ ''نور'' کا سفر بظاہر خشک نظر آتا ہے مگر بباطن اس کا حسن و جمال ہزار گل وگلزار کو مات کر دیتا ہے۔ زائرین کی بکثرت آمد و رفت نے اس پر راستہ اور پگڈنڈی سی بنا دی ہے جس سے اترنے اور چڑھنے میں سہولت پیدا ہوگئی ہے۔''(۱۷)

انہوں نے مزید لکھا ہے کہ غار حرا ایک چھوٹا سا مقام ہے جس میں ایک شخص بمشکل لیٹ سکتا ہے۔ یہاں سے بالکل ناک کی سیدھ میں بیت اللہ نظر آتا ہے لیکن اب مسجد حرام دو منزلہ ہو جانے کی وجہ سے اس کے مینار تو نظر آتے ہیں کعبۃ اللہ کی عمارت نہیں اور اس مقام میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔(۱۸)

اطہر اقبال نے غار حرا کا مکہ سے فاصلہ ۳ میل اور بلندی تقریباً دو ہزار فٹ بیان کی ہے۔(۱۹)

جبکہ محمد شریف طارق ایڈووکیٹ نے اس کی سمت بتائی ہے کہ مکہ سے بائیں جانب جاتے ہوئے ایک پہاڑ ہے جس کو جبل نور کہتے ہیں جس میں غار حرا واقع ہے۔(۲۰)

جاوید جمال ڈسکوی کے مطابق اس کی چڑھائی جبل ثور سے کم اور آسان ہے۔ اس کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز ہے اور یہ نیچے کی جانب زیادہ گہرا نہیں ہے۔(۲۱)

شورش کاشمیری غار حرا کی بلندی کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ لوگ جن کا عشق اور عمر دونوں جوان ہوتے ہیں، غار حرا تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں نیچے کھڑا غار حرا کو تکتا رہا۔ اس عظیم انسان کی ہمت کا اندازہ کیجئے جو مسلسل چالیس سال تک اس چوٹی تک پہنچتا اور اس غار میں عبادت کرتا رہا۔ علامہ مشرقی کا جملہ ہے کہ اس پہاڑ پر چڑھنا عام انسان کے بس میں نہیں اللہ تعالیٰ کا اولوالعزم پیغمبر ہی آ جا سکتا تھا اور یہ صرف انہی کی ہمت کا معجزہ تھا۔''(۲۲)

شورش کا انداز بیان اور قلبی کیفیت اپنی جگہ، مگر یہاں فرطِ جذبات میں انہوں نے غارِ حرا میں حضور ﷺ کی مدت عبادت چالیس سال بیان کر دی جو کہ حقیقت نہیں کیونکہ کتب سیرت کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ رویائے صادقہ کی وجہ سے حضور ﷺ کے دل میں خلوت گزینی کی محبت پیدا ہوگئی جس کے بعد آپ نے غار حرا میں جانا شروع کر دیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ حضور علیہ السلام کے دور جوانی میں شروع ہوا ہوگا۔ ویسے بھی بچپن کے کئی سال اور سفر شام کی مدت نکال دیں تو عرصہ کم ہی بنتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف غار حرا کا تعارف کچھ یوں کرواتے ہیں:

> ''یہی وہ مقدس غار ہے جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف

سے نازل ہونے والی پہلی وحی لے کر آئے تھے۔اس تاریخی سورہ کا نمبر ۹۶ ہے۔ یہ دو عنوانوں سے مشہور ہے: العلق اور اقراء۔''(۲۳)

شاہ مصباح الدین شکیل نے اپنی تصنیف ''نشانات ارض نبوی ﷺ'' میں غار حرا کے حوالے سے چند معلومات درج کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''حرا کے لفظی معنی ہیں تلاش وجستجو، گویا غار اسم با مسمیٰ ہے۔ جبل نور کو قدیم زمانے میں جبل حرا کہا جاتا تھا۔ کبھی یہ پہاڑ ریتلے صحرا میں اپنی خاص وضع کی بنا پر دیگر پہاڑوں کے درمیان ممتاز نظر آتا تھا۔ اس کے بالکل سامنے جبل ثبیر ہے لیکن بلندی میں وہ جبل حرا سے کم ہے۔ جبل حرا سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ بلند ہے۔ پہاڑ پر نہ کوئی درخت ہے اور نہ سبزہ۔ البتہ کہیں کہیں خاردار جھاڑی نظر آتی ہے۔''(۲۴)

اعلانِ نبوت سے قبل عبادت الٰہی کے لیے اس مقدس مقام کا انتخاب ہی اس کی رفعت اور عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے ورنہ اللہ پاک کی عبادت کے لیے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مکان کا بھی کوئی گوشہ منتخب کیا جا سکتا تھا۔ اور خانہ کعبہ جو مرکز تجلیات الٰہی ہے وہاں پر عبادت کا رنگ ہی اور ہوتا ہے۔ غار حرا کا چناؤ دراصل سنت رسول کے لازم ہونے کی ایک کڑی تھی۔ آپ ﷺ کے اس عمل مبارک سے کچھ وقت کے لیے دنیا و مافیہا سے کٹ کر فقط اللہ کی یاد میں رہنا سنت بن گیا۔ اس سنت کو بعد میں امت کے صالحین نے اپنے اپنے وقتوں میں قائم رکھا۔ اعتکاف بھی خلوت نشینی کی ایک خوبصورت شکل ہے۔

غارِ ثور

غارِ ثور وہ مقدس جگہ ہے جہاں سفر ہجرت کی پہلی شب نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تشریف لے گئے اور تین دن قیام فرمایا۔

ابن بطوطہ نے مکہ سے یمن کی طرف اس کا فاصلہ ایک فرسخ بتایا ہے جبکہ اطہر اقبال نے اپنے سفر نامہ میں یہ فاصلہ چھ میل بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر چڑھتے وقت تقریباً دو گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔(۲۵)

نسیم حجازی لکھتے ہیں:

''جبل ثور مکہ سے کوئی تین میل دور ہے اور اس کی بلندی ایک میل کے لگ بھگ ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا انتہائی دشوار گذار راستوں سے ہر روز شام کی تاریکی میں وہاں پہنچنا عزم وایثار کی تاریخ کا عظیم کارنامہ ہے۔''(۲۶)

یہی وہ غار ہے جس میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تین دن اور تین راتیں بلا شرکت غیرے چہرہ رسول ﷺ کو تکنے کا شرف حاصل ہوا اور تاجدارِ کائنات ﷺ کی توجہات خصوصی کا فیض بھی

صرف اور صرف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا۔ مکڑی کا غار کے منہ پر جالا بننا اور فاختہ کا اس جال کے باہر انڈے دینا بھی اسی غار کی نسبت سے ہے۔

محمد شریف طارق ایڈووکیٹ اپنے سفر نامہ عمرہ میں لکھتے ہیں کہ جبل ثور بلند اور پُر پیچ چڑھائی والا پہاڑ ہے۔ یہاں پتھر بھی بڑے سخت ہیں اس غار میں دو آدمیوں کے لیٹنے کی جگہ ہے، تین یا چار بیٹھ سکتے ہیں۔(۲۷)

دیگر سفر ناموں میں ان سے مختلف کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ پیر کرم شاہ نے لکھا ہے کہ جبل ثور اس وقت کے مکہ شہر سے تقریباً تین میل کی مسافت پر جنوبی سمت میں واقع تھا۔ اب یہ سلسلہ بہت پھیل گیا ہے اور مکانات کا سلسلہ ان پہاڑوں تک پہنچ گیا ہے جہاں غار ثور واقع ہے۔(۲۸)

سفر ناموں میں درج فاصلوں میں جو تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ غالباً یہی رہی ہوگی کہ جب مکہ کی آبادی زیادہ نہ پھیلی تھی تو یہ فاصلہ زیادہ شمار کیا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ آبادی بڑھنے سے یہ فاصلہ کم ہوتا چلا گیا۔

جبل ابوقبیس

وہ نامہ نگار جنہوں نے اپنے سفر ناموں میں جبل ابوقبیس کا ذکر کیا ہے اس بات کو بالاتفاق لکھتے ہیں کہ بلاشبہ یہ وہ پہلا پہاڑ ہے جو روئے زمین پر گاڑا گیا۔ وحید قیصر کے بقول:

> ''تاریخ بتاتی ہے کہ طوفان نوح کے دوران جہاں خانہ کعبہ کو نقصان پہنچا وہاں جنت سے لایا ہوا حجرا سود بھی یہاں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس پتھر کی خوبی یہ ہے کہ یہ پانی پر تیرتا ہے۔ تاریخ میں یہ بھی رقم ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے زمین کو وسعت دی تو پہاڑ اس پر میخوں کی طرح گاڑے گئے اور جبل ابوقبیس وہ پہلا پہاڑ ہے جو روئے زمین پر گاڑا گیا۔ اسی جبل ابوقبیس کی چوٹی پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسے مسجد بلال کہا جاتا ہے زائرین اس تک آسانی سے جا سکتے ہیں۔''(۲۹)

اس عظیم پہاڑ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں کہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو حج کے لیے بلایا تو اسی جبل ابوقبیس پر چڑھ کر لوگوں کو آواز دی۔ الغرض ابوقبیس کا یہ سارا علاقہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں ہر عمارت اس قابل تھی کہ اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا جاتا۔(۳۰)

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''میرے سامنے جبل ابوقبیس ہے جو حرم سے جنوب مشرق میں واقع ہے کہتے ہیں دنیا میں سب سے پہلے یہی پہاڑ پیدا کیا گیا۔ قریش اس پہاڑ کو الامین کہتے تھے اس لیے کہ ان کے خیال میں طوفان نوح کے وقت حجر اسود کو اسی پہاڑ پر بطور امانت رکھا گیا تھا۔

بعد میں جب ابوقبیس نامی ایک شخص نے اسے پہاڑ پر رہائش اختیار کی تو اس کا نام جبل ابوقبیس پڑ گیا۔''(۳۱)

''سفرنامہ ارض القرآن'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بنو ہاشم اسی طرف آباد تھے جدھر یہ پہاڑ ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں بھی کچھ ایسی ہی معلومات دی ہیں جن کو باقی سفرناموں نے بیان کیا۔ البتہ اس کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''جبل ابوقبیس حرم شریف پر آب ریز ہے جس سے مکہ کا حُسن، حرم اور اس کی ہمواری کا جمال اور کعبہ کی زینت دوبالا ہو جاتی ہے۔''(۳۲)

کتب تواریخ اور کتب سیر کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ شق القمر بھی اسی پہاڑ پر ظہور پذیر ہوا تھا۔

مقام حدیبیہ

رسول اللہ ﷺ اور کفار مکہ کے مابین طے پانے والا پہلا عظیم معاہدہ جو حضور ﷺ کی عظیم ترین سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کا منہ بولتا ثبوت ہے، اسی مقام پر طے پایا اور اس جگہ کو ابدالاباد تک دوام نصیب ہو گیا۔ سفرناموں میں بالاتفاق اس مقام کی سمت کا بیان ہے کہ جدہ سے مکہ مکرمہ کی طرف آتے ہوئے حدود حرم سے پہلے یہ مقام آتا ہے۔

''سفرنامہ ارض القرآن''، ''میرے حضور کے دیس میں'' اور ''سفرنامہ عمرہ (آقا حضور ﷺ کے قدموں میں)'' و دیگر میں مقام حدیبیہ کا موجودہ نام ''شمیسی'' بتایا گیا ہے۔ جاوید جمال ڈسکوی نے مکہ مکرمہ سے اس کا فاصلہ ۱۵ میل بیان کیا ہے جبکہ ۱۹۴۹ء میں اس مقام کی زیارت کرنے والے مولانا مودودی کے سفرنامہ میں یہ فاصلہ ۳۲ کلومیٹر درج ہے اور لکھا ہے کہ اب اس مقام پر ایک مسجد ہے۔(۳۳)

محمد شریف طارق ایڈووکیٹ لکھتے ہیں:

''شمیسی مکہ مکرمہ سے ۱۵ میل یا ۲۲ کلومیٹر دور ایک تاریخی مقام ہے جہاں پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس وقت تو قلب پر گراں گذرتا تھا مگر بعد ازاں فتح مبین میں بدل گیا۔ شمیسی کا تاریخی نام ''حدیبیہ'' ہے۔''(۳۴)

شورش کاشمیری حدیبیہ کا تعارف ان الفاظ میں کرواتے ہیں:

''حدیبیہ مکہ معظّمہ کے پڑوس میں دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ گاؤں بھی ہے اور کنواں بھی۔ کنویں کی وجہ سے گاؤں کا نام پڑا یا گاؤں کی وجہ سے کنواں حدیبیہ ہو گیا، بہر حال صلح حدیبیہ نے اس کو زندہ و جاوید کر دیا کہ تاریخ انسانی میں ہمیشہ کے لیے روشن ہو گیا۔''(۳۵)

جاوید جمال ڈسکوی نے حدیبیہ کے کنویں کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا ہے کہ وہاں صرف ایک ہی کنواں تھا جس میں پانی بہت کم تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے عرض کرنے پر حضور ﷺ نے اس کنویں کا پانی منگوا کر وضو کیا اور تھوڑا سا پانی پی کر اس برتن میں کلی کی اور حکم دیا کہ یہ پانی کنویں میں ڈال دو اور اپنا ایک نیزہ بھی دیا کہ کنویں کے اندر زمین میں گاڑ دو جس کے بعد ایک دم سے اللہ کے حکم سے پانی ابلنا شروع ہوا۔ اسی مقام پر ''بیعت رضوان'' ہوئی۔ جس کنویں میں آپ ﷺ کا نیزہ گاڑا گیا تھا اور پانی ابلنا شروع ہو گیا تھا، آج بھی اسی طرح ہے۔ اگرچہ مدت مدید سے اس کنویں کی صفائی نہیں کرائی گئی اور نہ ہی اس کی حفاظت کا کوئی انتظام ہے۔ ریت کے بگولے اس کے اندر پھرتے رہتے ہیں مگر سرکار دو عالم ﷺ کے کلی کے پانی اور نیزے کی وجہ سے پانی کو اس کنویں سے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ کنویں کے ساتھ ہی مقام صلح حدیبیہ اور مقام بیعت رضوان ہونے کی وجہ سے ترکوں نے یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنادی ہے جو آج کل شکستہ حالت میں ہے۔ (۳۶)

مسجد الرایہ۔۔۔ذی طویٰ کا کنواں

سفرناموں میں درج معلومات کے مطابق ''الرّایہ'' کا معنی جھنڈا ہے اور مسجد الرایہ سے وہ مسجد مراد ہے جو اس مقام پر تعمیر کی گئی ہے جہاں فتح مکہ کے روز حضور ﷺ نے اپنا جھنڈا نصب فرمایا تھا۔ ''سفرنامہ عمرہ'' میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ بڑی تاریخی جگہ ہے اور اس جگہ ایک کنواں بھی تھا جس کا پانی صحت کے لیے اچھا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکہ کی فتح مبین کی خبر اس جگہ پا کر حضور ﷺ نے یہیں اپنے لشکر کو ترتیب دیا۔ اس کنویں کے پانی سے غسل کیا اور مکہ میں داخل ہوئے۔ (۳۷)

ڈاکٹر محمود الحسن عارف لکھتے ہیں کہ اس سے وہ مسجد مراد ہے جو اس مقام پر تعمیر کی گئی جہاں فتح مکہ کے روز نبی اکرم ﷺ کے نامور کمانڈر حضرت خالد بن ولید نے جو حجون کے راستے سے مکہ میں داخل ہوئے تھے، جھنڈا نصب فرمایا تھا۔ یہ مسجد جنت المعلیٰ کے راستے میں برلب سڑک واقع ہے۔ (۳۸)

مسجد جن

سورۂ جن کی ابتدائی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے متعدد نامہ نگاروں نے لکھا ہے یہ مسجد اس جگہ واقع ہے جہاں جنات نے نبی کریم ﷺ کو قرآن پاک پڑھتے سنا۔ اطہر اقبال کے بقول:

> ''یہ مسجد سوقِ معلیٰ میں جنت المعلیٰ کے قریب ہے۔ اس کا نام مسجد بیعت اور مسجد حرم بھی ہے یہیں حضور ﷺ نے جنوں سے بیعت لی تھی۔ اس وقت کھلا میدان تھا اب خوبصورت مسجد بنادی گئی ہے۔'' (۳۹)

''تابخاک حرم'' اور ''میرے حضور کے دیس میں'' کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ مسجد محلّہ شعب عامر و محلّہ سلیمانیہ کے درمیان جنت المعلیٰ کے راستے میں سڑک کے کنارے واقع ہے۔

نیز اسے سرخی مائل ٹائلوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔

جاوید جمال ڈسکوی نے بھی اس بات کو بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ اپنے ساتھیوں سمیت عکاظ بازار تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں آپ ﷺ نے نخلہ کے مقام پر صبح کی نماز پڑھائی اس وقت جنات کا ایک گروہ وہاں سے گذر رہا تھا تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا۔(۴۰)

مسجد جعرانہ

جاوید جمال ڈسکوی کے سفرنامہ میں اس مسجد کا تذکرہ ملتا ہے کہ حضور ﷺ نے آخری حج کے لیے اس جگہ سے احرام باندھا۔ یہاں سے بھی حد حرم شروع ہوتی ہے انہوں نے اس مقام پر ایک کنویں کا بھی ذکر کیا ہے جس کا پانی بہت صحت بخش ہے۔(۴۱)

مسجد استراحہ و مسجد کوثر

جاوید جمال ڈسکوی کے علاوہ محمد شریف طارق نے بھی ان مساجد کا ذکر کیا ہے کہ منیٰ سے مکہ آتے ہوئے محلّہ ''معابدہ'' کے مقام پر حضور ﷺ نے ۱۳ ذوالحجہ کو حج سے واپسی پر ظہر اور عصر کی نماز پڑھی اور آرام فرمایا اس لیے اس مسجد کا نام ''مسجد استراحہ'' ہے۔ اور منیٰ کی طرف جاتے ہوئے درمیانے شیطان کے قریب ایک مسجد ہے اس جگہ سورۂ کوثر نازل ہوئی تھی۔ اسے ''مسجد کوثر'' کا نام دیا گیا۔

ان کے علاوہ بھی کچھ سفرناموں میں نبی کریم ﷺ کی نسبت سے فیض پا جانے والے چند مقامات، جہاں مساجد تعمیر کی گئیں، ان کا ذکر ہے جن میں سے کچھ کا تذکرہ سابقہ فصول میں مختصراً ہو چکا۔ ان سمیت کچھ مساجد کے نام یہ ہیں۔

مسجد عقبہ: منیٰ کی ابتداء میں ایک تاریخی مسجد جہاں انصار مدینہ نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حضور سے بیعت کی۔

مسجد مزدلفہ: اس مسجد کو مشعر الحرام بھی کہتے ہیں۔ اس جگہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے پوری رات ذکر و فکر میں گذاری۔

مسجد خیف: یہ منیٰ کی سب سے بڑی مسجد ہے جہاں حضور ﷺ کا خیمہ لگایا گیا تھا۔

نیز کچھ سفرناموں میں ''غار مرسلات'' کا ذکر بھی آتا ہے جس کے سائے میں حضور ﷺ نے آرام فرمایا اور یہیں سورۂ مرسلات نازل ہوئی۔

حجاز کے سفرناموں کے مطابق ''وادی قدید'' وہ مقام ہے جہاں سراقہ کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا تھا۔ ان مقامات کا تذکرہ چند سفرناموں کے علاوہ زیادہ نہیں ملتا۔

جنت المعلیٰ

مکہ کا یہ تاریخی قبرستان جہاں ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سمیت بے شمار نفوس قدسیہ مدفون ہیں۔نسیم حجازی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''مکہ کا قدیم قبرستان جہاں کہیں کہیں بزرگان دین کی مسمار شدہ قبروں کے معمولی نشان رہ گئے ہیں۔میرا معلّم مجھے ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر پر لے گیا۔دوسری قبروں کی طرح یہ قبر بھی تقریباً ہموار کر دی گئی ہے اور اردگرد چند ٹوٹی ہوئی سلیں چُن دی گئی ہیں۔''(۴۲)

نسیم حجازی کے تحریر کردہ درج بالا اقتباس کی طرح دیگر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ جنت البقیع کے بعد یہ سب سے افضل قبرستان ہے جہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سمیت نبی کریم ﷺ کے آباء و اجداد مدفون ہیں۔یہیں پر آپ ﷺ کے دو صاحبزادے حضرت قاسم رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ آرام فرما ہیں۔ان کے علاوہ بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، تابعین اور اولیائے کرام بھی یہیں مدفون ہیں۔''تا بخاک حرم'' میں یہاں مدفون صحابہ کرام کی تعداد چھ ہزار بتائی گئی ہے۔اور یہ بھی کہ یہ قبرستان مستطیل شکل میں ہے۔(۴۳)

سفر ناموں میں جنت المعلیٰ کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کا ذکر ملتا ہے۔اور یہ حجون کے پاس کے علاقے میں ہے۔سید خالد جاوید مشہدی کے مطابق اس مقام کو جہاں خاندان بنو ہاشم کی قبریں ہیں، ایک جالی دار چار دیواری سے محصور کر دیا گیا ہے۔نیز ان قبور پر کسی قسم کا کوئی نشان موجود نہیں۔(۴۴)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر کا ذکر قبرستان کے شمالی حصہ میں ملتا ہے۔جبکہ دیگر نامہ نگاروں کے برعکس ڈاکٹر فرید احمد پراچہ نے بیان کیا ہے کہ مختلف سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے بعد یہ قبرستان اب تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔البتہ قبریں کچی ہیں اور برابر کر دی گئی ہیں۔(۴۵)

سرزمین مکہ میں سیرت سے متعلقہ بے شمار دیگر آثار بھی ہیں جن کا تذکرہ کسی سفر نامے میں بھی نہیں ملتا کیوں کہ وہ جگہیں اب محفوظ نہیں رہیں۔البتہ ہر نامہ نگار نے کوشش کی ہے کہ حرم مکہ میں حضور ﷺ سے منسوب مقامات کو احاطۂ تحریر میں لائے اور اُن مقامات متبرکہ کا بیان کرے جن کو حضور ﷺ نے قدم بوسی کا شرف بخشا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد شہاب الدین، ڈاکٹر: اردو میں حج کے سفرنامے، ص ۳۵
۲۔ قاضی، پیروز بخت: جادۂ شوق، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۴ء، ص ۸۷
۳۔ محمود الحسن عارف، ڈاکٹر: تابخاک حرم، ص ۱۱۸
۴۔ محمد عاصم: سفرنامہ ارض القرآن، ص ۱۵۴
۵۔ ڈسکوی، جاوید جمال: میرے حضور کے دیس میں، ص ۲۳
۶۔ ایضاً، ص ۲۶-۲۹
۷۔ وحید قیصر: عقیدت کا سفر، ص ۱۰۲
۸۔ شورش کاشمیری: شب جائے کہ من بودم، ص ۴۶
۹۔ تارڑ، مستنصر حسین: منہ ول کعبے شریف، ص ۲۳۵
۱۰۔ الازہری، محمد کرم شاہ: ضیاء النبی، ص ۴۲
۱۱۔ محمد عاصم: سفرنامہ ارض القرآن، ص ۱۵۲
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۱
۱۳۔ ڈسکوی، جاوید جمال: میرے حضور کے دیس میں، ص ۲۰
۱۴۔ فرید احمد پراچہ، ڈاکٹر: سفر شوق، ص ۳۷
۱۵۔ شورش کاشمیری: شب جائے کہ من بودم، ص ۸۷
۱۶۔ نسیم حجازی: پاکستان سے دیار حرم تک، لاہور، جہانگیر بکس، س ن، ص ۱۰۵
۱۷۔ محمود الحسن عارف، ڈاکٹر: تابخاک حرم، ص ۱۲۰
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۱
۱۹۔ اطہر اقبال: مسافر حرم کا، ص ۱۵۴
۲۰۔ ایڈووکیٹ، محمد شریف طارق: سفرنامہ عمرہ آقا حضور کے قدموں میں، میرپور، کاشر ایڈورٹائزرز، ۲۰۰۷ء، ص ۴۹
۲۱۔ ڈسکوی، جاوید جمال: میرے حضور کے دیس میں، ص ۴۷
۲۲۔ شورش کاشمیری: شب جائے کہ من بودم، ص ۶۵
۲۳۔ عبدالرؤف، ڈاکٹر: مقدس سفرنامہ، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۱
۲۴۔ شکیل، شاہ مصباح الدین: نشانات ارض نبوی، ص ۱۱۲
۲۵۔ اطہر اقبال: مسافر حرم کا، ص ۱۵۳

۲۶۔ نسیم حجازی: پاکستان سے دیارِ حرم تک، ص۱۱۱
۲۷۔ ایڈووکیٹ، محمد شریف طارق: سفر نامہ عمرہ آقا حضور کے قدموں میں، ص۶۲
۲۸۔ الازہری، محمد کرم شاہ: ضیاء النبی، ج ۳، ص۶۳
۲۹۔ وحید قیصر: عقیدت کا سفر، ص۵۶
۳۰۔ ایضاً، ص۵۶
۳۱۔ فرید احمد پراچہ، ڈاکٹر: سفر شوق، ص۳۸
۳۲۔ ابن بطوطہ، محمد: سفر نامہ ابن بطوطہ، مترجم رئیس احمد جعفری، ص۱۶۶
۳۳۔ ڈسکوی، جاوید جمال: میرے حضور کے دیس میں، ص۱۴
۳۴۔ ایڈووکیٹ، محمد شریف طارق: سفر نامہ عمرہ آقا حضور کے قدموں میں، ص۵۵
۳۵۔ شورش کاشمیری: شب جائے کہ من بودم، ص۳۲
۳۶۔ جاوید جمال ڈسکوی: میرے حضور کے دیس میں، ص۱۴
۳۷۔ ایڈووکیٹ، محمد شریف طارق: سفر نامہ عمرہ آقا حضور کے قدموں میں، ص۵۰
۳۸۔ محمود الحسن عارف، ڈاکٹر: تابخاک حرم، ص۱۲۵
۳۹۔ اطہر اقبال: مسافر حرم کا، ص۱۵۳
۴۰۔ ڈسکوی، جاوید جمال: میرے حضور کے دیس میں، ص۳۶
۴۱۔ ایضاً، ص۵۰
۴۲۔ نسیم حجازی: پاکستان سے دیار حرم تک، ص۱۱۳
۴۳۔ محمود الحسن عارف، ڈاکٹر: تابخاک حرم، ص۱۲۳
۴۴۔ مشہدی، خالد جاوید، سید: اے اللہ میں حاضر ہوں، ص۸۸
۴۵۔ فرید احمد پراچہ، ڈاکٹر: سفر شوق، ص۴۸

تحریک استشراق ــــ مبدا و اہداف پر تنقیدی نظر

ڈاکٹر یاسر عرفات اعوان☆

Abstract:

"Orientalism emerged and developed in went as a great movement during 14th century a.d. the western scholars took interest in the study of the east, especially the Islamic literature. With the passage of time, it became a targeted study, focused to misinterpret Islam and the Holy Prophet Mohammad (ﷺ), although a reasonable number of orientalists have to admit the reality that the Prophethood of Mohammad (ﷺ) is full of truthfulness by every respect and they became also the Muslims. The following article is a critical study in this regard."

Keywords: Orientalism, Islamic literature, Misinterpretation, Truthfulness, Preaching of Islam.

استشراق (Orientalism) ایک جدید اصطلاح ہے جو قدیم عربی ادب اور لغات میں موجود نہیں ہے۔ انگریزی زبان کے لفظ Orientalism کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استشراق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ سہ حرفی مادہ شرق سے مشتق ہے جس کا مطلب روشنی اور چمک ہے۔ یہ لفظ مجازی معنوں میں سورج کے لیے بھی مستعمل ہے۔ اسی طرح شرق اور مشرق سورج کے طلوع ہونے کے مقام کو بھی کہتے ہیں۔ صاحب لسان العرب کہتے ہیں:

"الشرق: الضوء والشرق الشمس، وروی عمرو عن ابیه انه قال الشرق الشمس بفتح الشین والشرق الضوء الذی یدخل من شق الباب، شرقت الشمس تشرق شروقا وشرقا طلعت واسم الموضع المشرق"(۱)

شرق کا معنی روشنی اور اسی طرح سورج بھی ہے، عمرو نے اپنے باپ کے واسطے سے نقل کیا ہے

☆ لیکچرار شعبہ علومِ اسلامیہ و عربی، گورنمنٹ یونیورسٹی فیصل آباد

کہ انہوں نے کہا: شرق شین کے فتحہ کے ساتھ سورج کو کہتے ہیں اور شرق اس روشنی کو بھی کہتے ہیں جو دروازے کے سوراخ سے اندر آتی ہے۔ شَرَقَتِ الشَّمس اور تَشَرَّق جن کا مصدر شروق اور شرق ہے یہ طَلَعَتْ (طلوع ہوا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی سے اسم ظرف مشرق ہے۔

لفظ شرق میں تین حروف الف، س اور تاء کا اضافہ کر کے جب اسے باب استفعال کے وزن پر لایا جائے تو اس کے اندر طلب کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی استشراق سے مراد مشرق کی طلب ہے۔ سید محمد شاہد لفظ اوریئنٹ (Orient) کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مغربی لغات میں استشراق صرف جغرافیائی مفہوم میں مشرق کی طلب کے لیے مستعمل نہیں ہے بلکہ روشنی، نور اور ہدایت کی طلب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "شرق(Orient) فوجد انه يشار إلى منطقة الشرق المقصودة بالدراسات الشرقية بكلمة تتميز بطابع معنوى وهو(Morgenland) وتعنى بلاد الصباح، ومعروف ان الصباح تشرق فيه الشمس، وتدل هذه الكلمة عليتحول من المدلول الجغرافى الفلكى إلى التركيز على معنى الصباح الذى يتضمن معنى النور واليقظة، وفى ومقابل ذلک نستخدم فى اللغة. كلمة(Abendland) وتعنى بلاد المساء لتدل على الظلام والراحة...... وفى اللاتينية تعنى كلمة Orient: يتعلم او يبحث عن شىء ما وبالفرنسية تعنى كلمة Orienterوجّه او هدى او ارشد"(۲)

سید محمد شاہد کے بقول شرق (Orient) کے کلمہ کے ساتھ مشرق کے علاقے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو کہ شرقی تحقیقات کا مقصود ہے ایسا کلمہ استعمال کرتے ہوئے جس میں معنوی چھاپ کا امتیاز ہے جو کہ (Morgenland) مارجن لینڈ ہے جس سے مراد صبح کے علاقے ہیں اور یقینی بات ہے کہ صبح میں سورج طلوع ہوتا ہے۔ اب یہ کلمہ اپنے جغرافیائی اور فلکی معنی سب سے ہٹ کر صُبح کے معنی پر بھرپور دلالت کرتا ہے جو صبح نور اور بیداری کے مفہوم کو شامل ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں ہم (Abendland) کا کلمہ استعمال کرتے ہیں جس سے مراد شام کے علاقے ہیں تا کہ یہ تاریکی اور سستی پر دلالت کرے، لاطینی زبان میں Orient لفظ کا معنی وہ سیکھتا ہے یا کسی چیز کے بارے میں جستجو کر رہا ہے۔ جبکہ فرانسیسی میں Orienter کا معنی ہے اس نے رہنمائی کی، راستہ بتایا اور سیدھی راہ دکھلائی۔

انگریزی لفظ اوری اینٹ (Orient) مشرق کے لیے مستعمل ہے اور اوری اینٹل ازم (Orientlism) کے معنی شرق شناسی یا مشرقی علوم وفنون اور ادب میں مہارت حاصل کرنے کے ہیں مستشرق (استشراق کے فعل سے اسم فاعل) سے مراد ایک ایسا شخص ہے جو بہ تکلف مشرقی بنتا ہو۔(۳)

ایسا غیر مشرقی عالم جو مشرقی علوم(Oriental Sciences)،عقائد، تاریخ، ادب اور معاشرت وغیرہ میں دلچسپی رکھتا ہو مستشرق کہلاتا ہے۔ایڈورڈ سعید استشراق اور مستشرق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "Anyone who teaches, writes about, or reseaches the orient and this applies whether the person is an Anthropologist, Sociologist, Historian or Philologist either in its specific or its general aspects, is an Orientalist and what he or she says or does is Orientalism."(4)

محمد یوسف رامپوری ماہر لغت زلفو مدینہ کی تشریحات کی روشنی میں مستشرق کے مفہوم کی تحدید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مستشرق مغرب کے ایسے عالم کو کہتے ہیں جو اسلام، اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت اور اسلامی زبانوں میں دلچسپی رکھتا ہو۔(۵)

محمد یوسف رام پوری کی مذکورہ تعریف میں حاملین اسلام کے لیے کسی علاقے خطے یا ریاست کی حد بندی نہیں کی گئی ہے۔

علم استشراق کے ممتاز عالم علی بن ابراہیم النملۃ مغربی عالم کی تحدید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مستشرق ایسے غیر مسلم دانشور کو قرار دیتے ہیں کہ جو مسلمانوں کے فرہنگ، اعتقادات اور آداب ورسوم کے بارے میں تحقیق کرے چاہے وہ مسلمان گروہ اور قوم مشرقی علاقے میں رہنے والی ہو یا جنوب میں چاہے عربی بولنے والے ہوں یا غیر عربی۔(۶)

ڈاکٹر احمد عبدالحمید غراب اپنی کتاب رؤیۃ الاسلامیۃ للاستشراق میں استشراق کی متعدد تعریفات کا تذکرہ کرنے کے بعد خود تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "هو دراسات اكاديمية يقوم بها غربيون كافرون من اهل الكتاب بوجه خاص للاسلام والمسلمين، من شتى الجوانب، عقيدة وشريعة، وثقافة، وحضارة، وتاريخاً ونظما، وثروات وامكانات...... هدف تشوية الاسلام، ومحاولة تشكيک المسلمين فيه، وتضليلهم عنه وفرض التبعية للغرب عليهم ومحاولة تبدير هذه التبعية بدراسات ونظريات تدعى العلمية والموضوعية، تزعم التفوق العنصرى والثقافى للغرب المسيحى على الشرق الاسلامى"(۷)

یہ ان علمی تحقیقات کا نام ہے جس کا اہتمام اہل کتاب کے مغربی کافر خاص طور پر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مختلف پہلوؤں سے کر رہے ہیں۔عقیدہ وشریعت کے اعتبار سے،تہذیب وثقافت،

تاریخ اور نظم ونسق کے اعتبار سے اور موجودہ اور ممکنہ وسائل کے بارے میں۔ جس کا ہدف اسلام کی بدنمائی، مسلمانوں میں اس کے متعلق شکوک وشبہات اٹھانے کی کوشش، ان کو اسلام سے بھٹکانا اور ان پر مغرب کی پیروی کو لازمی قرار دینا اور اس تقلید کو جواز فراہم کرنے کی کوشش ایسی تحقیقات اور نظریات کے ساتھ جن کے بارے میں علمی اور موضوعاتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسیحی مغرب کو شرق اسلامی پر عنصری (جسمانی) اور ثقافتی برتری حاصل ہے۔

ڈاکٹر غراب کے مطابق مغربی اہل کتاب مسیحی مغرب کی اسلامی مشرق پر نسلی اور ثقافتی برتری کے زعم کی بنیاد پر مسلمانوں پر اہل مغرب کا تسلط قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو اسلام کے بارے میں گمراہی اور شک میں مبتلا کرنے اور اسلام کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے عقیدہ، ثقافت، شریعت، تاریخ، نظام اور وسائل و امکانات کا جو مطالعہ غیر جانبدار تحقیق کے دعوے کے ساتھ کرتے ہیں اسے استشراق کہا جاتا ہے۔

معروف اُردو سیرت نگار پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ ڈاکٹر غراب کی مذکورہ تعریف میں بعض خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مستشرق کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''اہل مغرب بالعموم اور یہود ونصاریٰ بالخصوص، جو مشرقی اقوام خصوصاً ملت اسلامیہ کے مذاہب، زبانوں، تہذیب وتمدن، تاریخ، ادب، انسانی قدروں، ملی خصوصیات، وسائل حیات اور امکانات کا مطالعہ معروضی تحقیق کے لبادے میں اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان اقوام کو اپنا ذہنی غلام بنا کر ان پر اپنا مذہب اور اپنی تہذیب مسلط کر سکیں اور ان پر سیاسی غلبہ حاصل کر کے ان کے وسائل حیات کا استحصال کر سکیں، ان کو مستشرقین کہا جاتا ہے اور جس تحریک سے وہ لوگ منسلک ہیں وہ تحریک استشراق کہلاتی ہے۔''(۸)

مذکورہ تعریفات کے علاوہ بھی استشراق کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں کہ جن میں ایک پہلو مشترک ہے کہ استشراق مغربی دانشمندوں کی اسلام وملت اسلام کے بارے میں تحقیقات کا میدان ہے کہ جہاں وہ اپنے مخصوص عزائم ومقاصد کے حصول کے لیے اپنی صلاحیتیں کھپا رہے ہیں اور عموماً ان کی سرگرمیوں میں اسلام کی غیر حقیقی صورت گری وتصویر کشی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

استشراق کے لفظ کی کوئی قدیم تاریخ نہیں ہے۔ جیسا کہ ماقبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک نیا لفظ ہے، یہ پرانی لغات میں موجود نہیں ہے۔ اے جے آربری (Arthur Jhon Arberry) کہتے ہیں کہ استشراق (Orientalism) کا لفظ پہلی دفعہ ۱۶۳۸ء میں یونانی کلیسا کے ایک پادری نے استعمال کیا۔(۹)

میکسم روڈنسن (Maxime Rodinson) کے مطابق استشراق کا لفظ فرانس کی کلاسیکی لغت میں ۱۷۹۹ء میں درج ہوا اور انگریزی زبان میں ۱۸۳۸ء میں شامل کیا گیا۔(۱۰)

تحریک استشراق کا آغاز

تحریک استشراق کے آغاز کے بارے میں کہ یہ تحریک کس سن میں شروع ہوئی اور کس موقع پر اس کا ظہور ہوا اختلاف رائے پایا جاتا ہے بعض اہل علم کی رائے ہے کہ استشراق کا ظہور اسلام کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا یہود و نصاریٰ کی نسلی و علمی برتری کا نشہ اسلام نے توڑا تو انہوں نے اسلام مخالف سرگرمیاں شروع کیں اور یہی استشراق کا نقطہ آغاز تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے معاصر یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے بعد پہلا آدمی جس نے باقاعدہ طور پر اسلام کے خلاف تحریری جنگ آٹھویں صدی عیسوی میں شروع کی وہ جان آف دمشق (یوحنا دمشقی) تھا۔ اس نے دو کتابیں ''محاورہ مع الاسلام اور ارشادات النصاریٰ فی جدل المسلمین''، لکھیں۔ (۱۱)

کچھ اہل علم کی رائے ہے کہ تحریک استشراق کا آغاز ۱۳۱۲ء میں ہوا جب فینا میں کلیسا کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ طے ہوا کہ یورپ کی جامعات میں عربی، عبرانی اور سریانی زبان کی تدریس کے لیے پیرس اور یورپ کی طرز پر چیئرز قائم کی جائیں۔ (۱۲)

بعض اہل علم کے نزدیک اس تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جب علماء مغرب نے اندلس کے علمی عروج کو دیکھتے ہوئے وہاں کا رخ کیا ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی لکھتے ہیں:

''ان بعض الرهبان الغربيين قصدوا الاندلس فى إبان عظمتها و ومجدها، وتثقفوا فى مدارسها، وترجموا القرآن والكتب العربية إلى لغاتهم، تلمذوا على علماء المسلمين فى العلوم وبخاصة فى الفلسفة والطب والرياضيات''(۱۳)

بعض مغربی راہبوں نے اندلس کی عظمت اور رفعت کے ایام میں وہاں کا قصد کیا، اس کے مدارس میں تعلیم حاصل کی، قرآن اور عربی کتب کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا، انہوں نے مختلف علوم میں اور خاص طور پر فلسفہ، طب اور ریاضیات میں مسلمان علماء کی شاگردی اختیار کی۔

اسی طرح یہ رائے بھی موجود ہے کہ اس تحریک کا آغاز دسویں صدی میں اس وقت ہوا جب ایک فرانسیسی پادری جربرٹ ڈی اویلیک (Gerbert D'Aurillac) اشبیلیہ اور قرطبہ کی جامعات میں علوم اسلامیہ پر دسترس حاصل کر لینے کے بعد ۹۹۹ء سے ۱۰۰۳ء تک پاپائے روم کے عہدہ پر متعین رہا۔ (۱۴)

علم استشراق کے بعض ماہرین کے مطابق تحریک استشراق کا آغاز بارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ جب پطرس محترم (Peter The Venerable) کے ایماء پر لاطینی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا گیا۔ (۱۵)

کچھ ماہرین استشراق اس تحریک کا آغاز تیرہویں صدی عیسوی میں ثابت کرتے ہیں جب

الفانسود ہم نے ۱۲۶۹ء میں مرسیا (Murcia) میں تقابل ادیان کے حوالے سے ایک ادارہ (Alfonsox) ابوبکر رقوطی کے زیر نگرانی قائم کیا۔ اسی ادارے میں قرآن کریم کا ہسپانوی (Spainish) زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اسی دور میں فریڈرک دوم نے بھی اسلامی موضوعات پر مشتمل کتب کے تراجم کرائے اور یورپ کے تعلیمی اداروں میں بھیجا۔ (۱۲)

اہل مغرب نے اپنی تعلیمی درسگاہوں میں عربی و اسلامی علوم کی خصوصی چیئرز قائم کیں۔ ۱۵۳۹ء میں فرانس، ۱۶۳۲ء میں کیمبرج اور ۱۶۳۸ء میں آکسفورڈ میں باقاعدہ چیئرز قائم کی گئیں۔

ماقبل مذکورہ آراء سے تحریک استشراق کے نقطۂ آغاز کی تعیین آسان نہیں ہے لیکن علمی ذخائر میں محفوظ معلومات کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا۔

مندرجہ بالا آراء سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ استشراق کے بانیوں میں اکثریت مذہبی پیشواؤں (راہبوں اور پادریوں) کی تھی۔ یہ مذہبی پیشوا اسلام کو ایک خطرہ سمجھتے تھے اس لیے ان کی علمی سرگرمیوں میں اسلام سے منافرت کا رنگ واضح دکھائی دیتا ہے، گو کہ علمائے استشراق میں وہ حضرات بھی شامل رہے ہیں کہ جن کی علمی کاوشوں سے علمیت کا معیار و وقار بلند ہوا لیکن بحیثیت مجموعی استشراق، اسلام مخالف تحریک کے طور پر منصۂ شہود پر نمودار ہوا ہے۔

تحریک استشراق کی تاریخ

تحریک استشراق کی تاریخ اور مستشرقین کی علمی و تحقیقی جدوجہد کو سمجھنے کے لیے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے ایک وقیع مقالہ میں مستشرقین کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے:

ا۔ پہلا دور

استشراق کے پہلے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب مسلمانوں نے اندلس کو علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ اہل مغرب اس علمی وتمدنی عروج سے استفادہ کرنے کے لیے اندلس کا رخ کرتے تھے۔ اندلس کی طرف رجوع کرنے والوں کی بڑی تعداد ایسی بھی تھی جو اسلام مخالف جذبات سے سرشار تھے۔

۲۔ دوسرا دور

دوسرے دور کا تعلق صلیبی جنگوں کے زمانے سے ہے حربی میادین میں شکست کی خفت نے دنیائے نصرانیت کو اسلام مخالفت میں عروج پر پہنچا دیا۔ علمائے استشراق نے اس دور میں اسلام کی جو تصویر پیش کی اس کا اثر مدتوں یورپ کی آبادیوں میں غالب رہا۔

۳۔تیسرا دور

تحریک استشراق کے تیسرے دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب صنعتی انقلاب نے یورپی دنیا میں استعمار اور ملک گیری کی نئی خواہشات کو بیدار کر دیا اور مغربی طاقتوں نے استبدادی عزائم کے ساتھ مشرق کو دیکھنا شروع کر دیا۔

۴۔چوتھا دور

چوتھا دور وہ ہے جب نوآبادیاتی نظام کا دم واپسیں شروع ہوا اور غیر ملکی تسلط کے خلاف آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا۔علمائے استشراق کے انداز تحقیق اور طریقہ کار (Methodology) میں واضح تبدیلی نمودار ہوئی اسلام کے ساتھ بظاہر احترام کے برتاؤ نے فروغ پایا۔

۵۔پانچواں دور

استشراق کے پانچویں دور کا تعلق اس زمانے سے ہے جب قدرت کی طرف سے مسلم دنیا کو زر سیال کی دولت سے مالا مال کیا گیا تو اہل مغرب کی حریص نگاہیں اس دولت پر مرکوز ہوگئیں۔(۱۷)

ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں شامل اپنے مقالہ استشراق میں تحریک استشراق کے تین ادوار ذکر کئے ہیں،ان کے مطابق پہلے دور کی ابتداء اسلام کے ساتھ ہی ہوگئی جب قدم قدم پر اسلام کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جبکہ تحریک استشراق کے منظّم اور باقاعدہ دور کا آغاز (دوسرا دور) سلطنت روما اور پاپائیت کی سرپرستی میں صلیبی جنگوں کے بعد ہوا جب اس تحریک نے ایک دینی تحریک کی شکل اختیار کی۔استشراق کے تیسرے اور موجودہ دور کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی سے شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔(۱۸)

تحریک استشراق کے اغراض ومقاصد

تحریک استشراق کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک متعدد مقاصد و اہداف کی حامل رہی ہے:

ا۔دینی اہداف

جیسا کہ ماقبل ذکر کیا گیا کہ اسلام کی روز افزوں ترقی نے مخالفین (خصوصاً یہود و نصاری) کی برتری کو ختم کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے اسلام کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا،اسلامی تعلیمات پر شکوک و شبہات کے پردے ڈالے جانے شروع کئے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی تحریک استشراق کے دینی اہداف کا تذکرہ کرتے ہوئے چار نکات ذکر کرتے ہیں:

۱۔ تحریک استشراق کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں اپنے نبی، قرآن عظیم، شریعت اسلامیہ اور فقہ اسلام کے بارے میں شک کے بیج بونا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے اندر اپنی تہذیب وثقافت کے بارے میں شکوک وشبہات کو فروغ دینا اور اس بات کا پرچار کرنا کہ اسلامی تہذیب اپنی اصل کے اعتبار سے رومی تہذیب سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

۳۔ مسلمانوں میں اپنے علمی واعتقادی ورثے کے بارے میں شکوک کو جنم دے کر اسے ناقص ثابت کرنا تاکہ مسلمان اپنے دین سے بیزار ہو کر کفار کی صفوں میں جگہ پائیں۔

۴۔ مسلمان معاشروں میں اخوت ومودت کے جذبات کو ختم کرنے کے لیے ان کے درمیان قومیت و نسل کی بنیاد پر اختلاف کو فروغ دینا۔(۱۹)

استشراق کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ غالب پہلو جس نے علمائے استشراق کو اسلام کے بارے میں مطالعہ کرنے کی طرف راغب کیا وہ مذہبی و دینی تھا۔ مستشرقین کا ایک بڑا مقصد دین مسیحیت کی تبلیغ وترویج اور دین اسلام کی تضعیف اور اس کی تحریف رہا ہے اسلام کا مطالعہ بھی اس لیے کیا جاتا رہا تاکہ اس کے خلاف منصوبہ سازی کر کے اس کی ایسی تصویر کشی کی جائے جس سے لوگ اس دین سے متنفر ہو جائیں۔ ڈاکٹر مازن لکھتے ہیں:

"فغاية الهدف الدينى هى معرفة الإسلام لمحاربته وتشويهه وإبعاد النصارى عنه، وقد اتخذ النصارى المعرفة بالإسلام وسيلة لحملات التنصير التى انطلقت إلى البلاد الإسلامية، وكان هدفها الاوّل تنفير النصارى من الإسلام"(۲۰)

ڈاکٹر مازن کے بقول مستشرقین کے دینی ہدف کا انتہائی مقصود اسلام کی معرفت تھا تاکہ اس کا مقابلہ کیا جا سکے اور عیسائیوں کو اس سے دور رکھا جائے، بلاشبہ عیسائیوں نے اسلام کے متعلق معرفت کو ہی تنصیری حملوں کا وسیلہ بنایا جو مسلمانوں کے علاقوں پر ہوئے کیونکہ اس کا سب سے اولین ہدف عیسائیوں کو اس دین سے بدکانا تھا۔

علمی اہداف

عالم مغرب کے بعض علماء وفضلاء نے مشرقیات واسلامیات کا انتخاب اپنے علمی ذوق کی وجہ سے کیا وہ دیدہ ریزی اور دماغ سوزی سے کام لیتے ہوئے اسلام کے منابع اور فرہنگ کا مطالعہ کرتے تھے ایسے ہی اہل علم کی مساعی سے بہت سے مشرقی واسلامی علمی نوادر پردۂ خفا سے نکل کر منصۂ شہود پر آئے۔ متعدد اسلامی ماخذ اور تاریخی وثائق ان کی محنت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔

اسلام کا معروضی مطالعہ کرنے والے مستشرقین میں اہم نام تھامس آرنلڈ (Thomas

Arnold) کا ہے۔ ان کی تصنیف دعوت اسلام (Preaching of Islam) ایک قابل قدر کتاب ہے۔ بعض مستشرقین نے آرنلڈ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ اس نے یہ تصنیف اہل اسلام کی محبت میں ڈوب کر لکھی ہے۔(۲۱)

اس علمی اعتراف کے باوجود گروہِ مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا ایک ایسا طبقہ ہے جس نے قرآن وحدیث، سیرت وفقہ اسلامی اور اخلاق وتصوف کے میادین میں بارہا طبع آزمائی کی لیکن حقائق کو آشکار کرنے کا جذبہ غالب نہ آسکا بلکہ اسلام سے دور اور حق کے انکار کے جذبے نے ترقی پائی، تعلیمی و فلاحی ادارے قائم کر کے سائنسی بنیادوں پر اسلام مخالف مہم کا آغاز کیا گیا۔
مریم جمیلہ لکھتی ہیں:

> "A few outstanding western scholars have devoted their lives to Islamic studies because of sincere interest in them. Were it not for their industry, much valuable knowledge found in ancient Islamic manuscripts would have been last or lying forgotten in obscurity. English Orientalists like the late Reynolds Nicholson and the late Arthur Arberry accomplished notable work in the field of translating classics of Islamic literature and making them the general reader for the first time in a European language."(22)

مریم کے بقول بعض نامور مغربی محققین نے اسلامی علوم کے مطالعہ میں مخلصانہ شوق کی بنا پر زندگیاں کھپادیں اگر وہ کوشش نہ کرتے تو بہت سارا قیمتی سرمایہ (اسلامی مخطوطات) کھو گئے ہوتے یا گوشہ خمول میں پڑے رہتے۔ انگریز مستشرقین جیسا کہ رینالڈ نکلسن اور آرتھر آربری نے اسلامی ادب کے کلاسیکی شہ پاروں کا ترجمہ کیا (جس نے بڑی شہرت پائی) اور ان کی بدولت یورپی زبانوں میں عام آدمی کے مطالعہ کے لیے اسلامی ادب دستیاب ہوا۔

سیاسی اہداف

عالم مغرب نے اپنے سیاسی توسیعی عزائم کے لیے علمائے استشراق کی خدمات حاصل کیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے استعمار کے غلبے اور تسلط کے لیے راہ ہموار کی۔ مستشرقین سرزمین مشرق میں استعمار کے لیے امکانی مفادات کی نشاندہی کرتے۔ نوآبادیاتی دور میں وہ محکوم علاقوں کی زبان، ادب، مذہب وثقافت، عرف وعادت اور وسائل وخزائن کے بارے میں علمی مواد

مرتب کرتے تا کہ استعماری قوتیں مستقبل کی دیرپا منصوبہ بندی کر سکیں۔ استعمار واستشراق کے اسی باہمی تعلق کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر مازن نے استاذ محمود شاکرؒ کا قول ذکر کیا ہے:

"فقدموا معلومات موسعة ومفصلة عن الدول التى رغبت الدول الغربية فى استعمارها والاستيلاء على ثرواتها وخيراتها .وقد اختلط الامر فى وقت من الاوقات بين المحتل والمستشرق فقد كان كثير من موظيفى الاحتلال على دراية بالشرق لغة وتاريخاً وسياسة واقتصاداً"(۲۳)

(ان مستشرقین نے اپنی تحقیقات کے ساتھ) مسلم ممالک کے متعلق بڑی وسیع اور تفصیلی معلومات فراہم کیں جس نے مغربی ممالک کو ان علاقوں کے خزانوں اور وسائل پر قبضہ اور غلبہ پانے پر انگیخت کیا اور کئی دفعہ تو یوں ہوا کہ یہ قبضہ کرنے والے اور مستشرق ایک ہی نظر آئے، استعمار کے بہت سے وظیفہ خور وہ تھے جو مشرق کی زبان، تاریخ، سیاست اور معیشت کا اچھا علم رکھتے تھے۔

فرانس میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کا ایک ادارہ ء میں قائم کیا گیا اس ادارے کی اوّلین تحقیقی سرگرمیاں مصر واہل مصر کے بارے میں مفصل مواد مرتب کرنا تھا۔ مستشرقین کی ایک جماعت (جو کہ متعدد میادین کے ماہرین پر مشتمل تھی) نے ۲۳ جلدوں میں ایک موسوعۃ تیار کر دیا جس سے مصر میں مہم جوئی کے لیے یورپی اقوام نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ فرانس میں قائم کیا گیا یہ ادارہ فرانسیسی فوج سے وابستہ تھا۔

ڈاکٹر احمد غراب استشراق کے استعمار ومسیحیت کے ساتھ گہرے تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ تعلق آج بھی قائم ہے اور مغربی حکومتیں سیاسی وجغرافیائی میدانوں میں منصوبہ سازی کے لیے مستشرقین سے مدد لیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"The history of Orientalism shows that it was closely connected with the needs and purpose of Colonialism and with Christian missionary. That connection remains, it has now become apart of the geo-political strategies of western governments and their intelligence services."(24)

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب نوآبادیاتی اقتدار کا خاتمہ ہونا شروع ہوا تو استعمار کو مختلف ملکوں میں اقتدار کو چھوڑنا پڑا تو اہل مغرب نے نئی تدبیر اختیار کی انہوں نے اپنے سفارت خانوں، قونصلیٹ اور ڈپلومیٹک مشنز (Diplomatic Missions) میں مستشرقین کو اہم نشستوں پر فائز کیا جنہوں نے استعماری غلبے سے آزاد ہونے والے ملکوں میں قائم ہونے والی حکومتوں کو عدم استحکام سے دوچار کیے رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

دور جدید میں مغربی قوتوں نے مشرقی دنیا میں اپنے اثر ونفوذ کو قائم رکھنے اور عالم مشرق (خصوصاً

اسلامی دنیا) کی جغرافیائی وسیاسی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ممالک میں مشرقی واسلامی علوم کے مراکز قائم کئے جن کی تحقیقات کو پیش نظر رکھ کر عالم مشرق کے بارے میں منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ڈاکٹر مازن تحریر کرتے ہیں ان امور میں سے جو مستشرقین کی عربی واسلامی تحقیقات کے سیاسی واستعماری اہداف کے ساتھ تعلق کو واضح کرتے ہیں ایک اہم بات یہ ہے کہ امریکہ کی کئی جامعات میں اسلامی وعربی علوم کے مراکز قائم کئے گئے ہیں کہ جنہیں امریکی سرکار مالی امداد دیتی ہے اور مسلسل کلی یا جزوی امداد سیاسی اہداف کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے جاری ہے اور ان اداروں میں کی گئی تحقیق کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ومما یوکد ارتباط الدراسات العربیة الاسلامیة بالاهداف السیاسیة الاحتلالیة ان الحکومة الامریکیة مَوَّلَتْ عددا من المراکز للدراسات العربیة الاسلامیة فی العدید من الجامعات الامریکیة، وما زالت تمول بعضها إما تمویلاً کاملًا او تمویلًا جزئیًا وفقا لمدی ارتباط الدراسة باهداف الحکومة الامریکیة وسیاستها''[۲۵]

مغربی ممالک کی جامعات میں قائم کئے گئے مراکز برائے مشرقی واسلامی علوم کی تحقیقات کے بعض گوشے بلاشبہ تعریف وتحسین کے مستحق ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان تحقیقات کے نتائج وآثار مشرق اور اسلام کی حقیقی ترجمانی نہیں کرتے۔ ڈاکٹر احمد غراب کے مطابق تحقیقی موضوعات کے انتخابات میں (خاص طور پر اسلام، تاریخ وتہذیب اسلام) مسلمان علماء کے مقابلے میں مرکزی حیثیت مسیحی اور یہودی علماء یا یا خداناشناس حضرات کو حاصل ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"In these centers Atheist, Christian and Jewish scholars have at least an equal usually greater authority than Muslims in the choice and framing of the topics for research in Islamic history and civilization and in the teaching of Islam."[26]

اقتصادی ومعاشی مقاصد

تحریک استشراق کا آغاز (جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے) تو اسلام کی روزافزوں ترقی کو روکنے کے لیے کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس کے مقاصد میں اضافہ ہوگیا۔اہل مغرب نے اپنے معاشی مفادات اور تجارتی معاملات کی برتری کے لیے عربی زبان اور اسلامی تہذیب وثقافت کا مطالعہ کیا۔انہوں نے مشرقی دنیا خاص طور پر اسلامی ممالک میں ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ان ممالک کے وسائل پر قبضہ کیا جائے، صنعتی دور میں داخل ہونے کے بعد مغرب نے مشرق کے خام مال کے ذخائر پر نظر

جمائی۔ بعض اہل علم کی رائے ہے کہ استشر اق کا اساسی ہدف اقتصادی میدان ہی تھا اور دین اور تبشیری مشن کو انہی اقتصادی اہداف کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر مازن لکھتے ہیں:

"وهناک من يرى ان الهدف الاقتصادي كان هو الاساس في الاستشراق وقد استغل الدين والتنصير لتحقيق الاهداف الاقتصادية"(۲۷)

مستشرقین اپنی تحقیقات کے ذریعے مشرق کے خزائن کی نشاندہی کرتے۔ اسی طرح انہوں نے استعداد و وسائل کے میادین میں امیر مشرقی اور اسلامی آبادیوں میں احساس کمتری کو عام کرنے کی سعی بلیغ کی۔ مشرقی دنیا پر مغرب کے علمی و فکری تفوق کی دھاک بٹھانے میں مستشرقین کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

تحریک استشر اق کے مذکورہ اہداف کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تحریک استشر اق اپنی بعض مثبت جہتوں کے باوجود بحیثیت مجموعی اسلام دشمنی کے جذبات سے سرشار ہے اور تحریک کی جملہ خدمات کو مدنظر رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی سرگرمیوں نے اسلام کی غیر حقیقی تصور کشی کی جس کی وجہ سے اسلام کے خلاف منافرت نے فروغ پایا اسی طرح اسلام کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے دیانت وصداقت کے اُصولوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام اور میادین اسلام سے متعلقہ جملہ استشر اقی تحقیقات کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے اور ان کی تسامحات کی نشاندہی کی جائے تا کہ اسلام اور متعلقات اسلام کا مطالعہ کرنے والا حقائق سے آشنا ہو۔

حوالہ جات

۱۔ ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، بیروت، دار صادر، ل۔ت، ص ۱۷۴

۲۔ مازن بن صلاح مطبقانی، الاستشراق، القاہرۃ، دار العلم والتحقیق، ل۔ت، ص ۳

۳۔ اصلاحی، شرف الدین، اسلام اور مستشرقین، اعظم گڑھ، دار المصنّفین، ۲۰۰۴ء، ۲/۴۸، ۵۰

4. Edward Said, Orientalism, New York, Vintage, 1979, P.1

۵۔ رامپوری، محمد یوسف، تحریک استشر اق، مجلّہ دار العلوم دیوبند، مارچ ۱۹۸۸، ص ۳۴، ۳۵

۶۔ علی بن ابراہیم النملہ، الاستشراق والدراسات لاسلامیۃ، مصادر المستشر قین ومصدر یتھم، الریاض: مکتبۃ التوبۃ، ۱۹۹۸ء، ص ۳۵

۷۔ احمد عبدالحمید غراب، رؤیۃ الاسلامیۃ للاستشراق، الریاض: دار الاصالۃ للثقافۃ والنشر والاعلام، ۱۹۸۸ء، ص ۷۔۸

۸۔ الازہری، محمد کرم شاہ ضیاء القرآن، لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ، ۶/۱۲۳

۹۔ مازن بن صلاح مطبقانی، الاستشراق، ص ۴

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ الازہری،محمد کرم شاہ ضیاءالقرآن،۱۲۶/۶

۱۲۔ مازن بن صلاح مطبقانی، الاستشراق،ص۴

۱۳۔ السباعی،الدکتورمحمد مصطفیٰ،الاستشراق والمستشر قون، بیروت،دارالوراق،ل۔ت،ص۱۷، ۱۸

۱۴۔ محمد احمد دیاب،الدکتور،اضواءعلی الاستشراق والمستشر قین،القاہرۃ: دارالمنار،۱۹۹۳ء،ص۱۳

۱۵۔ محمود حمدی زقزوق،الدکتور،الاستشراق والخلیفۃ الفکریہ للصراع الحضاری،القاہرۃ:۱۹۸۹ء،ص۳۲

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ خلیق احمد نظامی،اسلام اور مستشرقین،اعظم گڑھ،دارالمصنّفین،۲۰۰۴ء،۲/۱۱۔۲۷۔

۱۸۔ محمد اکرم چوہدری، ڈاکٹر،تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ،لاہور: پنجاب یونیورسٹی، مارچ ۲۰۰۲ء، ص۵۶۵۔۵۷۴

۱۹۔ السباعی،الدکتورمحمد مصطفیٰ،الاستشراق والمستشر قون،ص۳۰، ۳۱

۲۰۔ مازن بن صلاح مطبقانی،الاستشراق،ص۸

۲۱۔ ایضاً،ص۳۳

22. Maryam Jameelah, Islam and Orientalism,Lahore, Mohammad Yusuf Khan & & Sons, Second Edition, 1990. P.29

۲۳۔ مازن بن صلاح مطبقانی،الاستشراق،ص۹

24. Ahmad Ghorab, Dr. Subverting Islam, Kuala Lumpur, The Open Press, 1996. P.03

۲۵۔ مازن بن صلاح مطبقانی،الاستشراق،ص۱۰

26. Ahmad Ghorab, Dr. Subverting Islam, P.04

۲۷۔ مازن بن صلاح مطبقانی،الاستشراق،ص۹

اسلامی مکاتبِ فکر میں اتحاد کی صورت

قاری رمضان نجم باروی☆

Abstract:

"The human nature urges to live with the differences and unity. It is not possible to by uniform in every aspect. The differences without any logic deteriorate to social life and there is dire need to become unity in common interests. However it is possible to minimize the intensity of discrepency of any discipline. The dream of unity of Muslim Ummah may by achieved by good interpretation but by a sincere struggle and It is necessary to investigate the basis of unity there is no doubt in this openion that love with the Holy Prophet (ﷺ) provides strong basis of unity among the muslims."

Keywords: Islamic schools of thought, Combination point, People of the Book, Difference of opinion, Basics of Islam.

قوت فہم میں اختلاف کی وجہ سے فکر ونظر کا اختلاف ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی بھی صاحب فہم وتمیز کو نہ مجالِ انکار ہے نہ راہِ فرار۔ دوسری طرف اس اختلاف رائے کو کسی نقطۂ اتحاد کی طرف لے جانا بھی علامتِ سلامتی، ضمانت نجات اور دلیل فوز وفلاح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس اختلاف کو اتحاد میں بدلنے یا اختلاف کو باعثِ رحمت بنانے میں اخلاص وللّٰہیت کا ہونا بھی ایک نا قابل تر دید حقیقت و واقعیت ہے۔ ''اِنما الاعمالُ بالنیاتِ''[1] سے اسی اخلاص نیات کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔ اختلافِ نظر ممنوع بھی نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی، بیدار مغزی، قوتِ فکر، فکری جسارت، انسانی صلاحیت، حیوان ناطق کی انفرادیت اور جو ہر فطرت کی قابلیت کی نشانی ہے۔ اور بسا اوقات فکری اختلاف امت کے لیے باعث خیر ویُسر اور ذریعہ سہل ورحمت بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر خیر اُمت لوگوں کی زندگی کو پڑھیں،

☆ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

سمجھیں اور اُن میں غور کریں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ جن کی راہ، راہِ سنت قرار دی گئی ہے خود اُن میں بھی فروعی اختلاف موجود ہے، جو اس بات کی بین و نا قابل تردید دلیل ہے کہ ہر اختلاف نہ باعث فساد ہے اور نہ ہی وسیلۂ نفرت وعناد بلکہ اِن نفوسِ زکیہ وعادلہ کا اختلاف، یقیناً بعد کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنے کا سبب ہے ورنہ اِن لوگوں کے لیے ''**فعلیکم بسنتی وسنّة الخلفاء الراشدین**''[۲] اور ''**النجوم امنة للسماء فاذا ذهبت النجوم أتی السماء ما توعدون وانا امنة لاصحابی فاذا ذهبت انا اتی اصحابی ما یوعدون واصحابی امنة لأمتی فاذا ذهبت اصحابی أتی امتی ما یوعدون**''[۳] کے سیم وزر سے بھی زیادہ قیمتی کلمات زبانِ صداقت سے کبھی جاری نہ ہوتے۔ البتہ ایسا اختلاف یقیناً قبیح، مذموم اور مکروہ ہے جو آسانی کے بجائے امت کے لیے حیرانی و پریشانی بلکہ قتل وغارت گری تک کا ذریعہ بن جائے۔

قرآن حکیم نے اپنا پہلا پیغام ہی ایسا مضبوط، دائمی اور ابدی دیا ہے جو تمام مشکلات سے نکلنے، تمام خوبیوں سے آراستہ ہونے اور پوری دنیا کی ترقی، خیر، کامیابی، سہولت اور سربلندی سے ہمکنار ہونے کا ضامن ہے۔ آج تک جو ترقی ہوئی ہے، جو ہوگی، جو کامیابی ہوئی ہے یا ہوگی، جو معراج انسانیت کو نصیب ہوئی ہے یا ہوگی، تو یہ سب فیضان ہے ''**اقرأ باسم ربک الذی خلق**......''[۴] کا۔ اس کے ساتھ قرآن نے اپنی ابتدائی تعلیمات میں جو ایک کامیابی وکامرانی کا نسخہ دیا ہے وہ خالق ومخلوق کے ساتھ جڑے رہنے کا، یعنی حق کو تسلیم کر لینے کا ہے چاہے وہ حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو یا مخلوق کی طرف سے اور یہی حبل اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی دلیل ہے۔[۵] امت سازی کا مدار بھی اختلاف سے نکل کر وحدت و یگانگت کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لینے پر ہے۔ اور یہ یگانگت فکر ونظر میں ہے۔ جس پر عمل کا مدار ہے۔

قرآن اور صاحب قرآن ﷺ نے اپنی حکیمانہ طرزِ تدریس وتربیت سے زمانۂ جاہلیت کے اختلاف کو، جس کا ختم ہونا قریب ناممکن (Impossible) تھا ایسے مثالی اتحاد میں بدلا کہ اب تک اس جیسا اتحاد لاشیر سے شِیر (Milk) نکالنے کے مترادف ہے۔ آپ ﷺ نے ہلاکت خیز اختلاف کو رحمت آمیز اتحاد میں بدل کر رکھ دیا اور اسی مثالی اتحاد کو جس کا سرچشمہ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ پاک تھی، خود قرآن نے نعمت اللہ قرار دیا ہے۔[۶]

وہ لوگ جو ایک دوسرے کے خون سے اپنی سیرابی کا سامان کرتے تھے اب ایک دوسرے پر اپنا خون نچھاور کرنے کو اپنی کامیابی کا سامان سمجھنے لگے۔ یہ مثالی اخوت[۷] تاریخ انسانی میں ارض وسماء، لیل و نہار اور شمس وقمر تک نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ اور غور وخوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے رب سے تربیت پانے والی عظیم ذات ﷺ نے ان ابتدائی اسلام کے شیدائیوں کو ایک فکر اور ایک سوچ پر جمع فرمایا یعنی اتحادِ نظری کا بے مثال سبق سکھایا، تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد فرمودہ فرائض کے بعد

بہت سارے معاملات جو میری امت طے کرے گی اُن کی بنیاد اسی فکری و نظری یگانگت پر ہو، تو اُن کا اختلاف بھی فضول نہیں معقول اور قابل قبول ہوگا۔

حامل ختم نبوت ﷺ نے اپنی امت کو اتحاد کے ایسے اصول دیے ہیں کہ اُن کو اپنانے سے فروعی اختلافات کے باوصف اُمت متحد بھی رہ سکتی ہے۔لیکن امت میں کچھ ایسے لوگ دَر آئے ہیں جنہوں نے پیشوائی کا جھوٹا منصب سنبھال کر ایسے انفرادی نظریات پیش کیے ہیں اور اتحادِ مسلم کو ایسا پارہ پارہ کیا ہے کہ اب ان بکھرے موتیوں کو چننا اور پھر ایک لڑی میں پرونا بہت مشکل لگ رہا ہے لیکن بہر حال یہ کام کرنے کے بغیر بھی چارۂ کار نہیں ہے۔اور حقیقت امر یہ ہے کہ ایک ایسا گروہ وحدتِ مسلم کو ختم کرنے کے درپئے ہے جو شروع دن سے ہی اپنے کام پہ لگا ہوا ہے اور نسل در نسل چل رہا ہے۔ جب تک اس قدیمی دشمن کو ہمارے اربابِ حل وعقد پہچان کر اُس پہ کڑی نظر نہیں رکھیں گے اتنی دیر تک اس فتنے سے نقصان اُٹھاتے رہیں گے۔

ہمارے اسلاف میں بھی فروعی اختلاف رہا ہے لیکن کبھی کسی نے اپنی علمی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھا بلکہ دوسرے کی تحقیق کے حق ہونے کے امکان کو بھی مدنظر رکھا ہے جس کی وجہ سے دلوں میں کدورتیں، بُعدِ قلوب اور ہتک آمیز رویے (Behaviours) جیسی برائیاں کبھی پیدا نہیں ہوئیں۔آج ہم اُنہیں کی اقتداء اور غلامی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہمارے درمیان اس قدر اختلاف ہے کہ ہم عملاً اسلاف کے پیروکار نہیں رہے۔ہم نے دوسرے نظریے کے لوگوں کو دوسری دنیا کے افراد سمجھ کر نفرتوں کا ایسا خالص بیج دلوں میں بودیا ہے کہ اب اس کی فصل تیار ہوگئی ہے۔اور پھر اسی بیج کو نسل در نسل نہ صرف آگے منتقل کیا جارہا ہے بلکہ اس کی کئی اقسام (Varieties) ایجاد کر لی گئی ہیں۔فروعی اختلافات کو ہم نے مستقل مذہب کی بنیاد بنالیا ہے اور ظلم کی انتہا یہ ہے کہ یہ سب کچھ ثواب سمجھ کر کیا جارہا ہے۔فضولیت کو معقولیت کا نام دے دیا گیا ہے اور معیارِ عقل وخرد کو ہی بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ قلوب واذہان کی کج سمتی کو راہِ راست سے ہمکنار کرے۔

نقطۂ اتحاد

اسلامی مکاتب فکر میں جس چیز نے اختلاف میں شدت اور حِدت پیدا کی ہے وہ ہے پیشوایانِ مذہب اور واجب التعظیم شخصیات کے بارے غیر مناسب، نامعقول، غیر محتاط اور تحریر وتقریر میں غیر سنجیدہ بلکہ بازاری اور غیر معتدل جملوں کا ناموزوں لہجے میں استعمال۔ایک قلمکار نیک نیتی کے باوجود مفہومِ بد کو متضمن جملے لکھ بیٹھتا ہے۔لیکن جب دوسرا دانش ور اسے ناقدانہ نظر سے دیکھتا ہے تو اُسے یہ جملے کفر نہیں تو قریب کفر ضرور نظر آتے ہیں۔اور چونکہ ہمارے ہاں کبھی بھی تقریر وتحریر کے قانونی واخلاقی ضابطے رائج نہیں رہے اس لیے دوسرا ناقد شخص اس کا حل صرف یہ کرتا ہے کہ اصل مجرم کو اطلاعِ جرم

دینے، اس کی اصلاح کرنے اور سمجھانے کے بجائے اُس کے جواب میں ایک ایسی کتاب لکھ مارتا ہے کہ جوتلوار سے زیادہ تیز زخم لگاتی ہے۔ اُس میں موصوف کی ذات سے لے کر ہر ہر صفت، عمل اور کردار کو ایسا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ انسانیت کے دائرے سے نکال کر حیوان غیر ناطق کے بدترین افراد میں شمار کرتا ہے۔

اب اس کے جواب الجواب کے طور پر پہلی شخصیت بجائے اپنی عبارت پر نظر ثانی کرنے کے ''جو چند جملوں یا چند سطروں پر مشتمل ہوتی ہے'' ایسی وضاحتی ضخیم کتاب لکھنا ضروری سمجھتا ہے جس کی زبان کم از کم مخالف کی زبان کو چیلنج کرتی ہو۔ جب یہ دونوں طرف کی کتب بازار میں آ کر بازاری بن جاتی ہیں اور اُن کی قیمت لگنا شروع ہوتی ہے تو اس طرح گویا گھر بیٹھے بٹھائے ملازمت مل جاتی ہے۔ صرف ایک سطر کے بدلے پوری امت میں اضطراب واضطرار اور اختلاف وانتشار پھیلانے کی قیمت وصول کر لی جاتی ہے اور آخرت میں بلا حساب بخشے جانے کی امید اس کے علاوہ ہوتی ہے۔

دشمن نے تو صدیوں سے اربوں ڈالرز خرچ کر کے وہ مقصد حاصل نہ کیا تھا جو اُسے چند ٹکوں کے بدلے، چند دنوں میں مل گیا اور اس طرح ایک خود کار مشین تیار ہوگئی جس کا کام یہ ہے کہ اس کے ذریعے مسلمان کو مشرک، کافر، بدعتی اور گستاخِ رسول ثابت کرنے والے پرزے اور آلات گویا رات دن تیار ہو رہے ہیں۔ اس طرح کافر کو مسلمان بنانے کا عمل ختم ہوا اور مسلمان کو کافر بنانے کا عمل شروع ہو گیا۔

تاریخ کو کھنگالنے کی زحمت گوارہ کی جائے تو نام نہاد مسلم فکر کے پیچھے وہی تحریک کارفرما ہے جس نے قرنِ اوّل ہی سے ایمان کی بنیادوں کو کمزور اور کھوکھلا کرنے کے لیے بہت سوچ وبچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُن کی تحریک کی بنیاد صرف اس پہ ہوگی کہ:

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد (ﷺ) اس کے بدن سے نکال دو![۸]

تحریک منافقین جس کا نام بعد میں تحریک استشراق (Orientalism) رکھا گیا، اُس کا ہر رکن (Worker) چاہے یہودی ہو یا عیسائی، اس کی فکر کج کا رُخ ذاتِ مصطفیٰ کریم ﷺ ہی کی طرف ہے۔ اور اُس کی یہ کوشش ہے کہ ایمان وعمل کی مضبوطی کی بنیاد یعنی محبت وعشق مصطفیٰ ﷺ کو ختم کرنے کے لیے اس ذاتِ پاک کی عظمت وشان کو متنازع، مختلف فیہ بنا کر آپ ﷺ کو عرش کی بلندیوں سے اُتار کر سطحِ زمین پر لا کھڑا کیا جائے تو محبتیں کم ہو جائیں گی کیونکہ محبت، حسن وجمال، عظمت شان، انفرادیت وامتیاز اور کمالِ صورت وسیرت کی متقاضی ہے۔ جب ان چیزوں کی نفی ہوگی تو محبت بھی شباب کھو بیٹھے گی۔

لیکن مرکز ومحورِ ایمان جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے استشراقی دشمنوں کو مفکرین اسلام اور غلامانِ رسولِ کریم ﷺ نے ہر رنگ، ہر روپ میں پہچان کر اُن کے خود ساختہ علمی وفکری حجابات کو اتار کر، حقیقی جہالت وسفالت کو خوب واضح کر دیا ہے۔ اور ہنوز اپنا فرض منصبی نبھا رہے ہیں۔

تحریک استشراق نے ہمیشہ مختلف طریقوں سے تنقیص رسالت کے لیے تقریر وتحریر کے

ذریعے اپنے باطنی خبث کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے عیسائی تحریک ''شہداء'' جو قرطبہ سے شروع ہوئی تھی[۹] نے ایک نیا رُخ اختیار کیا ہے اور شانِ سیّدالانبیاء ﷺ میں توہین آمیز خاکوں، فلموں اور دوسرے ذرائع سے گستاخی و بے ادبی کر کے پوری امت کو چیلنج کر دیا ہے اور عیسائی حکومتیں اپنے زیر اثر، نفرتوں کی تشہیر کرنے والوں کی وکیل صفائی بن کر آزادیٔ اظہار کے نام پہ اُن کی ہر طرح سے مدد کر رہی ہیں اور اس طرح دنیا بھر کے امن و امان کو تہہ و بالا اور پائمال کر کے اپنے نیو ورلڈ آرڈر (New Word Order) کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔

جبکہ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ''**ورفعنا لک ذکرک**''[۱۰] کے وعدے کی تکمیل کے لیے کائنات بھر میں اپنے محبوب ﷺ کے نام لیواؤں اور غلاموں کو ہزاروں باہمی اختلافات، فرقہ واریت اور بظاہر مذہبی قتل و غارت گری کے باوجود محبت نبی ﷺ کے مضبوط نقطہ پر جمع فرما کر عملاً امت مسلمہ کے ٹوٹے اور بکھرے دلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے جو ایک لحاظ سے فضل خداوندی ہے تو دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کا زندہ معجزہ بھی ہے کہ ایک طویل عرصہ سے ایک دوسرے کو گستاخی رسالت کا الزام دینے والے، شرک و بدعت کا طعنہ دینے والے اور باہمی عداوتیں، نفرتیں رکھنے والے کھلم کھلا یہ اعلان کر رہے ہیں کہ گستاخِ رسول چاہے کوئی ہو، اپنا یا بیگانہ، کافر ہو یا بظاہر مسلم، عالم ہو یا جاہل، واجب القتل ہے اور اُس کو قتل کرنے والا مسلمانوں کا ہیرو اور سروں کا تاج ہے۔ اس طرح حالات نے مسلمانوں کو اس نقطہ پر جمع ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علماء مل بیٹھیں اور باضابطہ اس مرکزی اور مضبوط بنیاد پر ہمیشہ جمع رہنے کے کچھ اصول و ضوابط طے کریں، اور ایسے اصول متعین کیے جائیں کہ جن کی روشنی میں، انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ عظام، اہل بیت اطہار اور اولیاء کاملین کے بارے میں کسی بھی گفتگو کو پرکھا جا سکے کہ وہ ادب کے دائرے میں ہے یا ادب سے عاری ہے۔ یہ وقت کا شدید تقاضا اور ضرورت ہے۔ اگر آج ایسا نہ کیا گیا تو یہ بڑی بدقسمتی ہوگی۔ دوسری طرف یہ اصول و ضوابط اپنی اپنی حکومتوں سے بھی منظور کرائیں اور حکومتوں کو مجبور کریں کہ وہ ان اصول و ضوابط کو اقوام متحدہ سے بھرپور تحریک کے ذریعے تسلیم کرائیں، بصورت دیگر UNO کے اجلاسوں کا بائیکاٹ کریں۔ اس کے ساتھ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام یہ فیصلہ کریں کہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں محبت و عشق رسول ﷺ کو ترجیحی بنیادوں پر بیان کریں بلکہ اس سال کو محبت رسول ﷺ کے فروغ کا سال قرار دیں، اور اس طرح اہانت و گستاخی رسالت کے عالمی و مہلک مرض کا علاج بالمحبت کریں۔ اس طریق سے پوری مسلم دنیا میں ایمان و ایقان کی ایک نئی تازہ اور ولولہ انگیز لہر پیدا ہوگی جو کئی غازی علم الدین شہید اور غازی ممتاز حسین قادری پیدا کرے گی جو تحریک استشراق کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں گے۔

اتحادِ امت اور اتفاقِ مسلم کا اس سے زیادہ منفرد و ممتاز اور مضبوط و مرکزی نقطۂ اساس نہیں ہو

سکتا جو جذباتیت وولولہ انگیزی سے بھرپور ہو۔

اس کے علاوہ اتحادِ عملی کے لیے جن بنیادی اُمور کی ضرورت ہے اُن کے سلسلے میں چند تجاویز ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں۔

اخلاص

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اتفاق ہو یا اختلاف، اگر اُس میں اخلاص کی دولت ہے تو وہ بابرکت، غیر ضرار اور باعث رحمت ورأفت ہے۔ اگر اختلاف میں بھی اخلاص کا عنصر (Element) شامل ہو تو وہ یا تو جلد اتفاقی صورت حاصل کر کے ختم ہو جاتا ہے یا کم ہو کر ہمیشہ کے لیے فتنے اور فساد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسلاف کے اختلاف کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اصل خرابی عدم اخلاص کی وجہ سے جنم لیتی ہے اور لفظوں کا اختلاف دلوں کی نفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حضور انور ﷺ نے فرمایا: ''**لا تختلفُوا فتخلف قلُوبكم**''[11]

اور دوسری جگہ فرمایا: ''**لا تختلفُوا فإن من قبلكم اختلفُوا فهلكُمْ**''[12]

ان احادیث کا مصداق وہ اختلاف ہے جو اختلافِ قلوب کا ذریعہ بن کر ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ہو۔

معاہدات نبویہ کی اشاعت

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بلکہ مشرکین کے ساتھ حضور ﷺ نے منفعت و اشاعت دین کے لیے دُور رس نتائج کے حامل معاہدات فرمائے ہیں اور اُن کا نتیجہ بھی جلد یا بدیر سامنے آیا ہے۔ بوقت معاہدہ بظاہر کڑی شرائط قبول کر لینے پر حضرت عمرؓ جیسے دُور اندیش مخلص صحابی کو بھی اضطراب تھا اور بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اہل شرک کے ساتھ ''جو معاہدے میں جناب فخر رسالت ﷺ کے نام گرامی کے ساتھ لفظ رسول اللہ (ﷺ) کا لکھنا تک گوارہ نہیں کر سکتے'' اُن کی پسند کی شرائط کے ساتھ معاہدہ کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ یہی معاہدہ ترویج دین کے سلسلے میں ثابت ہوا۔

اگر ان معاہدات کی اشاعت کو توضیحی اور تشریحی نکات کے ساتھ شائع کیا جائے اور یہ درس دیا جائے کہ جب مشرکین کے ساتھ معاہدات کر کے تلوار کو نیام میں رکھا جا سکتا ہے تو مسلم مکاتب فکر کے مابین مصلحت دین کے لیے معاہدۂ عدم جارحیت (No War Pact) کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر معاہدات نبویہ کو اس انداز سے نصابِ تعلیم میں شامل کیا جائے تو نئی نسل (New Generation) ایسے ماحول میں تربیت پائے گی کہ کچھ ہی عرصے کے بعد حالات میں خود بخود اعتدال روی پیدا ہو جائے گی۔ اس طریق سے سنت نبویہ کا احیاء بھی ہے، تبلیغ و اشاعت دین کا کام جو پوری قوت سے نہیں ہو رہا اُس میں بھی زور پیدا ہوگا اور برکاتِ اسلام ہر سرخ وسفید تک پہنچانے میں بھی آسانی پیدا ہوگی۔

اتفاق کی منظّم کوشش

اگر یہ کہا جائے کہ آج تک کوئی سنجیدہ کوشش اور سعی اتحادِ امت کے لیے نہیں کی گئی تو بجا ہوگا۔ ہمارے ہاں مناظر اہل سنت، مناظر اہل حدیث، مناظر دیوبند اور مناظر اہل تشیع تو پیدا ہوئے ہیں لیکن ایسے لوگوں کے ناموں سے چند سطریں بھی نہیں لکھی جا سکتیں جو مناظر عیسائیت، مناظر یہودیت اور مناظر ہندومت بلکہ جو مصلح امت، داعی تبلیغ دین اور مفکر اسلام کے حاملین حضرات کے ناموں پر مشتمل ہوں۔

اب تک ایسے مناظرے ہو رہے ہیں جن کا مناظرے کے مقاصد کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ فضول اور بے مقصد مباحث کو جو مجادلہ و مکابرہ (۱۳) کی تعریف کے ذیل میں آتے ہیں، مناظرہ کا نام دے دیا۔ ان مناظرانہ تقریروں اور تحریروں سے اختلاف میں تشدد کی راہ ہموار ہوئی ہے کیونکہ ان مباحث کا مقصد احقاق حق اور ابطالِ باطل ہرگز نہیں ہوتا، صرف فریق مخالف کو لاجواب کرنے کی کوشش ہوتا ہے۔ ایک طرف تو تشہیر اختلاف کی یہ صورت ہے تو دوسری طرف اتفاقِ امت کی باقاعدہ، منظّم اور مخلصانہ کوشش نہیں کی گئی۔ آج تک شاید ہی کوئی ایسی مجلس یا نشست ہوئی ہو جس کا مقصد اتحادِ امت پہ غور کرنا، اختلافات کو اعتدال پر لانا یا اُن کو ختم کرنا ہو۔ یہ بات اعتماد و وثوق سے کی جا سکتی ہے کہ اگر ہر مکتبۂ فکر کے جید علماء اخلاص کے ساتھ مل بیٹھیں اور اتحادِ مکاتب کے موضوع پر غور و خوض فرمائیں، اختلاف میں اعتدال کی راہ تلاش کریں تو یقیناً ایسی سبیل ضرور نکلے گی جو مختلف مسالک فکر کو مشترکات پر جمع کر دے گی اور اختلافات میں بھی خلیج کو ختم کر کے تشدد کے جواز کو بے جواز بنا دے گی۔ اگر اختلاف کو ہوا دینے والے ہزاروں ہوں اور اتفاق کی راہ تلاش کرنے والا کوئی بھی نہ ہو تو بلا چراغ اندھیرے میں چلنے سے جہات مختلف تو ہو سکتی ہیں راہ نوردانِ حقیقت کو کسی ایک جہت پر جمع ہونا نصیب نہیں ہو سکتا۔

کچھ عرصہ پہلے مذہبی منافرت عروج پر تھی۔ مسجد و مدرسہ اور امام بارگاہ سے لے کر گلی کوچے تک اس نفرت کے اثراتِ بد، ہلاکت و بربادی کا باعث بنے ہوئے تھے لیکن اللہ بھلا کرے مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم کا جنہوں نے ملی یک جہتی کونسل اور اُس کے بعد متحدہ مجلس عمل کی صورت میں تمام مذہبی و دینی سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے اس مذہبی منافرت و شدتِ اختلاف کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ اس تجربے سے بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اگر خود علماء اور مذہبی جماعتیں اس مقصد نیک کے لیے کوشاں ہوں تو منزل کو قریب سے قریب تر لا سکتے ہیں۔

حسن ظن

اس بات سے مفر نہیں ہے کہ بہت ساری غیر مسلم ایجنسیاں پاکستان میں بالخصوص اور دیگر مسلم ممالک میں بالعموم قتل و غارت گری اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث پائی گئی ہیں بلکہ پچانوے فیصد (۹۵٪) دہشت گردی کے واقعات میں انہیں خفیہ ہاتھوں کی ہلاکت خیز کارروائی کا تعلق ہوتا ہے

لیکن ذمہ داری مذہبی تنظیموں پر ڈال دی جاتی ہے۔ اگر ایسے موقع پر متاثر فریق عقل وفراست اور صبر و استقامت نیز دُور اندیشی سے کام لے کر ان حوادث کی ذمہ داری غیر مسلم خفیہ ایجنسیوں پر ڈال دے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد مذہبی دہشت گردی کا عفریت اپنی بل میں واپس چلا جائے گا۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ موجودہ دہشت گردی کے پیچھے اُنہیں طاقتوں کا ہاتھ ہے جو بظاہر دہشت گردی کے خلاف مجاہدانہ کردار ادا کرتے ہوئے مجاہدین کو تہہ تیغ کر رہی ہیں۔ بہر حال پاکستانی قوم کو خصوصاً اور پوری امت کو عموماً ایسے نازل مواقع پر کسی بھی مسلم کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے اُس کے ساتھ حُسن ظن کا اظہار کرتے ہوئے دشمن کی کارروائی کا رُخ دشمن ہی کی طرف پھیر دینا چاہیے۔

اپنی بات کو حرفِ آخر نہ سمجھا جائے

ہمیشہ اختلاف ظنیات میں ہوتا ہے قطعیات میں نہیں ہوتا۔ اور ظنیات میں کوئی بھی حل یقینی نہیں ہوتا ظنی ہوتا ہے اور اس کی صحت اگر چہ راجح ہوتی ہے لیکن مرجوح جانب کی صحت کا امکان واحتمال بھی ہوتا ہے۔ مجتہد ومُستنبط، خاطی بھی ہوسکتا ہے اور مصیب بھی لیکن اخلاص سے حل مسئلہ میں جد و جہد فرمانے والا کبھی اجر سے محروم نہیں ہوتا جیسا کہ حدیث پاک اس پر شاہد ہے:

''اذا حکم الحاکمُ فاجتھدَ فاصابَ فله' اجرانِ و اذا حکم فاجتھدا خطأً فله' اجرٌ ثم اخطاء''(۱۴)

ہمارے اکابر یعنی صحابہ کرام علیہم الرضوان اور اُن کے بعد مجتہدین کا طرزِ فکر وعمل یہی رہا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کو صحیح اور دوسرے مخالف نقطۂ نظر کو غیر صواب سمجھتے تھے لیکن اپنی تحقیق میں غلطی اور دوسرے مجتہد کی تحقیق میں صحت کے امکان کو بھی رد نہیں فرماتے تھے۔ آج ہم بھی مسلکی اختلافات میں یہی روش اپنائیں تو اعتدال سے کبھی عدول نہیں ہوگا۔ ظنیات میں اپنی تحقیق کو حرفِ آخر سمجھنا، اُسے قطعیات و یقینیات میں داخل کرنے کے مترادف ہے اور یہ راہِ اعتدال نہیں راہِ حق سے عدول ہے۔

دو مختلف نظریات کا قابل قبول ہونا

بعض مسائل میں اختلاف صرف افضلیت واوّلیت پر ہوتا ہے۔ ایسے اختلاف کو شد و مد سے بیان کرنے اور صرف اپنے ہی نظریے کو بیان کرنے کے بجائے دونوں نقطہ ہائے نظر کی صحت کو بیان کیا جائے اور افضلیت پر دلائل دینے کے بعد یہ کہہ دیا جائے کہ میری یا میرے اسلاف کی تحقیق یہی ہے ''واللہ ورسولہ اعلم'' تو بہت سارے مسائل اختلافی ہونے کے باوجود کدورتوں کے ماحول سے دُور رہیں گے۔

یہ تو افضلیت کی بات ہے، اگر کسی ایک مسئلہ میں اختلاف ہو اور اُن میں سے صرف ایک ہی نظریہ حقیقتاً صحیح ہو، لیکن جانبین نے اخلاص ولِلّٰہیت سے اجتہاد کیا ہو تو وہ دونوں نظریے اور اُن پر عمل خود شارع کو قابل قبول ہے۔ غزوۂ احزاب کا واقعہ اس پر گواہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''لا یُصلیّن

احدُ العصرَ إلا فی بنی قریظۃ''[١٥] کہ تم میں سے کوئی بھی نمازِ عصر بنو قریظہ تک پہنچنے سے پہلے ہرگز نہ پڑھے۔اب بعض صحابہ کرام علیہم الرضوان نے وقت عصر ہونے پر راستے میں نماز ادا فرمائی اور بعض نے وقت کا خیال نہ رکھا اور بنی قریظہ کے پاس پہنچ کر ہی نماز پڑھی۔اور پھر جب رسول اللہ ﷺ کو علم ہوا تو آپ نے کسی کو بھی نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہ فرمایا، حالانکہ اُن دونوں میں سے صحیح موقف ایک فریق کا تھا لیکن اُن دونوں نے اخلاص وصفاءِ قلب سے اجتہاد کیا اور اپنے اس اجتہاد کو درست سمجھتے ہوئے اس پر عمل کیا تو دونوں کا عمل قبول فرمایا گیا۔اس کا معنٰی یہ ہے کہ جب دو مجتہد کسی مسئلہ میں اجتہاد کرتے ہیں اُن میں سے ایک صواب پر دوسرا خطاً پر ہوتا ہے۔تو صواب پر ہونے والے کو دوگنا ثواب ملتا ہے اور خطاً پر ہونے والے کو صرف ایک نیکی کا ثواب ہوتا ہے۔لیکن اس جگہ وضاحت طلب امر یہ ہے کہ جو خاطی ہے اور اپنی خطاً پر مطلع نہیں ہوا، ساری زندگی اُس پر عمل پیرا رہا اُس کی اشاعت کی اور اُس کے متبعین بھی اُسی پر عمل کرتے رہے تو کیا قیامت کو وہ زیرِ عتاب وعقاب ہوگا؟ اُس کا عمل مردود ہوگا؟ کیا اُسے اس وجہ سے جہنم رسید کیا جائے گا؟ کیا اُس سے اس پر مؤاخذہ ہوگا؟ اس حدیث پاک اور دوسری احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس خاطی اور متبعین کا عمل قابل قبول ہوگا جس نے اخلاص سے اجتہاد کیا۔ بزعم خود اُس کا اجتہاد درست تھا لیکن حقیقت میں درست نہ تھا، اگرچہ افضلیت واولویت دوسرے فریق کو حاصل ہوگی لیکن عمل اس کا بھی رائیگاں نہ جائے گا۔

جب اللہ جل شانہٗ کی طرف سے یہ حکم ہے تو ہمارے پیشوایان کو بھی یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے اور قبولیت ومردودیت کا الٰہی حق تسلیم کرتے ہوئے اسے خود استعمال کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔اس سے اتحاد واتفاق کا راستہ ہموار کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔

انتخاب الفاظ

تقریر ہو یا تحریر ہمیں محتاط، منتخب، سنجیدہ اور متین الفاظ کے استعمال کو یقینی بنانا چاہیے کیونکہ اچھے یا بُرے اثرات الفاظ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔اور پھر بات کرنے کا لہجہ اور انداز بھی اس میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔تصنیف وتالیف اور تقریر وبیان میں چبھتے، نوکیلے، غصیلے اور زہر آلود الفاظ نے ہی ماحول میں بے چینی پیدا کی ہے۔مسلکی اختلافات کی پرورش، اٹھان اور تلخی انہیں سیف اثر الفاظ، نازیبا طرزِ تکلم اور شعلہ لسانی کا نتیجہ ہے۔میدان مناظرہ میں ''**ھل من مبارز**''؟ کی صدا ماحول کو گرم رکھنے میں اپنا منطقی کردار ادا کرتی ہے۔کون باخبر اس سے بے خبر ہے کہ ''**جراحاتُ السنانِ لھا التیام: ولا یلتامُ ما جرحَ اللسانُ**''[١٦] اس لیے ذمہ دار حضرات جن کی گفتگو ماحول میں ذرا سی بھی تبدیلی لا سکتی ہے، تقریر وتحریر میں جملوں کی نوک پلک سنوار کے کلام کو ایک عروسہ کی شکل میں سامعین کے سامنے پیش کریں تاکہ میٹھی گفتگو بھی سینے میں تیر بن کر نہ چبھے بلکہ کڑوی اور تلخ حقیقت بھی شِیر (دودھ) بن کر باطن میں اُتر کر

دل و دماغ کو مثبت انداز میں متاثر کرے۔

متنازع عبارات کا حذف

اگر پوری دیانتداری اور گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ چند عبارات ایسی ہیں جن کی وجہ سے مسالک میں کشیدگی اور کشمکش پائی جاتی ہے اور انہیں غیر محتاط عبارات کے اختلاف کی وجہ سے دوسرے اختلافی مسائل میں بھی شدت آ گئی ہے۔ ان عبارات کے لکھاری (Writers) اور اُن کے پیروکار (Followers) انہیں بنیادِ اسلام کا درجہ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کو حذف کر دیا گیا تو قصرِ دین دھڑام سے گر جائے گا اور تبدیل کرنے سے بھی گویا اسلام کی عمارت کھوکھلی سی لگے گی جبکہ دوسرا فریق ان کو کفرِ تمام کہتا ہے۔ طرفہ ظلم یہ ہے کہ ان عبارات کو جو چند سطروں پر مشتمل ہیں، حذف کرنا گوارہ نہیں کیا گیا اور اس کی تاویل میں کئی ضخیم کتب امت کے اتحاد سے کھیلنے کے لیے میدان میں اُتار دی گئی ہیں۔

اور اگر ان عبارات مختلفہ کو دیکھا جائے تو ان کی زد میں کوئی عام انسان، عالم، فقیہ اور مجتہد نہیں انبیاء کرام بلکہ امام الانبیاء علیہم السلام تک آتے ہیں۔ کوئی غیر جانبدار بھی ان عبارات کو پڑھے تو اُس کا کلیجہ منہ کو آئے گا کہ ایک طرف تو ان ذواتِ قدسیہ پر مر مٹنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، ناموس کے تحفظ کی تحریکیں چلائی جاتی ہیں، جن کی ہلکی سی بے ادبی کو بدترین کفر اور بے ادب کو نا قابل معافی مجرم قرار دیا جاتا ہے مگر دوسری طرف اپنے ہی بزرگوں سے سرزد ہونے والے غیر محتاط الفاظ کو قرآن کا درجہ دے کر بہر صورت ہو بہو رکھنے اور اُنہیں صدقِ کُل ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کا عزم صمیم کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک طرف اپنے نبی کو ایک عامی انسان تو دوسری طرف اس عبارت کے موجد کو منصب نبوت کے برابر لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ یہ کس قدر افسوس ناک پہلو ہے۔

اس لیے اگر اِن چند عباراتِ مختلفہ کو کتب سے نکال دیا جائے تو جہاں ان نفوس طیبہ کے ساتھ ایمانی وابستگی مضبوط ہو گی وہاں اس کی برکت سے اتحادِ امت کی راہ بھی ہموار ہو گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان عبارات مختلفہ قبیحہ کو حذف کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ ہم کسی شخصیت کو اس کی علمیت اور دنیوی یا خونی رشتے کی بنیاد پر نہیں مانتے۔ ہم کسی کو صرف اُسی صورت میں مانتے ہیں کہ جب وہ منصب رسالت و نبوت اور مقام محبوبیت الٰہیہ کے ادب واحترام، تعظیم و توقیر اور تحریم و تکریم کے ہر تقاضے کو پورا کرنا اپنے ایمان کی روح (Spirit) سمجھتا ہو۔

بالمشافہ بحث

کوئی ایسی بات جو کسی تصنیف، تالیف یا خطبے میں آ جائے اور دوسرے صاحب علم و دانش کے نزدیک درست نہ ہو تو اس کا صرف یہ حل نہیں ہے کہ اُس کے خلاف اسی جیسی کتاب لکھ کر منظر عام پر لائی جائے یا اُسی جیسا عوامی اجتماع کر کے اُس کا جواب شعلہ لسانی سے دیا جائے۔ اس سے کبھی بھی نظریات کو

درست سمت نہیں ملی اور نہ مل سکتی ہے۔ یہ طریقہ اصلاحی نہیں، فسادی ہے۔ ایسے طریقے سے کوئی آج تک کسی کو قائل نہیں کر سکا۔

اس صورت حال کا مفید اور مثبت طریقہ یہ ہے کہ جس صاحب سے اختلاف ہے اس سے بالمشافہ اور انفرادی (One to One) ملاقات کر کے مختلف فیہا مسئلہ پر تبادلۂ دلائل کیا جائے اور زبان محبت کی استعمال کی جائے، الفاظ کو سنجیدہ رکھا جائے اور دلائل کا اخلاص و دیانتداری سے جائزہ لیا جائے اور جو حل حقیقت پر مبنی ہو اُس کو خندہ جبین سے قبول کرنے میں عار نہ محسوس کی جائے۔ اگر ایک ملاقات میں کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو تو یہ ملاقاتوں کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک کسی نقطہ پر اتفاق نہ ہو جائے۔ لیکن یہ ساری کوشش حق کو پانے کی ہو صرف دوسرے کو منانے کی نہ ہو۔

اس دوران کسی دوسرے فرد کو مطلع کرنا، بحث کو ریکارڈ کرنا، اپنی فوقیت اور دوسرے کے ضعف کا اعلان کرنا، یہ ساری چیزیں عدم اخلاص، بددیانتی اور محض اپنی شہرت کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں رکھتیں۔ اس لیے ان امور سے بچ کر صرف اللہ تعالیٰ اور اُس کے کراماً کاتبین کے ریکارڈ پر بھروسہ کرتے ہوئے، اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا ہی دارین میں حصولِ سعادت کا ذریعہ سمجھا جائے۔

فریق مخالف کے نظریے کی تحقیق

سنی سنائی بات پر اختلاف کی بنیاد رکھنا ظلم اور حق سے بغاوت کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ ہر سُنی سنائی بات کو (بلا تحقیق آگے) بیان کر دے۔''(۱۷) ہمارے ہاں بہت سارے اختلافات کی بنیاد ایسے مسائل پر ہے جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ آج کل موبائل ایس ایم ایس (SMS) کے ذریعے ایسے ایسے شوشے چھوڑے جاتے ہیں کہ اُن کا حقیقت سے نہ قریب کا تعلق ہوتا ہے نہ دُور کا۔

اگر ایسے ذرائع سے ملنے والی خبروں پر اعتماد ہو تو پھر اختلاف کے سوا معاشرے میں کیا بچے گا۔ اس لیے اگر اختلافی نظریات کا پوری دیانتداری سے جائزہ لیا جائے تو اختلافی مسائل کی فہرست میں اختصار آ سکتا ہے۔ لیکن نفسانیت و ہوائے نفس تو صرف دوسرے مسلک سے عوام کو متنفر کرنے کے عمل کو ایسا مزین و آراستہ کر کے پیش کرتی ہے کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ اشاعت نفرت کے لیے کذب بیانی کو بھی جواز کے فتوے تحفظ فراہم کرتے ہوں تو اس عمل کو نہ معلوم کس چیز کا نام دیا جائے گا لیکن بہر حال عملاً ایسا ہی ہو رہا ہے۔

کسی مسلک کا مختلف فیہا مسئلہ

کبھی ایک مسئلہ کسی مسلک کے علماء میں ہی مختلف فیہا اور متنازعہ ہوتا ہے تو اسے فریق مخالف پورے مسلک کی طرف منسوب نہ کرے بلکہ اسے صرف اسی عالم کا نظریہ قرار دے جس نے اُسے پیش کیا

ہے۔اس طرح کرنے سے کئی مسائل سے اختلاف کا حجاب اُٹھ جائے گا۔مثلاً اہل اللہ کی قبور کو بوسہ دینا اہل سنت بریلوی کے علماء میں ہی مختلف فیھا ہے۔بعض اس کے جواز کے قائل ہیں اور بعض عدم جواز کے۔(۱۸)

ایسے ہی دیو بند مکتبہ فکر کے علماء میں بعض بعداز وصال حیات النبی ﷺ کے قائل ہیں اور بعض مخالف۔قائلین کو حیاتی اور منکرین کو مماتی کہا جاتا ہے۔

الزام کے عدم قبول کی صورت میں محتاط رویے کی ضرورت

اگر ایک مسلک کوئی الزام قبول نہ کرے تو دوسرا بہرصورت اُس کے سر تھوپنے کی کوشش نہ کرے۔اس سے آہستہ آہستہ اختلافی مسئلہ ختم ہو جاتا ہے اور اگر الزام کو زبردستی ثابت کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے تو دوسرا فریق بھی مجبوراً اُسے قبول کر کے جواب دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔اس طرح خواہ مخواہ فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔یہاں پر ایک شبہ سر اُٹھا سکتا ہے کہ ایک بات کسی مکتبۂ فکر کے بانی مفکرین کی کتب میں موجود ہوتی ہے لیکن اُس کے متبعین اُس کی تاویلات کرتے ہیں اور اُس سے ظاہراً اخذ ہونے والے مفہوم کو اپنا نظریہ قرار نہیں دیتے ،تو اس کا کیا کیا جائے؟

اس کا سیدھا سادہ حل یہ ہے کہ ایسی صورت میں اُس کا معنٰی یہ سمجھ لیا جائے کہ اس مکتبۂ فکر نے متنازع نظریہ یا عبارت سے رجوع کر لیا ہے۔اگرچہ رجوع کی کئی صورتیں ہیں جن کی تقسیم مسئلہ اور اُس کے اظہار کی نوعیت کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے''الضرورات تبیح المحظوراتِ''(۱۹) کے پیشِ نظر اس عملی صورت کو قبول کر کے اتحادِ امت کے وسیع تر مفاد کے اہم مقصد کے حصول کو قریب تر کر دیا جائے تو یہ عمل بہت ہی مناسب ہوگا۔اور اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ نظریہ پورے مسلک کا نمائندہ نہیں ہے (تبھی تو اس کی تاویلات اور انکار کا راستہ اپنایا گیا ہے) تو بھی اختلاف کا دائرہ محدود ہو سکتا ہے۔لیکن بہتر طریقہ بہرحال یہی ہے کہ تحریراً ایسے نظریے سے برأت کا اظہار کر دیا جائے یا وہ مقامِ متنازع اصل کتاب کے بعد بریکٹ میں یہ لکھ دیا جائے کہ یہ عبارت مصنف کی طرف منسوب ہے اور متنازعہ ہے جسے اُس کے پیروکاروں یا متاخرین نے قبول نہیں کیا اس لیے اس جگہ یہ ترمیم کی جاتی ہے اور اس کے بعد صحیح عبارت لکھ کر اختلاف کو''کفنا دفنا'' دیا جائے۔یہ وقت کی سخت ضرورت ہے۔

جہلاء کے عمل کو مسلک کا نام نہ دیا جائے

کسی بھی مسلک کی کمزوریوں کو تلاش کرنے کی تگ ودو میں رہنا تاکہ مخالفت کی آگ کو روشن کر کے پوری امت کو اس میں جھلسایا جائے،اس کے لیے جہلاء کے عمل کو بھی بنیاد بنا کر فریق مخالف کو بھرے مجمع میں للکارنا اور اپنی تصانیف میں اس پر زہریلے جملے کسنا،حق کا خون بھی ہے اور فساد وفتنہ کی اشاعت کا جنون بھی۔جہلاء تو کالانعام ہوتے ہیں چاہے جس بھی مسلک سے ہوں۔اُن کا کوئی بھی

مسلک نہیں ہوتا، یہ لامسلک ہوتے ہیں بلکہ جہالت ہی اِن کا مسلک ہوتا ہے۔اس لیے جہلاء کے کسی عمل کو بنیاد بنا کر اپنی پیاس بجھانا نہیں چاہیے۔

اس عملی بے رہروی کا الزام کسی دوسرے مسلک پر لگا کر خود بے راہرو ہونے کے بجائے عوام کا اعتقادی وعملی قبلہ صحیح کرنے کی مخلصانہ سعی کرنی چاہیے اور اُنہیں یہ بتانا چاہیے کہ اُن کا یہ عمل اُس عقیدہ میں بھی درست نہیں جس کے ساتھ اُنہیں وابستگی کا دعویٰ ہے۔لیکن ہمارے ماحول میں واعظین ''جو ہر طبقۂ فکر میں ہوتے ہیں'' زبردستی جہالت کو مسلک کا حصہ بنا کر ایک طرف تو دیانت کا خون کرتے ہیں دوسری طرف ایک اور اختلاف کا اختلافی فہرست میں اضافہ کرتے ہیں۔یہ اخلاص نہیں فکر کا افلاس ہے۔

عبادت گاہوں کا احترام

شریعت اسلامیہ میں حالت جنگ وحرب میں بھی عمارات کو گرانا اور گرجوں میں موجود ایسے غیر مسلموں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے جو عملاً جنگ میں شریک نہیں ہیں۔ایسے ہی بچوں، معذوروں اور عورتوں کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے۔[۲۰] تو سوال یہ ہے کہ حالت امن میں جنگ سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک اقدام کرتے ہوئے مساجد وامام بارگاہوں اور اہل اللہ کے مزارات وغیرہ کو گرانا جائز ہے؟ کیا یہ اسلامی تعلیمات کی مخالفت اور انتشار وافتراق کا باعث نہیں ہے؟ کیا اس پر ثواب ہے یا ہوگا! قرآن حکیم میں مساجد کے نظام عبادت میں خلل ڈالنا ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے:

''و من اظلمُ ممن منع مساجدَ اللّٰه ان یذکرَ فیھا اسمُہ و سعی فی خرابِھا''[۲۱]

لیکن نظریاتی و مذہبی اختلاف کو بنیاد بنا کر قتل و غارت گری، مساجد وامام بارگاہوں کا انہدام، عوامی عمارات کو نقصان پہنچانا اور ساتھ ساتھ ایسے افراد کا قتل جو عبادتِ الٰہی میں مصروف ہوں کس قدر بُرا اور قابل مذمت ہے۔اگر چہ ایسی کارروائیاں اکثر ہمارا دشمن ہی کرتا ہے لیکن اس کو اس کی بنیاد ہم خود فراہم کرتے ہیں اور راستہ بھی ہم خود صاف کرتے ہیں۔اسلامی تعلیمات دیکھیے کہ حالت جنگ میں بھی غیر مسلم کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور مذہبی راہنماؤں کو قتل کرنا ممنوع و مذموم ہے۔دوسری طرف مسلمان ملک میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں میں بچے، بوڑھے اور مذہبی راہنما اور نمازی قتل ہو جاتے ہیں، یہ کس قدر باعث تشویش ہے؟ کیا کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

تبادلۂ تحائف ونجی ملاقاتوں کا اہتمام

مختلف مسالک کے علماء باہم ملاقات اور سلام و دعا کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔اپنی خوشی وغمی کی تقریبات میں کسی دنیادار، راشی اور سود خور کو تو بلا لیتے ہیں لیکن پڑوس میں اگر دوسرے مکتبۂ فکر کا کوئی عالم دین رہتا ہو تو اُسے بلانا اپنے مسلک سے غداری کے مترادف خیال کرتے ہیں۔اور اگر کوئی بلانے کی

جسارت کر لے تو دوسرا فریق شرکت کو شرک کے مساوی سمجھ کر نہ جانا ہی باعث تقویت ایمان گردانتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تبادلۂ تحائف سے محبت ومودت میں اضافہ ہوتا ہے اور بہت سے اختلافات ختم ہوتے ہیں، اتفاق بڑھتا ہے۔

انٹرنیٹ (Inter Net) کا میدان جنگ

آج کل انٹرنیٹ کا استعمال بھی اختلافات کو ہوا دینے کے لیے اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ ہر مسلک دوسرے مسالک کے خلاف ایسے کلپز (Clips) دکھا رہا ہے کہ ایک طرف غیر مسلم، اسلام سے مزید متنفر ہو رہے ہیں اور دوسری طرف خود مسلمان تمام مسالک، مذہب، دین، علماء اور دینی مراکز کے بارے متزلزل ہو رہے ہیں۔ اس عمل سے مسلمانوں کی کیا اصلاح ہوگی، الٹا اسلام ایک کھیل اور مزاح بن کر رہ گیا ہے۔ غیر مسلم کو اسلام پر اعتراضات کرنے اور بدنام کرنے کا بہترین موقع مل گیا ہے۔ اس سے ترویج دین کے نام پر تخریب دین کے نہایت گھناؤنے اور شرم ناک فعل کا مسلسل ارتکاب ہو رہا ہے۔ اسلام دوستی کے نام پر اسلام دشمنی ہو رہی ہے۔ ہر گھر میں اسلام دشمنی کی تحریک کے اثراتِ بد ہمارے اپنے عمل سے پھیل رہے ہیں۔ ایک سازش کے تحت پہلے ہی علماء اور عوام کے درمیان دیوار حائل کر دی گئی ہے۔ جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ انہیں علماء کے ناعاقبت اندیش اور نادان پیروکار پوری کر رہے ہیں۔

اس لیے تمام مکاتب فکر کو مل بیٹھ کر اپنے اپنے مسالک کو بچانے کی فکر کے بجائے پورے اسلام کو بدنام ہونے سے بچانے کی فوری تدبیر کرنی چاہیے اور اس کے لیے ضابطۂ اخلاق وضع کرنا چاہیے۔

لادین عناصر کی سازش کا ادراک

دشمنانِ اسلام ہمیشہ سے اسلام کو کمزور کرنے کے لیے مختلف سازشیں کرتے رہے ہیں۔ ممالک اسلامیہ کو لڑانا، باہمی اختلافات کو ہوا دینا، خود قتل وغارت گری کر کے مذہبی جماعتوں کے سر تھوپنا اور اختلافی مسائل کو بیہودہ اور اشتعال انگیز الفاظ میں بیان کر کے فرضی ناموں سے شائع کرانا وغیرہ ان کے طریقے رہے ہیں۔ اس لیے مذہبی راہنماؤں کو ان عناصر کی تخریبی کارروائیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ذیل کا اقتباس خلاصۃً پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ دشمن کیسے منظم طریقے سے سازش کرتا ہے۔

> ''برنسکی نے ۳ جولائی ۱۹۷۹ء کو انکشاف کیا کہ جمی کارٹر نے اس مقصد (انتہا پسند رجحانات کو فروغ دینا) کے لیے پانچ صد (۵۰۰) ملین ڈالرز کا ایک خفیہ فنڈ منظور کیا اور اسے کانگریس سے بھی خفیہ رکھا گیا اور جان پلکر کے بقول اس فنڈ کا مقصد ایک ایسی عالمی دہشت گرد تحریک کا قیام عمل میں لانا تھا جو وسط ایشیا میں روسی حکومت کو ختم کرنے کے لیے اسلامی بنیاد پرستی کو فروغ دے۔''(۲۲)

اس سازش سے جو عقدے حل ہوئے ہیں، اس پر تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ دہشت گردی

کے لیے بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کو فروغ دینا، پھر اُس کے ذریعے دوہرے فوائد حاصل کرنا، مسلمانوں کو مسلمانوں سے مروانا، اپنے ایک دشمن کو دوسرے دشمن سے مروانا اور پھر اسی لڑائی کے بہانے دونوں کو مارنا وغیرہ۔ یہ سب کچھ پوری دنیا میں امریکہ اور اُس کے اتحادی کرا رہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمارے بعض ناعاقبت اندیش مفکرین انہیں کی ڈوری پہ ناچتے ہیں اور اپنے ہی خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں جس سے اس چالاک دشمن کو مزید کارروائی کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اس لیے ان سازشوں کا گہری نظر سے ادراک کرنا چاہیے۔

حکومتی پالیسی میں ترمیم کی ضرورت

جن اسلامی ممالک میں مساجد، مدارس یا مذہبی راہنماؤں پر حملے ہو رہے ہیں اُن میں عموماً مجرم پکڑے نہیں جاتے کیونکہ پولیس کو ان مجرموں کے سرپرستوں سے اپنی جان اور ملازمت کا خطرہ ہوتا ہے لیکن بعض کارروائیوں میں کچھ دہشت گردی کے مرتکب گرفتار ہو بھی جاتے ہیں اور ایسی صورتِ حال میں بھی نہ تو اُن کے کوائف سے عوام کو باخبر رکھا جاتا ہے اور نہ ہی اُن سے متعلقہ کارروائی سامنے لائی جاتی ہے، تاکہ اصل حقائق سامنے آئیں اور سب کو علم ہو کہ یہ لوگ کون تھے، ان کے پیچھے کون تھا اور کارروائی کے مقاصد کیا تھے؟ کتنے واقعات میں مذہبی عناصر ملوث تھے اور کتنے واقعات کے پیچھے ملک دشمن غیر ملکی ایجنسیاں خفیہ طور پر مکروہ مقاصد کے حصول میں سرگرم تھیں۔ اگر کسی مذہبی مقام یا شخصیت پر کوئی حملہ ہو جائے تو اُسے فرقہ واریت کے عفریت کا حملہ قرار دے کر دینی و مذہبی جماعتوں کے خلاف زہریلا پراپیگنڈہ شروع کر دیا جاتا ہے تاکہ اصل طاقت کے چہرے سے حجابِ ظلم نہ اترنے پائے۔

اس لیے حکومت کو چاہیے کہ جب کسی ایسی ناپسندیدہ کارروائی میں مجرم گرفتار ہوں تو اُن کے خلاف ہونے والی ساری تحقیق کو منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ عوام کو بھی پتہ چل سکے کہ کتنے واقعات میں مذہبی جنونی افراد ملوث ہیں اور کتنے واقعات میں کوئی اور طاقت اپنا ظالمانہ کھیل کھیل رہی ہے۔ اگر ایسی پالیسی (Policy) اختیار کی جائے تو یقیناً بہت کم واقعات مذہبی دہشت گردی اور تفرقہ بازی کا نتیجہ ہوں گے۔ اس طرح بہت ساری غلط فہمیاں ختم ہوں گی اور اتحادِ امت کا خواب تعبیر سے شرمندہ ہونے لگے گا۔

ذرائع ابلاغ کی اصلاح کی ضرورت

جب بھی کوئی دہشت گردی کا واقعہ ہو جائے تو خصوصاً ہمارے ملک کے تمام ذرائع ابلاغ، سربراہانِ ذرائع اور مغربی فکر کے حامل تبصرہ نگار اسے فرقہ واریت، مذہبی انتہا پسندی اور مسالک کی باہمی کشمکش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ طرزِ تبصرہ بجائے خود انتہا پسندی، مذہب سے دشمنی، اختلافات کو ہوا دینے اور بلاتحقیق کوئی نتیجہ بیان کرنے کی مذموم حرکت ہوتی ہے۔ جب تک کوئی تحقیقی اور حتمی نتیجہ سامنے نہ آئے کسی بھی واقعے کو نہ ذاتی عداوت کہا جا سکتا ہے نہ سیاسی دشمنی کا نتیجہ اور نہ ہی مذہبی انتہا پسندی کی

کارروائی۔

ایسے تبصروں سے اصل دشمن چھپ جاتے ہیں۔ پولیس انتظامیہ غلط بنیادوں پر تحقیق شروع کر دیتی ہے۔ حقیقی دشمن، انتظامیہ کی ناک کے نیچے ناک چڑھاتا رہتا ہے اور یہ مساجد و مدارس دینیہ کے اردگرد مذہبی دہشت گردی کی بُو سونگھنے میں لگی رہتی ہے۔ اس طرح دینی حلقوں کے گرد دائرہ تنگ کر کے پوری دنیا کو یہ پیغام (Message) دیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ہر مسجد، ہر دینی ادارہ اور ہر مذہبی راہنما دہشت گرد، ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور اتحاد کا دشمن ہے، اس طرح کے عمل سے مزید ایسی کارروائیوں کے بہت سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے میڈیا (Media) کو ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے اور ایسے مبصرین کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے جو اتحاد کی راہ ہموار کرنے کے بجائے اُسے مزید پیچیدہ کر رہے ہیں۔

نشر و اشاعت کمیٹیوں کا قیام

ہر مکتبۂ فکر میں بہت سارے آزاد مصنّفین اور غیر ذمہ دار لکھاری آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی تصانیف ہی زیادہ تر اختلافات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جب ایک غیر تحقیقی، قابل اعتراض اور غیر سنجیدہ تصنیف اور پھر اُس کا جواب بھی بازار میں آ جائے تو اُس کو ختم کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہر مسلک کی ایک مستند علماء پر مشتمل کمیٹی بن جائے جو پورے مسلک کی نمائندہ ہو اور اس کی ذمہ داری ہو کہ وہ اپنے مسلک کی چھپنے والی ہر کتاب کا بغور جائزہ لے۔ اگر یہ کتاب اُس مسلک کی صحیح نمائندگی کرتی ہو، سنجیدہ اور محتاط عبارات سے مزین ہو تو اُس کمیٹی کے تحریری اجازت نامے سے اُسے منظرِ عام پر لایا جائے بصورت دیگر حکومت کسی بھی کتاب کے چھپنے پر مکمل پابندی عائد کر دے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو اختلافات کی سطح کم ہوگی دوسری طرف معیاری کتب ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہوں گی۔ غیر معیاری کتب کا خاتمہ ہوگا اور تحقیق و جستجو کا راستہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔

تمام مسالک کی نمائندہ کمیٹی کا قیام

ہر مسلک کی نمائندہ کمیٹی سے دو دو ارکان لے کر ایک مشترکہ کمیٹی تشکیل دی جائے جس کا کام اختلافی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرنا اور اتفاق رائے سے راہِ اعتدال کی تلاش ہو۔ اگر کوئی نقطۂ اتحاد پیدا ہو جائے یا ایسی صورت جو اتحاد کے قریب ہو اور اُس کی بناء پر مزید اختلاف نہ ہو سکتا ہو نیز اُس میں شدت و تلخی نہ ہو تو اُسے متفقہ فیصلے سے شائع کر دیا جائے ورنہ اپنی بحث کو خفیہ رکھتے ہوئے مزید غور و خوض جاری رکھا جائے تاوقتیکہ کوئی مناسب صورت پیدا ہو جائے۔ عوام کو صرف کمیٹی کے متفقہ فیصلوں سے ہی آگاہ کیا جائے اور اندرونی کارروائی کو تقریراً تحریراً اشارۃً یا کنایۃً کسی جگہ ظاہر نہ کیا جائے۔

کھلے عام مناظروں پر پابندی لگا دی جائے۔صرف بند کمرے میں اور مشترکہ کمیٹی کے سامنے اپنے خیالات و دلائل کا تبادلہ کریں اور پھر کمیٹی اگر مناسب سمجھے تو ان دلائل کا جائزہ لے کر معتدل فیصلہ، جو بہر حال حق پر مبنی ہو، صادر فرما کر اُس کی اشاعت کی اجازت دے۔لیکن یہ صرف اُس صورت میں ہو کہ جب تمام ارکان اس پر متفق ہوں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب بدؤالوحی الی رسول اللہ ﷺ، رقم الحدیث ۱

۲۔ الحاکم، محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، دارالکتب العلمیہ، بیروت، سن، کتاب العلم، ۱/ ۱۷۷

۳۔ مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الفضائل، باب بیان أن بقاء النبی ﷺ امان لاصحابه، فبقأ اصحابه امان للأمة، رقم ۶۴۶۶، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن

۴۔ سورۃ العلق ۹۶:۱، ۵

۵۔ آل عمران ۳:۱۰۳

۶۔ ایضاً

۷۔ مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الفضائل، باب مواخاۃ النبی ﷺ بین اصحابہ، ۳۱۲/۲، رقم ۶۴۶۳

ابن ہشام، ابو محمد عبدالملک، السیرۃ النبویہ مع الروض الانف، عبدالتواب اکیڈمی، ملتان، س ن، ص ۱۸

السہیلی، ابوالقاسم، عبدالرحمٰن بن عبداللہ، الروض الانف، عبدالتواب اکیڈمی، ملتان، س ن، ۱۸/۲

۸۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، ضرب کلیم، مشمولہ: کلیات اقبال، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۴

۹۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ اے بائیوگرافی آف دی پرافٹ، مترجم: نعیم اللہ ملک، لاہور: ۲۰۱۲ء، ص ۳۵ تا ۴۱

۱۰۔ الانشراح: ۴

۱۱۔ بخاری، التاریخ الصغیر، نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۹۶۱ء، ج ۲، ص ۴۹۴

۱۲۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب ابواب الفضائل القرآن، باب اقرؤا القرآن ما ائتلفت قلوبکم، رقم ۵۰۶۲

۱۳۔ عبدالرشید بن محمد مصطفیٰ، مناظرہ رشیدیہ، دارالحدیث ملتان، س ن، ص ۱۲، ۱۳

۱۴۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب اجر الحاکم اذا اجتھد ......رقم ۷۳۵۲

۱۵۔ بخاری، صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب، رقم ۴۱۱۹

۱۶۔ جامی، عبدالرحمٰن بن نظام الدین، شرح الجامی علی الکافیہ، نعمانی کتب خانہ، کابل افغانستان، س ن، ص ۱۹

۱۷۔ مسلم، صحیح مسلم، مقدمہ، ص ۸، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، سن ندارد، ص ۸

۱۸۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان، فتاویٰ رضویہ، رضا فاؤنڈیشن، لاہور، ج ۲، ص ۵۲۶ تا ۵۲۸

۱۹۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم، الاشباہ والنظائر، قدیمی کتب خانہ کراچی، س ن، ص ۸۷
سیوطی، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، الاشباہ والنظائر، دار التوفیقیہ للتراث، القاہرہ، س ن، ص ۱۱۶

۲۰۔ ابن حزم، علی بن محمد، الاحکام فی اصول الاحکام، دار الآفاق الجدیدہ، بیروت، س ن، ۲/۶۶
ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، باب فی قتل النسآء، رقم ۳۶۶۸
ابن ماجہ، محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ، باب الفارات والبینات، بیت الافکار الدولیۃ، بیروت، س ن، رقم ۲۸۴۱

۲۱۔ البقرہ۲:۱۱۴

۲۲۔ ہمایوں عباس، ڈاکٹر، مذہبی انتہا پسندی اور اُس کا تدارک، مکتبہ جمال کرم، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱

قتلِ غیرت کی شرعی حیثیت

ڈاکٹر محمد زمان چیمہ☆/ڈاکٹر محمد اکرم ورک☆☆

Abstract:

"To kill a woman for the sake of honour, killing for passion in western societies, is not a newly born issue. This issue is attached with humanity from its birth and incidents related to this kind of killing and guidelines from prophets are found in previous revealed books. So, Islamic Sharia has also adressed this issue and vividly described the penalties for fornication, though it should be done with mutual consent or forcefully. A number of voices are raising against this killing as well as the penalties of Islam which are fixed by Sharia. These voices are not only from West but also from the East and Muslim Scholors, particular from Western funded NGO's. For responding these voices, Pakistani Parliament made some ammendment to formulate such a law for elimination this killing. This article is written in the background of Honour Killing in Pakistan and described the teachings of Islamic Sharia and the legislation of Pakistan. In this essay, Islamic Sharia's teachings and the law of Pakistan penal code will be analysed in this regard."

Keywords: Women rights, Islamic Sharia, Fornication, Islamic Penalties, Pakistan Penal Code.

حمیت کے جذبے کے ساتھ خودداری اختیار کرنا اور غیر کی شرکت کو ناپسند کرنا، غیرت کہلاتا ہے۔(1)

غیرت ایک پسندیدہ اور مستحسن عمل ہے لیکن دیگر تمام جذبوں کی طرح اس میں بھی توازن اور اعتدال رکھنا

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ

☆☆ پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز) کامونکی

ضروری ہے۔زوجین کے درمیان تو یہ بہت متوازن ہونی چاہیے کیونکہ غیرت میں افراط سے شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں اور تفریط کی وجہ سے بے حیائی گلی گلی پھیل سکتی ہے۔خاص طور پر خاوند کو عزت و غیرت کے معاملے میں نہ تو اتنا سخت ہونا چاہیے کہ بلا وجہ شک و شبہات میں پڑ جائے اور نہ اتنا ڈھیلا ہونا چاہیے کہ کسی بات کی پرواہ ہی نہ ہو اور بے حیائی اور بے غیرتی کو دیکھ کر خاموش رہے، ایسے شخص کو دیوث کہا جاتا ہے۔اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

''ان اللّٰہ لا ینظر الی الدّیُوث یوم القیمة و لا یدخله الجنة''(۲)

(اللہ تعالیٰ غیرت سے بے نیاز شخص کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھیں گے اور نہ اسے جنت میں داخل کریں گے۔)

کتبِ سابقہ اور مغرب میں غیرت سے متعلق احکام

غیرت کا تصور مذاہب اور معاشرتی اقدار سے بالاتر ایک انسانی جذبہ ہے، جس کی مثالیں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب اور مغربی معاشروں میں بھی ملتی ہیں۔غیرت کے نام پر قتل کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ شریعتِ اسلامیہ کے علاوہ توراۃ و انجیل میں ایسے احکام موجود ہیں جس کے مطابق ایسا فرد جس نے کسی دوسرے شخص کی عزت کو داغدار کیا ہو ایسے شخص کی سزا صرف اور صرف موت مقرر تھی اور اسے متاثرہ خاندان قتل کرنے کا پورا حق رکھتا تھا۔بائبل کی درج ذیل آیات میں ایسے شخص کے متعلق احکامات اور سزاؤں کا بیان کیا گیا ہے:

''اور جو شخص دوسرے کی بیوی سے یعنی اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے، وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں۔''(۳)

''اور جو شخص اپنی سوتیلی ماں سے صحبت کرے، اس نے اپنے باپ کے بدن کو بے پردہ کیا، وہ دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں۔''(۴)

''اور جو شخص اپنی بہو سے صحبت کرے تو وہ دونوں ضرور جان سے مارے جائیں۔''(۵)

''اگر مرد اس عورت سے جو کپڑوں سے ہو، صحبت کر کے اس کے بدن کو بے پردہ کرے تو اس نے اس کا چشمہ کھولا اور اس عورت نے اپنے خون کا چشمہ کھلوایا۔وہ دونوں اپنی قوم میں سے کاٹ ڈالے جائیں۔''(۶)

''اگر کاہن کی بیٹی فاحشہ بن کر اپنے آپ کو ناپاک کرے تو وہ عورت آگ میں جلائی جائے۔''(۷)

شادی شدہ عورت سے بدکاری کی سزا قتل مقرر کی گئی۔اس فعل پر دونوں زانی اور مزنیہ کی سزا ایک ہی رکھی گئی تھی اور اس میں مرد خواہ وہ کنوارا ہو یا شادی شدہ، اس کی سزا موت مقرر کی گئی تھی۔

''اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی۔''(۸)

ایسی عورت جس کی منگنی ہوگئی ہو اور اس عورت سے زنا کیا جائے تو زانی اور مزنیہ دونوں کی سزا سنگساری تھی۔

''اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہوگئی اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔''(۹)

ایسا شخص جو جادو سیکھنے کی غرض سے بدکاری کرے تو اس کی سزا بھی قتل مقرر کی گئی تھی۔

''جو شخص جنات کے یاروں اور جادوگروں کے پاس جائے کہ ان کی پیروی میں زنا کرے، میں اس کا مخالف ہوں گا اور اسے قوم سے کاٹ ڈالوں گا۔''(۱۰)

اگر کوئی شخص ایسی کنواری لڑکی جس کی منگنی نہ ہوئی ہو، اس سے زنا کرے تو اس مرد کو مالی جرمانے کے ساتھ اُس لڑکی سے شادی کرنی پڑتی اور اس شادی میں مرد کے پاس طلاق کا کوئی اختیار نہ ہوتا تھا۔

''اگر کسی آدمی کو کوئی کنواری لڑکی مل جائے جس کی نسبت نہ ہوئی ہو اور وہ اسے پکڑ کر اس سے صحبت کرے اور دونوں پکڑے جائیں۔ تو وہ مرد جس نے اس سے صحبت کی ہو، لڑکی کے باپ کو چاندی کی پچاس مثقال دے اور وہ لڑکی اس کی بیوی بنے کیونکہ اُس نے اسے بے حرمت کیا اور وہ اسے اپنی زندگی بھر طلاق نہ دینے پائے۔''(۱۱)

سترھویں صدی میں انگلینڈ میں ایک قانون جسے "Kentish Law of King Ethelbert" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں زبردستی زنا کی سزا موجود تھی اور اس قانون میں مرتبے اور مقام کی وجہ سے سزاؤں میں تغیر بھی موجود تھا۔

"If a freeman raped the slave of a commoner he had to pay no more than five shillings' compensation, but if a slave raped this same girl he was castrated."(12)

(اگر کوئی آزاد شخص کسی عام آدمی کی لونڈی کے ساتھ زبردستی زنا کرتا تو اسے پانچ شیلنگ سے زیادہ ادا نہ کرنا ہوتا تھا لیکن اگر ایک غلام اسی لڑکی کے ساتھ زبردستی جنسی تعلق قائم کرتا تو اسے نامرد کر دیا جاتا تھا۔)

انگلینڈ کے قانون کے متعلق گریشم لکھتے ہیں:

"The Common law of England divided crimes into four groups: high treason, petit treason, felonies, and misdemeanors. The first consisted in killing the king, levying war against him, supporting his enemies, or lending his enemies aid and comfort.

Petit treason involved the killing of a husband by a wife, a master or mistress by a servant, or a prelated by a clergyman- a breach of allegiance, in short, in a superior-subordinate relationship other than king and subject. Felonies were defined as crimes other than treason that caused great moral indignation or did serious harm and were punishable by death and the forfeiture of land and goods. Misdemeanors consisted of offenses that were consiered minor and were punishable with lesser penalties, such as whipping and banding."[(13)]

(برطانیہ کے عام قانون میں جرائم کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا: بڑی بغاوت، چھوٹی بغاوت، بڑے جرائم اور چھوٹے جرائم۔ بڑی بغاوت میں بادشاہ کا قتل، اس کے خلاف جنگ میں حصہ لینا، اس کے دشمنوں کی مدد کرنا یا اس کے دشمنوں کو مدد فراہم کروانا اور سہولت دینا۔ چھوٹی بغاوت میں بیوی کے ہاتھوں شوہر کا قتل، غلام کے ہاتھوں مالک یا مالکہ کا قتل، چرچ کے کسی رکن کی طرف سے پادری کا قتل، مختصر یہ کہ بادشاہ سے علاوہ چھوٹے درجے سے تعلقات میں اخلاص کی کمی۔ بغاوت کے علاوہ بڑے جرائم جو اخلاقی زوال یا انتہائی تکلیف کا سبب ہوں اور موت اور زمین یا اشیاء کے ضبط ہونے کی سزائیں ہوں، انہیں جرائم مانا گیا۔ چھوٹے جرائم ایسے جرائم پر مشتمل تھے جو چھوٹے ہوں اور چھوٹی سزاؤں کے قابل ہوں، جیسے جسم پر داغنا اور کوڑے مارنا۔)

اقوام متحدہ کی طرف سے جاری کردہ Universal Declaration of Human Rights میں بھی نجی اور خانگی معاملات میں مداخلت کو بنیادی حقوق سے متضاد مانا گیا ہے۔

"Article 12- No one shall be subjected to arbitrary interference with his privacy, family, home or correspondence, nor to attacks upon his honour and reputation. Everyone has the right to the protection of the law against such interference or attacks."[(14)]

(کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کا حق ہے کہ قانون اسے حملے یا مداخلت سے محفوظ رکھے۔)

امریکہ کے ریاستی قانون کی شق نمبر ۲۵۵.۱۷ کی طرف اشارہ کیا گیا جس کے مطابق ایسے

افراد جنہوں نے اپنی بیوی یا خاوند کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے مرد یا عورت سے جنسی تعلقات قائم کیے ہوں، ان کی سزا ۹۰ دن کی جیل یا ۵۰۰ ڈالر جرمانہ ہے۔

> "Section 255.17 of the state penal law state, "A person is guilty of adultery when he engages in sexual intercourse with another person at a time when he has a living spouse, or the other person has a living spouse. Adultery is a class B misdemeanor." A class B misdemeanor is punishable by up to 90 days in jail or a $500 fine."[(15)]

امریکہ کا یہ قانون ستمبر ۲۰۰۱ء سے لاگو ہے۔[(۱۶)] مغرب اس زنا کو جُرم تسلیم کرتا ہے جو شادی شدہ کرے یا کسی طرف سے زبردستی کی جائے اور اس کا جواز یہ دیتا ہے کہ چونکہ اس نے یہ فعل اپنی بیوی یا خاوند کے ہوتے ہوئے کیا ہے یا دوسری پارٹی کی رضامندی کے بغیر کیا ہے، اس لیے اسے سزا ملے گی۔

قتلِ غیرت اور پاکستان

غیرت کے نام پر قتل کی پاکستان کے مختلف علاقوں میں مختلف نام ہیں۔ سندھ میں اس قتل کو ''کاروکاری''، پنجاب میں ''کالا کالی''، بلوچستان میں ''سیہ کاری'' اور سرحد میں ''تورتورہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں جب کوئی عورت کسی غیر مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات میں ملوث پائی جائے یا اس پر ناجائز تعلقات کا الزام عائد کر دیا جائے تو عورت اگر شادی شدہ ہے تو شوہر اور بیٹا اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو باپ، بھائی اور خونی رشتہ اس رسم کے تحت اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ وہ غیرت کے دفاع میں مرد و عورت دونوں کو قتل کر دیں۔ ایک وقت میں اس رسم کا دائرہ پاکستان کے دیہاتی، قبائلی، سرحدی اور کم تعلیم یافتہ علاقوں تک محدود تھا جب کہ آج کل عزت و ناموس کے نام پر قتل کا سلسلہ ان علاقوں تک بھی پھیلتا نظر آتا ہے جہاں پہلے ایسی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ اس پر مزید یہ کہ اس الزام کے تحت قتل ہونے والے افراد کی لاش کو بغیر غسل و کفن کے دریا برد اور دفنا دیا جاتا ہے۔ نماز جنازہ پڑھنے کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ بعض قبائل تو قبر تک بھی نہیں بناتے ہیں بلکہ صرف ایک گڑھا کھود کر میت کو اس میں دفنا دیتے ہیں۔ پاکستان کے وہ علاقے جہاں اس رسم کا نفاذ ہے، وہاں ناجائز تعلقات سے درج ذیل صورتیں مراد لی جاتی ہیں:

۱۔ غیر محرم مرد و عورت کا آپس میں تنہائی میں یا چھپ کر بیٹھنا۔

۲۔ عورت کی طرف سے پسند کی شادی کا اظہار کرنا۔

۳۔ غیر محرم مرد و عورت کا آپس میں ناجائز تعلق پیدا کر لینا۔
۴۔ کسی قریبی رشتہ دار کی طرف سے عورت پر بدکاری کا الزام لگانا۔
۵۔ والدین کی مرضی کے بغیر شادی کر لینا۔

اس کے علاوہ اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن کی بناء پر کسی عورت اور مرد کو قصور وار ٹھہرا کر سزائیں دی جائیں مگر زیادہ تر واقعات میں درج بالا امور ہی سزا کا سبب بنتے ہیں۔

پاکستان میں غیرت کے نام پر قتل کے جرائم کو ۱۹۹۹ء میں قومی ذرائع ابلاغ میں اس وقت نمایاں کیا گیا جب پشاور کی ایک عورت (سمیعہ) نے اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں گھر سے فرار ہو کر عاصمہ جہانگیر کے ادارہ ''دستک'' میں پناہ لی۔ اس عورت کو اس کے ماں باپ نے اپنے محافظوں سے اسی دفتر میں قتل کروادیا جس کے بعد سے یہ مسئلہ این جی اوز کے زیرِ اہتمام مسلسل ذرائع ابلاغ میں نمایاں مقام حاصل کرتا رہا اور اس واقعہ کے بعد ایسے مجرم کو سنگین سزا دینے کے مطالبہ میں شدت آ گئی۔ اس حوالے سے مختلف مقامات پر سیمینار، مظاہرے اور عوامی سروے بھی کروائے گئے جس کے نتیجے میں ۸ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی نے قتلِ غیرت سے متعلق قانون سازی کی حمایت کرتے ہوئے ترمیم تجاویز پاس کر کے قومی اسمبلی میں بحث کے لیے پیش کر دی جسے ۲۷/اکتوبر کو منظور کر لیا گیا۔

قتلِ غیرت اور شریعتِ اسلامی کے رجحانات

غیرت کے نام پر قتل کی مذکورہ بالا رسم اسلامی احکام سے متصادم ہے۔ اسلام میں ایسے قتل کی نہ کوئی اجازت ہے اور نہ ترغیب بلکہ اسلام اپنے ماننے والوں سے نظم وضبط کی پابندی اور اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ البتہ محدثینؒ اور فقہاء کرامؒ نے نبی کریم ﷺ اور دورِ صحابہؓ میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں ان احادیث کے مقصد و مدعا میں اختلاف کیا ہے۔ ذیل میں چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔

دورِ نبوی ﷺ کے اسلامی معاشرے میں بھی اس نوعیت کے بعض مسائل پیش آئے جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے ہماری واضح رہنمائی فرمائی۔ آپ ﷺ کے دور میں اس نوعیت کے تین مختلف واقعات کا تذکرہ ملتا ہے:

> ''حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہلال بن امیہؓ نے نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر شریک بن سحماء کے ساتھ اپنی بیوی کے ملوث ہونے کا الزام لگایا۔ نبی ﷺ نے اس سے کہا: گواہ لاؤ، ورنہ تم پر حد لگے گی۔ اس نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر شخص کو دیکھ لے تو کیا وہ گواہ تلاش کرتا پھرے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: گواہ لاؤ، وگرنہ تمہاری پیٹھ پر حد لگے گی۔ تو ہلالؓ نے کہا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر بھیجا ہے، میں سچ کہہ رہا ہوں، اس لیے

میری پیٹھ کو حد سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ ضرور کوئی حکم اتارے گا تو جبریل علیہ السلام آپ ﷺ پر یہ آیات لے کر نازل ہوئے: ﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاء إِلَّا أَنفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَo وَالْخَامِسَةُ أَنَّ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَيْهِ إِن كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ وَيَدْرَأُ o عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللَّهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ o وَالْخَامِسَةَ أَنَّ غَضَبَ اللَّهِ عَلَيْهَا إِن كَانَ مِنَ الصَّادِقِينَ(النور۹۔٦)﴾''[۱۷]

آگے حدیث میں اس واقعہ کی تفصیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے مابین لعان کروا دیا۔ ہلال بن امیہؓ اسلام میں لعان کرنے والے سب سے پہلے شخص ہیں۔ [۱۸] اسی تناظر میں دوسری روایت عویمر عجلانیؓ کی ہے:

''سہل بن ساعدی سے مروی ہے کہ بنو عجلان کے سردار عویمر عجلانیؓ عاصم بن عدیؓ کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: اس آدمی کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو پائے۔ کیا وہ اس آدمی کو قتل کر دے تو جواباً اسے بھی قتل ہونا پڑے گا یا پھر وہ کیا کرے؟ میرے لیے نبی ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھو۔ عاصمؓ نے نبی کریم ﷺ سے جب یہ مسئلہ پوچھا تو رسول ﷺ نے اس سوال کو ناپسند کیا، گویا معیوب سمجھا۔ عویمرؓ نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہیں رکوں گا جب تک رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں خود نہ پوچھ لوں۔ پھر عویمرؓ آئے اور انہوں نے بھی نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے گھر کے معاملہ میں قرآن نازل کر دیا ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے سورۂ نور کی آیات (۹۔٦) تلاوت کیں۔ آگے حدیث میں لعان کروانے کا تذکرہ ہے۔''[۱۹]

اس سلسلے میں سب سے اہم واقعہ انصاری سردار حضرت سعد بن عبادہؓ کا ہے۔ جب سورۂ نور میں حدِ قذف کے احکام نازل ہوئے تو انصاری صحابی سعد بن عبادہؓ کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو زنا کی حالت میں دیکھے تو کیا وہ اب چار گواہ تلاش کر کے لائے کہ کیا اس وقت انسانی غیرت گوارا کرتی ہے کہ ایسے مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ مشغول رہنے دے۔ ان روایات کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

''انّ سعد بن عبادة الانصاری قال یارسول اللّٰه ارایت الرّجل یجد مع امراته رجلاً یقتلهٗ قال رسول اللّٰه ﷺ 'لا'''[۲۰]

(حضرت سعد بن عبادہؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو رنگے ہاتھوں پکڑ لے تو کیا وہ اس کو قتل کر سکتا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: 'نہیں'۔)

اگلی حدیث میں ہے:

"قال یارسول اللّٰہ ان وّجدتُّ مع امراتی رجلاً امھلہ حتّٰی اٰتی باربعة شھدآء قال 'نعم'"(۲۱)

(یارسول اللہ ﷺ! کیا پھر اس (مجرم) شخص کو اتنی مہلت دے کہ چار گواہ لے کر آئے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: 'ہاں'۔)

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے اپنے حوالے سے پوچھا:

"قال یارسول اللّٰہ لو وجدتُّ مع اھلی رجلاً لم امسّهٗ حتّٰی آتی باربعة شھدآء قال رسول اللّٰہ ﷺ نعم قال کلّا والّذی بعثک بالحق ان کنت لاعاجلہ بالسّیف قبل ذٰلک قال رسول اللّٰہ اسمعوا الٰی ما یقول سیّدکم انہٗ لغیور وانا اغیر منہ واللّٰہُ اغیر منّی"(۲۲)

(یارسول اللہ ﷺ! اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو دیکھ لوں تو کیا چار گواہ لانے سے قبل میں اس کو کچھ نہیں کہہ سکتا؟ نبی کریم ﷺ نے کہا: بالکل کچھ نہیں۔ تو سعد کہنے لگے: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، میں تو اس سے پہلے پہلے تلوار سے اس کا فیصلہ کردوں گا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سنو سنو، اپنے سردار کی بات سنو! یہ بہت غیرت مند شخص ہے حالانکہ میں اس سے زیادہ غیرت والا ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہیں۔)

ابو ہریرہؓ کے علاوہ مغیرہؓ بن شعبہ بھی یہ روایت بیان کرتے ہیں:

"قال سعد بن عبادةؓ لو رایت رجلاً مع امراتی لضربتہٗ بالسّیف غیر مصفح عنہ فبلغ ذلک النّبی ﷺ فقال اتعجبون من غیرة سعد؟ فواللّٰہ! لانا اغیر منہ واللّٰہ اغیر منی"(۲۳)

(سعد بن عبادہؓ نے کہا: اگر میں کسی شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھ لوں تو میں کسی رعایت کے بغیر تلوار سے اس کا کام تمام کردوں گا۔ یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم سعد کی غیرت پر تعجب کرتے ہو؟ قسم بخدا میں اس سے زیادہ غیرت والا ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت والے ہیں۔)

یہاں چند سوالات انسانی اذہان میں جنم لیتے ہیں:

۱۔ نبی کریم ﷺ کے فرمان کے ظاہری حکم کی بناء پر اگر اس کو جرم تصور کر لیا جائے تو اس جرم کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ قتلِ غیرت کے مرتکب کو قتل کا مجرم سمجھا جائے گا یا قانون ہاتھ میں لینے کا؟

۳۔ جرم کی تعیین کے بعد اس کو سزا کون سی دی جائے گی؟

ان سوالات (مسائل) کے ساتھ قرآن و حدیث کے احکامات کو ملا کر دیکھا جائے تو اس

بارے میں درج ذیل رجحانات نظر آتے ہیں:

۱۔ بعض اہلِ قلم تو اس قتل کو جرم سمجھتے ہیں لیکن دورانِ بدکاری اس فعل کو ناممکن بنانے کی کوشش کرنا خصوصاً میاں بیوی کے لیے اور عموماً تمام لوگوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ مؤقف اپنی ذات کے دفاع یا نہی عن المنکر کے اسلامی تصور کی بنا پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسا قتل بذاتِ خود ہی جرم نہیں بلکہ دراصل ایک سنگین جرم کا ردِ عمل ہے اور قرآن کریم کا حکم ہے:

"فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ" (البقرہ،۲:۱۹۴)

(تم پر جو زیادتی کرے تو اس کی زیادتی کا ویسے ہی اسے جواب دو۔)

اور اس سلسلے میں حکومت سے بھی مدد لینے کو ضروری قرار نہیں دیا گیا۔[۲۴]

۲۔ اہلِ علم میں سے کسی کا بھی یہ مؤقف نہیں ہے کہ دورانِ بدکاری مرد و زن کو نہ روکا جائے، اس کے باوجود اگر نبی کریم ﷺ کے فرمان کا یہی تقاضا فرض کر لیا جائے تو ایسی صورت میں اس جرم کی سزا کے بارے میں تفصیل ہے۔ لیکن اگر کوئی حمیت و غیرت میں قتل کر دے تو اس کو کیا سزا دی جائے؟ اور اگر حمیت و غیرت کا اظہار اس فعل کے بعد کرتے ہوئے مرتکبین زنا کو قتل کرے تو اس پر کیا سزا ہو گی؟ فقہاء کا اس کے متعلق متفقہ مؤقف یہ ہے کہ قاتل اگر شادی شدہ مقتولین کا بدکاری میں ملوث ہونا ثابت کر دے تو ایسی صورت میں اس کو قانون ہاتھ میں لینے کی سزا دی جائے گی، نہ قتل کی۔ اس حوالے سے جسٹس عبدالقادر عودہ نے اپنی کتاب ''التشریع الجنائی'' میں تفصیلی بحث کی ہے۔

حملہ آور سے دفاع

جب مختلف قرائن سے یہ بات واضح ہو جائے کہ اس فعل بد کے لیے عورت راضی نہ تھی بلکہ اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ایسی صورت میں عورت کا خود اپنا دفاع کرنا یا شوہر پر اپنی بیوی کا دفاع کرنا، دونوں شریعت کی رو سے واجب ہیں۔ اس دوران اگر حملہ آور مارا بھی جائے تو اس کا خون رائیگاں جائے گا مگر ایسے حملہ آور کا فرض ہے کہ وہ اپنے دفاعی اقدام کو ثابت کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے:

''عبداللہ بن عمیرؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے قبیلہ ہذیل کے کچھ لوگوں کی دعوت کی اور اپنی باندی کو لکڑیاں کاٹنے کے لیے بھیجا۔ مہمانوں میں سے ایک مہمان کو وہ پسند آ گئی اور وہ اس کے پیچھے چل پڑا اور اس کی عصمت لوٹنے کا طلبگار ہوا، لیکن باندی نے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر ان میں کشمکش ہوتی رہی پھر وہ اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے ایک پتھر اٹھا کر اس شخص کے پیٹ پر مار دیا جس سے اس کا جگر پھٹ گیا اور وہ مر گیا۔ پھر وہ اپنے گھر والوں کے پاس پہنچی اور انہیں سارا واقعہ سنایا، اس کے گھر والے اسے حضرت عمرؓ کے پاس لے کر گئے اور آپؓ سے سارا واقعہ بیان کیا۔

حضرت عمرؓ نے معاملہ کی تحقیق کے لیے کچھ لوگوں کو بھیجا اور انہوں نے موقع پر ایسے آثار دیکھے جس سے دونوں میں کشمکش کا ثبوت ملتا تھا۔ تب حضرت عمرؓ نے فرمایا: اللہ نے جسے مارا ہے، اس کی دیت نہیں دی جاسکتی۔''(۲۵)

اسی طرح اگر شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے مرد کو شریکِ بدکاری دیکھے اور اسے قرائن سے زیادتی کا اندازہ ہوجائے تو شوہر پر اس کا دفاع کرنا واجب ہے اور اس کے لیے وہ جارح کا قتل بھی کرسکتا ہے۔

''حضرت زبیر بن العوامؓ ایک لشکر کے ساتھ جارہے تھے کہ کسی وجہ سے لشکر کے پیچھے رہ گئے۔ راستے میں انہیں دو آدمی ملے اور ان سے کھانا مانگا۔ حضرت زبیرؓ نے جو کچھ تھا، انہیں دے دیا، اس کے بعد وہ کہنے لگے: لونڈی ہمارے حوالے کردو۔ یہ سن کر حضرت زبیرؓ نے انہیں تلوار ماری اور دو ٹکڑے کر دیا۔'' (۲۶)

برائی سے روکنا (نہی عن المنکر)

اگر دونوں فریق اس جرم میں برضا ورغبت شریک ہوں تو شوہر اپنے حرم اور نطفہ میں اختلاط و شبہ کو بچانے کے لیے وقوعہ کے دوران اس فعل سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے قتل کی نوبت آتی ہے تو شوہر کا یہ فعل شریعت کی نظر میں گوارا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں ہی درج ذیل واقعہ پیش آیا تو آپ نے قاتل کی تحسین اور حوصلہ افزائی فرمائی:

''ایک روز حضرت عمرؓ کھانا کھارہے تھے کہ ایک شخص آیا، اس کے ہاتھ میں خون آلود ننگی تلوار تھی۔ وہ آکر حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھ گیا اور کھانے میں شریک ہوگیا۔ پیچھے پیچھے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا: یا امیر المؤمنین! اس شخص نے ہمارے آدمی کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھ کر دونوں کو قتل کرڈالا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ایک اور شخص بولا: اس آدمی نے اپنی بیوی کی رانوں پر تلوار ماری۔ اگر درمیان میں کوئی تھا تو اسے قتل کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے پھر پوچھا کہ یہ کیا کہتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس نے اپنی بیوی کی رانوں پر تلوار ماری جو اس شخص کی کمر پر لگی اور اس کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے قاتل سے کہا: اگر دوبارہ بھی کوئی ایسے کرے تو یہی حال کرنا۔''(۲۷)

البحر الرائق میں ہے کہ ابوجعفر ہندوانی سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو ملوث دیکھتا ہے کہ شوہر کے لیے اس آدمی کو قتل کرنا جائز ہے تو انہوں نے جواب دیا:

''ان كان يعلم أنه ينزجر عن الزنا بالصياح والضرب بما دون السلاح لا يحل وان علم انه لا ينزجر الا بالقتل حل له القتل وان المرأة حل له قتلها ايضا وفى المنية رأى رجلا مع امرأته وهو يزنى بها أو مع محرمه

وھما مطاوعتان قتل الرجل والمرأة جمیعاً"[۲۸]

(اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ چیخ وپکار یا اسلحہ کے بغیر مار پیٹ سے مجرم بھاگ جائے گا تو اس صورت میں قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ ایسے مجرم کے باز آجانے کا امکان نہ ہوتو تب اسی کو قتل کرنا جائز ہے اور اگر عورت بھی خوشی سے مجرم کے ساتھ شریک تھی تو مرد کا اس عورت کو بھی قتل کرنا درست ہے۔ اور منیۃ المصلی میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی یا اپنی محرم عورت کے ساتھ کسی آدمی کو گناہ کرتے دیکھا اور وہ دونوں اس بدکاری میں برضا ورغبت شریک تھے تو اس مرد نے زانی اور زانیہ دونوں کو قتل کر دیا جائے۔)

کویت کے فقہی انسائیکلو پیڈیا میں ہے:

"**وانما شرعت الغیرة لحفظ الأنساب وھو من مقاصد الشریعة ولو تسامح الناس بذلک لاختلطت الأنساب لذاقیل: کل أمة وضعت الغیرة فی رجالھا... ومن لا یغار علی أھله ومحارمه یسمی دیوثا والدیاثة من الرذائل التی ورد فیھا وعید شدید...﴿ثلاثة لا ینظر اللّٰہ الیھم یوم القیامة والدیوث﴾**"[۲۹]

(شریعت اسلامیہ میں نسل ونسب کی حفاظت کے لیے غیرت کو ایک مقام دیا گیا ہے۔ اگر لوگ اس میں کوتاہی کرنے لگیں تو ولدیتیں مشتبہ ہو جائیں۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ ہر امت کے مردوں میں غیرت پائی جاتی ہے اور جو شخص اپنے اہل وعیال اور محرم رشتہ داروں کے بارے میں غیرت نہیں کرتا، 'دیوث' کہلاتا ہے۔ دیوثیت ایک بدترین خصلت ہے جس کے بارے میں ایک اثر میں شدید وعید آئی ہے: تین لوگوں کی طرف روز قیامت اللہ تعالیٰ نظر تک نہ اٹھائیں گے اور ان میں ایک دیوث ہے۔)

اس حوالے سے کئی ایک امور قابلِ غور ہیں:

۱۔ یہ معاملہ محض بیوی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بہن، بیٹی، ماں و دیگر محارم جنہیں غیر مردوں کے ساتھ مشغول پایا جائے، ان کے لیے کیا حکم ہوگا؟

۲۔ اکثر لوگ اپنی دیرینہ دشمنی یا حسد وانتقام کی خاطر کسی شخص پر ایسا الزام لگا کر قتل کر دیتے ہیں، موجودہ حالات میں ایسے قتل کو کس طرح الگ کیا جا سکے گا؟

۳۔ جہاں مذکورہ نصوص اقدام قتل کے بارے بالکل واضح ہیں، وہاں شریعت میں تغییر المنکر کا قاعدہ بھی بڑا مستحکم ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

"**من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہٖ فان لم یستطع فبلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلک اضعف الایمان**"[۳۰]

اس حدیث کی روشنی میں مشغول شخص کو بھگانا اور نہ بھاگنے کی صورت میں قتل کر دینے کا جواز

معلوم ہوتا ہے۔[۳۱]

مسلمانوں کا دفاع میں شریک ہونا

جرم کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ اس کی روک تھام صرف حکومت کی ذمہ داری ہے، درست نہیں۔ اسلام میں جرم کی روک تھام کے لیے ایک مرحلہ دورانِ جرم کا بھی ہے۔ دورانِ جرم مجرم کو روکنا متاثرہ مسلمان کے لیے خصوصاً اور عام مسلمانوں کے لیے عموماً فرض ہے۔ البتہ جرم کے بعد اس کی ذمہ داری صرف حکمران کا فرض ہے۔ نہی عن المنکر کی مشروعیت کے تمام دلائل اس امر کی بنیاد ہیں کہ مسلمانوں کو جبراً ہونے والی زیادتی میں اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرنا چاہیے، جہاں تک خوشدلی سے ہونے والے جرم کا تعلق ہے تب بھی مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کو انجام پانے سے روکیں۔ حملہ آور کے دفاع میں اپنی جان، مال اور عزت کا تحفظ کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے جبکہ نہی عن المنکر میں دوسرے مسلمان بھائی کے ان حقوق کا تحفظ اور دیگر جرائم کی روک تھام بھی شامل ہے۔ عبدالقادر عودہ لکھتے ہیں:

> ''عزت پر حملے کی صورت میں تمام فقہاء کے نزدیک مدافعت فرض ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی عورت کی عزت پامال کرنا چاہے اور وہ عورت اس شخص کو قتل کر کے ہی اپنا دفاع کر سکتی ہو تو اگر اس کے لیے ممکن ہو تو اس پر اس شخص کا قتل کر دینا فرض ہے کیونکہ اپنے اوپر قدرت دینا اس عورت کو حرام ہے اور اگر مدافعت نہیں کرے گی تو وہ شخص اس پر قابو پالے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دیکھے کہ کوئی آدمی زنا کر رہا ہے یا زنا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ شخص اس کو قتل کیے بغیر باز نہیں رکھ سکتا تو اگر اس کے لیے اسے قتل کر دینا ممکن ہے تو اس کے لیے جائز ہے۔''[۳۲]

حضرت علیؓ کے دور کا واقعہ ہے کہ کچھ لوگ اکٹھے ہو کر کسی قبیلہ کی ایک عورت کے پاس آئے قبیلہ کے کچھ لوگوں کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے جا کر ان لوگوں کو قتل کر دیا۔ اگلے دن ان کے جنازے میں حضرت علیؓ کے پاس پیش کیے گئے تو آپؓ نے پوچھا: یہ سب لوگ ایک عورت کے گھر اکٹھے ہو کر کیا کرنے گئے تھے؟ واقعہ کی تفصیلات سن کر آپؓ نے ان لوگوں کا خون رائیگاں قرار دے دیا۔[۳۳]

''نہی عن المنکر'' ایک طرف حکومت اور عدالت کی بجائے ہر مسلمان کا فرض ہے تو دوسری طرف اس کے تین مراحل (ہاتھ، زبان اور دل) بھی حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ بعض علماء نے اس روکنے میں تدریج کا بھی لحاظ کیا ہے کہ پہلے پہل اس کو شور شرابے سے روکنا چاہیے، پھر مار پیٹ سے۔ حتیٰ کہ پھر بھی اگر وہ جرم سے باز نہ آئے اور قتل تک بھی نوبت پہنچ جائے تو اس سے دریغ نہ کرے۔ فقہائے احناف کا موقف درج ذیل ہے:

> ''رأى رجلا يزنى بامرأته أو بامرأة رجل آخر وهو محصن فصاح به ولم يهرب ولم يمتنع من الزنا حل لهذا الرجل قتله وان قتله فلا

قصاص علیہ"(۳۴)

(کوئی شادی شدہ شخص اس کی یا دوسرے کی بیوی سے زنا کر رہا ہو اور آدمی کی چیخ پکار کے باوجود نہ تو زنا سے باز آتا ہے اور نہ بھاگتا ہے تو اس آدمی کے لیے ایسے شخص کو قتل کرنا جائز ہے۔ اگر وہ اسے قتل کر دے تو اس پر کوئی قصاص نہیں۔)

یہی مؤقف شافعی فقہ کی "مغنی المحتاج" میں مصنف نے اختیار کیا ہے۔(۳۵)

کنز الدقائق میں ہے:

"اصولی بات یہی ہے کہ بدکاری کرتے ہوئے مسلمان کو قتل کرنا ہر شخص کے لیے جائز ہے۔ البتہ اگر اس امر کا اندیشہ ہو کہ وہ اس بدکاری کا ثبوت پیش نہیں کر سکے گا تو ایسی صورت میں اس کے لیے یہ قتل ممنوع ہے۔۔۔ اس طرح کا معاملہ جرأت سے ظلم کرنے والوں اور راہزنوں وغیرہ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔۔۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ معصیت کے وقت اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ البتہ وقوعہ کے بعد اس (کی سزا) کا اختیار صرف حاکم وقت کے پاس ہے کیونکہ اگر تو کوئی شخص مجرم کو بوقت جرم روکنے کے لیے انتہائی اقدام کرتا ہے تو اس وقت تو یہ درست ہے اور "نہی عن المنکر" کی بنا پر نیکی کا کام ہی شمار ہوگا لیکن وقوعہ کے بعد "نہی عن المنکر" کا معاملہ تو ختم ہو گیا۔"(۳۶)

ائمہ اربعہ کے ہاں حکم یہی ہے کہ اگر ایک شخص اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر شخص کو مشغول دیکھے تو اس شخص کو دیانۃً قتل کر سکتا ہے۔ وہ اسے تغییر المنکر کے تحت داخل کرتے ہیں۔(۳۷)

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"فقہاء اربعہ (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ) کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کوئی شخص اپنی جان، مال، آبرو کی حفاظت کے لیے قتل تک کر دے تو مقتول کا خون رائیگاں جائے گا۔"(۳۸)

جسٹس عبدالقادر عودہ کے مطابق اسلامی معاشرے میں "نہی عن المنکر" کی حیثیت مستحب یا فرض کفایہ کی بجائے فرض کی ہے جس کی ادائیگی بہرصورت لازمی ہے اور یہ معاشرہ کے تمام افراد کے لیے لازمی ہے۔ جسٹس عبدالقادر عودہ حملہ آور کی مدافعت کی کچھ شرائط بیان کرتے ہیں، جن کا پورا ہونا ضروری ہیں۔ یہ شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ اعتداء اور عدوان (لاقانونیت) موجود ہو۔

۲۔ اعتداء عملاً واقع ہو

۳۔ اس اعتداء (زیادتی) کو کسی اور طریقہ سے روکنا ممکن نہ ہو

۴۔ اس اعتداء کو اس قوت سے روکا جائے جو اس کے روکنے کے لیے ناگزیر ہو۔(۳۹)

دفاع کے اس تصور، جس پر خلفائے راشدین نے فیصلے دیے ہیں اور فقہاء کرام نے شرعی مؤقف

کے طور پر اسے اختیار کیا ہے، کو اگر نبی کریم ﷺ کے حضرت سعد بن عبادہ کے مکالمے کے ساتھ ملایا جائے تو بظاہر اس میں تضاد نظر آتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بھی سعد بن عبادہؓ کو دورانِ فعل ہی اس بدکاری کے لیے قتل کرنے سے منع کیا تھا۔

۳۔ تیسرا مؤقف حنابلہ کا ہے جس میں علامہ ابن تیمیہؒ بھی شامل ہیں۔ان کی نظر میں یہاں مسئلہ قاتل کو حملہ آور سے دفاع کا مسئلہ درپیش نہیں بلکہ کسی مسلمان کی عزت میں دخل اندازی کرنے والے کی سزا ہی یہ ہے کہ اسے قتل کیا جائے کیونکہ ایسے آدمی کا یہی انجام ہونا چاہیے۔اس مؤقف کے مطابق نہ تو دورانِ فعل روکنے والے کو تدریج سے روکنے کی ضرورت ہے اور نہ بعداز فعل اس کو قتل کرنے والا انتظامی سزا کا حق دار ہوگا۔البتہ یہ ضرور ہے کہ اسے اس وقوعہ کو قانونی طریقہ پر ثابت کرنا ہوگا۔علامہ ابن تیمیہؒ اس مسئلہ کو اس جرم کی سزا کے باب سے قرار دیتے ہیں،فرماتے ہیں:

''**ليس هذا من باب دفع الصائل بل من باب عقوبة المعتدى المؤذى وعلى هذا فيجوز له فيما بينه و بين اللّٰه تعالىٰ قتل من اعتدىٰ على حريمه سواء كان محصناً أو غير محصن معروفا بذلك أو غير معروف كما دلّ عليه كلام الأصحاب وفتاوى الصحابة**''[۴۰]

(اس مسئلہ کا تعلق حملہ آور کے دفاع کی قبیل سے نہیں بلکہ اللہ کی حد سے بڑھنے والے اور مسلمان کی عزت میں دخل دینے والے ظالم مجرم کی سزا سے ہے۔ایسے شخص کے لیے اپنی بیوی سے بدکاری کرنے والے کو قتل کرنا حلال ہے اور یہی اس کی سزا ہے جس میں شادی شدہ یا غیر شادی ہونے کا کوئی فرق نہیں، نہ ہی اس امر کا کہ وہ (زانی شخص) اس فعل بد کی شہرت رکھتا ہے یا نہیں،جیسا کہ ہمارے حنابلہ کا کلام اور صحابہ کے فتاویٰ اسی پر دلالت کرتے ہیں۔)

حنابلہ کا یہ کہنا اسی مؤقف کی بنا پر ہے کہ ایسی صورت میں ثبوت واقعہ کے لیے صرف دو اشخاص کافی ہیں کیونکہ مسئلہ زنا کا نہیں بلکہ وقوعہ کے ثبوت کا ہے۔اسی موقف کی رو سے مجرم کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ایسے مجرم کو روکنے میں تدریج اختیار کرنا بھی لازمی نہیں کیونکہ ایسے جرم کی یہ ایک مستقل سزا ہے۔علامہ ابن تیمیہؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس اجنبی شخص کو پالے اور اس بنا پر اس کو قتل کردے تو کیا ایسی صورت میں اس پر بیوی کی دیت عائد ہوتی ہے؟ تو ابن تیمیہ نے فرمایا:

''اگر تو اس آدمی نے ان دونوں کو بدکاری کی حالت میں دیکھ لیا اور اس امر کے باوجود کہ وہ شخص (قاتل) ان دونوں کو بات چیت کے ذریعے اس فعل بد سے روکنے پر قادر ہو،اس نے اپنی بیوی کو قتل کردیا تو ایسی صورت میں اکثر علماء کے خیال میں عنداللہ اس پر کوئی دیت عائد نہیں ہوتی۔حنابلہ کا مشہور ترین موقف بھی یہی ہے جس کی دلیل

صحیحین میں نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پر کوئی تاوان عائد نہیں ہوتا۔ اسی سے ملتا جلتا نبی کریم ﷺ کا واقعہ ہے کہ ''نبی کریم ﷺ کے گھر میں ایک شخص نے جھانکا تو آپ ﷺ نے چبھنے والی کسی شے سے اس کی آنکھ پھوڑنے کی کوشش کی۔ اگر وہ اس کو لگ جاتی تو لازماً اس کی آنکھ ضائع ہو جاتی۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اجازت لینے کا مقصد یہی ہے کہ جھانکنے سے باز رہا جائے۔ یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ اس شخص کو کلام کے ذریعے (جھانکنے سے) روک سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دور میں پیش آیا۔۔۔۔

یہاں بعض علماء کی رائے ہے کہ قاتل سے یہ سزا اس صورت میں ہی ساقط ہو گی جب زانی شخص شادی شدہ ہو اور قاتل کے لیے مقتولہ کا خاوند ہونا یا نہ ہونا کوئی ضروری نہیں۔ یہ مؤقف امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھیوں نے اختیار کیا ہے۔ (میرے) اس مؤقف کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ اس آدمی نے اس شخص (قاتل) کی عزت وحرمت پر دست درازی کی تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھ غلط جگہ دیکھنے والے کی آنکھ کا سا سلوک ہونا چاہیے یا اس آدمی جیسا سلوک جس نے اپنا ہاتھ کاٹ کھانے والے کے منہ سے کھینچا تو کاٹنے والے کے دو اگلے دانت ٹوٹ گئے تو نبی کریم ﷺ نے ان دانتوں کا قصاص رائیگاں قرار دیا اور فرمایا ''کیا وہ تیرے منہ میں اپنا ہاتھ باقی رہنے دیتا تاکہ تو اسے سانڈ کی طرح چباتا رہتا۔'' یہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے موقف والوں کی پہلی دلیل ہے۔ جن علماء نے اس موقف کو اختیار نہیں کیا، ان کا خیال ہے کہ دفاع دیگر آسان اقدامات سے بھی ہو سکتا ہے اور اس سلسلے میں نص کا لحاظ رکھنا چاہیے لیکن اس نص کے مفہوم میں جدید وقدیم علماء میں اختلاف ہے۔ ایک مرتبہ عبداللہ بن عمرؓ کے گھر میں چور آ داخل ہوا تو آپؓ تلوار لے کر اس کی طرف لپکے اور عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم آپؓ کو پکڑ نہ لیتے تو لازمی تھا کہ آپ تلوار سے مار دیتے۔ امام احمد بن حنبل نے سابقہ احادیث کے ساتھ اس واقعہ کو بھی اپنے موقف کی دلیل بنایا ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ مضروب شخص نے عملی طور پر بدکاری کا ارتکاب نہ کیا ہو لیکن وہ داخل اس نیت سے ہوا ہو تو ایسی صورت میں بھی علماء کے مختلف موقف ہیں جن میں سے محتاط ترین موقف یہی ہے کہ ایسے قتل کی صورت میں قاتل اللہ سے ہی توبہ کر لے۔ جہاں تک ایسے قتل کی دیت ادا کرنے کا تعلق ہے تو اس کا دیت ادا کرنا زیادہ محتاط رویہ ہے۔ یاد رہے کہ دیت قتل خطا میں عائد ہوتی ہے۔ جہاں تک قتل عمد کا تعلق ہے تو جمہور علماء کے مطابق اس قتل پر دیت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے دوسرے موقف کے مطابق دیت ادا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔''[۴۱]

عزت میں دخل اندازی کی اہمیت کا اس امر سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی آدمی کا ستر دیکھنے پر بھی اتنی سنگین سزا نہیں جتنی مسلمان کے گھر اور اس کی عزت جھانکنے پر ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی درج بالا

عبارت کے پیشِ نظر کسی کے حرم میں بدکاری کی سزا بھی اتنی ہی سنگین ہوگی چہ جائیکہ وہ سزا قتل تک بھی پہنچ جائے۔ علامہؒ اپنے موقف کی تائید میں حضرت عمرؓ کا واقعہ بھی پیش کرتے ہوئے یہ اشارہ دیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے قاتل کو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آئندہ ایسے ہو تو پھر یہی کرنا۔ اس لیے قاتل کو زبان سے روکنے یا بھگانے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی سزا ہی یہ ہے اور یہ سزا دینے والا کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔

۴۔ جدید قانونی تصور کی رو سے ایسا قتل جو اشتعال کی حالت میں کیا جائے، اس کو ارادتاً قتل کے بجائے قتل خطا سمجھا جائے کیونکہ اس میں قاتل کا عزم شامل نہیں تھا۔ یہ قانون متعدد اسلامی ممالک میں نافذ العمل ہے اور امریکہ و یورپ میں فوری اشتعال کے مجرموں کو خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔

نتیجہ بحث

نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ایسے فعل کی اجازت نہ دینے کی وجہ غلبۂ خیر تھا، لوگوں میں خوفِ خدا زیادہ تھا اور اس وقت لوگوں کے پیشِ نظر مادیت کے بجائے روحانیت میں مسابقت تھی۔ آپ ﷺ نے ایسے قتل سے اس لیے بھی منع فرمایا کہ کہیں لوگ اس کو پھر ایک وطیرہ ہی نہ بنا لیں اور نشہ اور غیرت میں آ کر دھڑا دھڑ قتل نہ کرنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی سرحدیں بہت وسعت اختیار کر گئی تھیں اور لوگ بہت تیزی سے اس میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔ ان شامل ہونے والے افراد میں ہر طرح کی فطرت کے افراد تھے۔ اس عہد میں اس قتل کو اس لیے سنگین نہیں سمجھا گیا کہ کہیں بدفطرت لوگ دوسروں کی عزت و ناموس کو برباد کرنا اپنا حق نہ سمجھ لیں اور معاشرے میں انارکی اور بے حیائی نہ فروغ پا جائے اور اسلام کے تصورِ حیاء پر آنچ نہ آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی فرد اس الزام میں قتل کر دیتا تو عہدِ خلفائے راشدین میں اس کی خلاصی اس وقت تک نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ ایسا حقیقت میں کچھ ہوا تھا۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کے پاس وہ طاقت اور وجاہت نہیں اور نہ ہی ان کے پاس اب دنیا کی حکمرانی ہے۔ اس لیے دورِ حاضر میں داخلی اور بین الاقوامی حالات کے پیشِ نظر ایسے قتل کی اجازت دینا درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح پھر لوگ اپنی دشمنیاں نبھانے کی خاطر شریعتِ اسلامیہ کا نام استعمال کریں گے اور اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا سبب بنیں گے۔ اگر نہی عن المنکر کے تحت عام شخص کو قتل کرنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر ہر قاتل قتل کے بعد یہی کہے گا کہ اس نے غیرت و حمیت، کفر اور ارتداد کے باعث دوسرے کو قتل کیا ہے جس کے نتیجے میں بہت بڑا فساد اور بدامنی برپا ہو جائے گی۔ اس قتل کی دیانتہً اجازت دینے سے پہلے بھی معاشرے کی تربیت انتہائی ضروری ہے، جس کے لیے ہمیں اپنے تعلیمی نظام کے بنیادی ڈھانچے کو اسلامی تعلیمات پر استوار کرنا چاہیے۔ فوری اور سستے انصاف کی عدم دستیابی کی بدولت لوگ اپنے معاملات کو خود ہی حل کرنا چاہتے ہیں جس کی بدولت معاشرے میں فتنہ و

فساد، انارکی اور بدامنی رواج پاتی ہے، اس لیے حکومت کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے تا کہ لوگوں کا عدالتوں پر اعتماد بحال ہو اور وہ ہر قسم کے معاملات، خواہ وہ غیرت کے ہوں، عدالتوں کے ذریعے حل کریں۔ غیر شرعی تمام رسوم، کاروکاری، سیہ کاری اور تورہ تورہ وغیرہ پر پابندی اور غیر قانونی ہونے کے قانون پر سختی سے عمل کرایا جائے۔ حکومت کو ایسی قانون سازی کرنی چاہیے جو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہو اور پھر اس پر عمل درآمد کرانا بھی حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے تا کہ ملک میں امن وامان قائم ہو سکے۔

پاکستان میں قتلِ غیرت سے متعلق قانون سازی

۸/اکتوبر ۲۰۰۴ء میں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی نے قتلِ غیرت سے متعلق قانون سازی کی حمایت کرتے ہوئے ترمیم تجاویز پاس کر کے قومی اسمبلی میں بحث کے لیے پیش کر دی جسے ۲۷/اکتوبر کو منظور کر لیا گیا۔ اور اسے سینیٹ میں بھیج دیا گیا۔ سینیٹ سے منظوری کے بعد صدرِ پاکستان کے دستخط کے بعد ۴ جنوری ۲۰۰۵ کو یہ باقاعدہ قانون بن گیا اور اسے ''قانون فوجداری ایکٹ ۲۰۰۴ء'' کا نام دیا گیا ہے۔

تعزیراتِ پاکستان (پاکستان پینل کوڈ مجریہ ۱۸۶۰) کی دفعہ (i)۲۹۹ کے بعد ایک نئی دفعہ (ii) کا اضافہ کیا گیا ہے جس کے مطابق:

> ''(آئی آئی): جرائم غیرت سے مراد ایسے جرائم ہیں جو غیرت یا عزت کے نام پر کیے جائیں یا غیرت اور بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے جن کا ارتکاب کیا جائے۔ ان جرائم میں قتل غیرت کے علاوہ کاروکاری، سیاہ کاری اور ایسی ہی دوسری مماثل رسومات شامل ہیں۔''

قتلِ غیرت میں ''قتلِ عمد'' ثابت نہ ہونے کے باوجود بھی اسے تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ میں شامل کر دیا گیا اور یہ چیز واضح کر دی گئی کہ یہ قتل دفعہ ۳۰۲ کی ذیلی دفعہ (a) ''قصاص'' یا (b) ''عمر قید'' کے دائرے میں شمار کیا جائے گا۔

> "Provided that nothing in this clause shall apply to the offence of Qatl-i-Amd if committed in the name or on the pretext of honour and the same shall fall within the ambit of clause (a) or clause (b), as the case may be."

درج بالا قانون سازی کرتے وقت عدل وانصاف، فطرتِ انسانی اور نفسیات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا اور ایسا قتل جو اشتعال میں آ کر کیا گیا اور جہاں کہیں ''قتلِ عمد'' کے آثار نہ بھی ملتے ہوں، تب بھی اس کی سزا ''قتلِ عمد'' کی قرار دی گئی اور زانی مقتول کو بھی معصوم مقتول کا درجہ دیا گیا۔ اس ترمیم کے مطابق اب ایسے مجرم کو محض سزائے موت یا عمر قید ہوگی تو ملیحہ ضیاء کہتی ہیں کہ سزائے موت ہی بہترین سزا ہے لیکن

یہ بے سود ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ سزا کا تو کہہ دیا گیا کہ وہ سزائے موت یا عمر قید ہوگی مگر کم سے کم سزا بیان نہیں کی گئی جو کہ ہر صورت میں بیان کرنی چاہیے تھی۔ عدالتیں غیرت کے جرائم میں سخت سزا دینے سے ہچکچاتی ہیں اور قانون میں اس دفعہ سے اب جرم تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا۔ لکھتی ہیں:

"With regard to penalties, the only penalties for 'honour' killings (if there is no compromises) are (a) death or life imprisonment (i.e 25 years) as tazir. While the intention of providing a higher penalty may be good one, this has proved to be counter-productive. Where courts are already reluctant to give harsh punishments in cases of 'honour' crimes, laying down a minimum of 25 years or death may discourage them from conviction in these cases, just as the mandatory death penalty in gang rape cases makes conviction near impossible. There is no mandatory minimum sentence for 'honour killings' irrespective of the relation of the prepetrator to the victim."(42)

غیرت کے نام پر قتل کے بعد جب قصاص دینے کی نوبت آتی ہے تو قاتل پارٹی مقتول کے خاندان کو اس بات پر راضی کر دیتی ہے کہ اس کے بدلے وہ اپنے گھر سے لڑکی کی شادی کرنے کو تیار ہے اور اس طرح قاتل قصاص سے بچ جاتا ہے، اسے ''بدلِ صلح'' کا نام دیا جاتا ہے۔ دفعہ 310 A میں بدلِ صلح کے طور پر عورت کی شادی کر دینا جرم ہے اور اس کی سزا 10 سال قید با مشقت یا کم سے کم تین سال قید با مشقت ہوگی۔ ملیحہ ضیاء اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی کہ یہ ایک مثبت اقدام ہے لیکن ضرورت اس بات کی ابھی باقی ہے کہ اس ''بدلِ صلح'' میں تمام افراد کے لیے سزا رکھی جائے۔

"While it is positive that the issue of giving a woman in marriage of otherwise as badl-i-sulah has been specifically forbidden, this also needs to be accompanied with a penalty for all offenders."(43)

دفعہ ۳۱۱ تعزیراتِ پاکستان میں قتلِ غیرت کو ''فساد فی الارض'' میں شامل کیا گیا جس کے مطابق کم از کم سزا ۱۰ سال مقرر کی گئی ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے ملیحہ ضیاء لکھتی ہیں:

"While 'honor' killing has been included in the

definition of fasad-fil-ard and a minimum penalty of 10 years as tazir laid down (with a maximum of 14 years), the awarding of a penalty in cases where the right of qisas has been waived or compounded has been left completely at the discretion of the court. As in the past, this provides the loophole for murderers to get away with minimal or no penalty."[44]

اگر کسی عورت کو غیرت کی وجہ سے اشتعال یا بغیر اشتعال کوئی ضرب لگ جائے تو یہ جرم اضافہ شدہ 337 A کی وجہ سے نا قابل راضی نامہ بن گیا ہے اور اب اس کی رو سے مضروب عورت کو معافی یا راضی نامہ کا حق حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 338 کی ذیلی دفعہ (1) کے آخر میں یہ الفاظ شامل کیے گئے ہیں:

"Provided further that where an offence under this Chapter has been committed in the name or on the pretext of honour, such offence may be waived or compounded subject to such conditions as the Court may deem fit to impose with the consent of the parties having regard to the facts and circumstances of the case."

درج بالا دفعہ کے مطابق قتل کی ان تمام صورتوں میں جو غیرت کی وجہ سے یا عزت و ناموس کے نام پر کیے جاتے ہیں، ان سب کو نا قابل معافی اور نا قابل راضی نامہ بنا دیا گیا ہے، جو کہ قرآن وسنت سے متصادم ہے۔ اس طرح انہوں نے (F) 338 کو بھی اپنی ترمیم کا نشانہ بنا لیا ہے جس کے مطابق عدالتوں کو جرائم سے متعلقہ تمام دفعات کو قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی حاصل کر کے ان کی تعبیر اور تشریح کا حق حاصل تھا۔ لیکن اگر (F) 338 کو ختم کیا جائے تو آرٹیکل 2، 2-A ,203,227,31 جو سارے دستور کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں، کو کہاں لے جائیں گے۔ آرٹیکل 2 کے مطابق ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ 2.A کی رو سے ریاست اور حکومت مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن وسنت پر عمل کرانے کی پابند ہے۔ 31 کی رو سے ہر مسلمان کو اسلامی طرزِ حیات اختیار کرنا ہوگا۔ آرٹیکل (D)203 نے فیڈرل شریعت کورٹ کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ ہر اس قانون کو جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو، کالعدم قرار دے اور پھر آرٹیکل 227 کی رو سے موجودہ تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے گا اور پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جا سکتا۔ جبکہ درج

بالا قانون سازی میں اس چیز کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

دور قدیم میں تصور یہ تھا کہ حق مدافعت طبعی قانون سے حوالے سے تو مفید ہے مگر وضعی قانون کے حوالے سے درست نہیں ہے۔ قرونِ وسطیٰ (Middle Ages) میں مدافعت کو ایسی حالت متصور کیا گیا جو سزا سے تو نہیں روکتی تھی البتہ سزا معاف ہوسکتی تھی۔ اٹھارویں صدی میں مدافعت کی یہ تعبیر ہوئی کہ یہ ایک حالت ضرورت ہے جو انسان کے لیے اس چیز کو جائز کر دیتی ہے کہ وہ اپنی جان کا تحفظ خود کر سکے۔ انیسویں صدی میں یہ تصور آیا کہ مدافعت ایک حالت مجبور ہے کیونکہ اس حالت میں مدافع کے سامنے موجود خطرہ اسے بے اختیار بنا دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے تحفظ کے لیے اپنی جبلت سے کام لیتا ہے۔ مروجہ قوانین کی جدید ترین رائے یہ ہے کہ مدافعت اپنے اس حق کا استعمال ہے جس کی قانون نے اجازت دی ہے بلکہ مدافعت فرض کی ادائیگی ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان کا حق بلکہ فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کی حفاظت اور اپنے مال کا بچاؤ کرے اور یہ بھی ہے کہ مدافع کو سزا دینے میں معاشرے کا کوئی مفاد نہیں ہے کیونکہ مدافع ایسا مجرم نہیں ہے جس کے شر سے معاشرے کو محفوظ کیا جائے۔ تو پھر قتلِ غیرت پر اتنا واویلا کیوں؟ کیا یہ بھی عزت کے ضمن میں self-defence کے زمرے میں نہیں آئے گا؟

حوالہ جات

۱۔ مجدالدین محمد بن یعقوب، ''القاموس المحیط''، ۱۰۶/۲، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

۲۔ نسائی، احمد بن علی، ''سنن النسائی''، کتاب الزکوۃ، باب المنان بما أعطی، ح: ۲۵۶۳

۳۔ کتاب مقدس، احبار، ۲۰: ۱۰، بائبل سوسائٹی، لاہور

۴۔ احبار، ۲۰: ۱۱

۵۔ احبار، ۲۰: ۱۲

۶۔ احبار، ۲۰: ۱۸

۷۔ احبار، ۲۱: ۹

۸۔ استثناء، ۲۲: ۲۲

۹۔ استثناء، ۲۲: ۲۴۔۲۳

۱۰۔ احبار، ۲۰: ۶

۱۱۔ استثناء، ۲۲: ۲۹۔۲۸

12. Christopher Hibbert, The Roots of Evil, p. 4, Little, Bown and company, Boston, Toronto

13. Gresham M. Sykes, Criminology, p: 72, Harcourt Brace Jovanovich, Inc. New York.

14. http://avalon.law.yale.edu/20th_century/unrights.asp
15. Sewell Chan, Is Adultery a Crime in New York, New York Times, 21 March, 2008. New York.
16. Sewell Chan, Ibid, New York Times.

۱۷۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، ''صحیح بخاری''، ح:۴۷۴۷، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض
۱۸۔ مسلم بن حجاج، ''صحیح مسلم''، کتاب اللعان، ح۳۷۴۶ ، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض
۱۹۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، ''صحیح بخاری''، ح:۴۷۴۵
۲۰۔ مسلم بن حجاج، ''صحیح مسلم''، ح:۳۶۵۱
۲۱۔ مسلم بن حجاج، ''صحیح مسلم''، کتاب اللعان، ح:۳۶۵۲
۲۲۔ مسلم بن حجاج، ''صحیح مسلم''، کتاب اللعان، ح:۳۶۵۳
۲۳۔ مسلم بن حجاج، ''صحیح مسلم''، کتاب اللعان، باب ح:۳۶۵۴
۲۴۔ محمد رواس قلعہ جی، ''فقہ عمرؓ''، ص۲۱۳، ادرۂ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۴ء
۲۵۔ مقدسی، عبداللہ بن احمد، ''المغنی''، ۴/۲۶۲، دارالفکر، بیروت
۲۶۔ محمد رواس قلعہ جی، ''فقہ عمرؓ''، ص۲۱۴
۲۷۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم بن محمد، ''البحر الرائق شرح کنز الدقائق''، ۵/۴۴، دارالکتاب الاسلامی، ریاض
۲۸۔ الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیہ :۳۱/۳۴۱، دارالصفوہ، مصر
۲۹۔ مسلم بن حجاج، ''صحیح مسلم''، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان
۳۰۔ عبدالباسط خان، مفتی، ''جدید فقہی مسائل اور فقہائے پاک و ہند کے اجتہادات''، ص۱۴۵ـ۱۴۴، شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۳۱۔ عبدالقادر عودہ، ''اسلام کا فوجداری قانون'' (مترجم)، ج۱، ص۵۶۶، اسلامک پبلی کیشنز، لمیٹڈ، لاہور
۳۲۔ محمد رواس قلعہ جی، ''فقہ حضرت علیؓ''، ص۲۱۴، ادرۂ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۴
۳۳۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم بن محمد، ''البحر الرائق شرح کنز الدقائق''، ۵/۴۴، دارالکتاب الاسلامی، ریاض
۳۴۔ محمد بن احمد الخطیب الشربینی، ''مغنی المحتاج الی معرفۃ المعانی الفاظ المنہاج''، ۵/۵۳۰ ، دارالکتب العلمیہ
۳۵۔ کنز الدقائق، ۵/۴۵
۳۶۔ مقدسی، عبداللہ بن احمد، ''المغنی''، ۹/۱۵۴ـ۱۵۳، دارالفکر، بیروت
ابن قدامہ، عبدالرحمٰن بن محمد، ''الشرح الکبیر''، ۴/۳۵۷، دارالکتاب العربی للنشر والتوزیع
ابواسحاق، ابراہیم بن علی، ''المہذب''، ۲/۲۲۵، دارالکتب العلمیہ، دمشق
۳۷۔ وہبہ زوحیلی، ''الفقہ الاسلامی وادلتہ''، ج۵، ص۷۵۹، دارالفکر، دمشق

۳۸۔ عبدالقادرعودہ،''اسلام کا فوجداری قانون''(مترجم)،ج ا،ص ۵۷۰

۳۹۔ ابن قیم،محمد بن ابی بکر،''زادالمعاذ''،ج ۵،ص ۴۰۶،مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت

۴۰۔ ابن تیمیہ،احمد بن عبدالحلیم (م ۷۲۸ھ)،''مجموع فتاویٰ''،۳۴/۱۶۹۔۱۶۸،مجمع الملک فہد،المدینۃ النبویہ،سعودی عرب

41. Maliha Zia Lari, "Honour Killings' in Pakistan and Compliance of Law", p: 34-35, Aurat Foundation

42. Ibid, p: 35

43. Ibid, p: 33

مصادرومراجع

۱۔ القرآن الکریم

۲۔ ابواسحاق،ابراہیم بن علی،''المہذب''،دارالکتب العلمیہ،دمشق

۳۔ بخاری،محمد بن اسماعیل،''صحیح بخاری''،دارالسلام للنشر والتوزیع،ریاض

۴۔ ابن تیمیہ،احمد بن عبدالحلیم (م ۷۲۸ھ)،''مجموع فتاویٰ''،مجمع الملک فہد،المدینۃ النبویہ

۵۔ عبدالباسط خان،مفتی،''جدید فقہی مسائل اور فقہائے پاک وہند کے اجتہادات''،شیخ زاید اسلامک سنٹر،پنجاب یونیورسٹی،لاہور

۶۔ عبدالقادرعودہ،''اسلام کا فوجداری قانون''(مترجم)،اسلامک پبلی کیشنز،لمیٹڈ،لاہور

۷۔ ابن قدامہ،عبدالرحمٰن بن محمد،''الشرح الکبیر''،دارالکتاب العربی للنشر والتوزیع،ریاض

۸۔ ابن قیم،محمد بن ابی بکر،''زادالمعاذ''،مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت

۹۔ کتاب مقدس،بائبل سوسائٹی،لاہور

۱۰۔ ''ماہنامہ محدث''،مجلس تحقیق اسلامی،لاہور

۱۲۔ مجدالدین محمد بن یعقوب،''القاموس المحیط''، مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت

۱۳۔ محمد بن احمد الخطیب الشربینی،''مغنی المحتاج الی معرفۃ المعانی الفاظ المنہاج''،دارالکتب العلمیہ

۱۴۔ محمد رواس قلعہ جی،''فقہ حضرت عمرؓ''،ادارۂ معارف اسلامی،لاہور،۱۹۹۴ء

۱۵۔ محمد رواس قلعہ جی،''فقہ حضرت علیؓ''،ادارۂ معارف اسلامی،لاہور،۱۹۹۴ء

۱۶۔ مسلم بن حجاج،''صحیح مسلم''،دارالسلام للنشر والتوزیع،ریاض

۱۷۔ مقدسی،عبداللہ بن احمد،''المغنی''،دارالفکر،بیروت

۱۸۔ ''الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیہ''،دارالصفوہ،مصر

۱۹۔ ابن نجیم،زین الدین بن ابراہیم بن محمد،''البحرالرائق شرح کنزالدقائق''،دارالکتاب الاسلامی،ریاض

۲۰۔ نسائی، احمد بن علی، ''سنن النسائی''، دارالسلام للنشر والتوزیع، ریاض
۲۱۔ وہبہ زحیلی، ''الفقہ الاسلامی وادلتہ''، دارالفکر، دمشق
22. Christopher Hibbert, The Roots of Evil, Little, Bown and company, Toronto
23. Gresham M. Sykes, Criminology, Harcourt Brace Jovanovich, Inc. New York.
24. Maliha Zia Lari, "Honour Killings' in Pakistan and Compliance of Law", Aurat Foundation
25. New York Times, New York.
26. http://avalon.law.yale.edu/20th_century/unrights.asp

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور علم السیَر

ڈاکٹر زیبا افتخار☆

Abstract:

"Seerah of the Holy Prophet MOHAMMAD (ﷺ) is the Seerah of perfect human personality, unprecedented role model for the whole mankind. So it becomes most important to write and study regarding the Seerah. There are thousands of people who contributed in the vast field of Seerah writing for centuries. Dr. Hameed Ullah is one of those noble names whose work is well known contribution towards Islam. He is known by his unique style and deep scholarly approach in this regard. The following article throws light on his approach about the science of Seerah."

Key words: Study of Seerah, Perfect human personality, Seerah Writing, Science of Seerah, Dr. Hameed Ullah.

تقریباً تمام دانشورانِ عصر نے، جنہوں نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ان کے کام کو کثیر الجہتی (Multi-dimensional) قرار دیا ہے، کہ انہوں نے تحقیق کے میدان میں بڑے معرکے کی چیزیں پیش کیں۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے متنوع اسلامی موضوعات پر اپنی محققانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا، خواہ وہ میدان، تدوین حدیث کا ہو یا تدوین فقہ کا، علم السیر کا ہو یا سیرت نگاری کا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ان کی تحقیقاتِ علمی کو مختلف خانوں میں بانٹ کر ان کو کسی ایک زاویہ سے زیادہ بڑا یا کسی دوسرے زاویے سے کم اہم ثابت کرنا چاہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک لا حاصل بحث ہوگی، ان کا ہر کام، دوسرے کام سے مربوط ہے، جسے علیحدہ کرنے کی صورت میں ڈاکٹر صاحب کی اصل علمی و تحقیقی دین (contribution) کی وضاحت نہیں ہو سکے گی۔ معاملہ خواہ سیرت نگاری کا ہو یا علم السیر کا، تاریخ تدوین حدیث کا ہو یا تاریخ تدوین فقہ کا، یہ سارے موضوعات ''اسلامی تاریخ'' کے موضوعات ہیں اور ڈاکٹر حمید اللہ ان پر یکساں گرفت رکھتے تھے۔ بادی النظر میں

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، کراچی

کثیرالجہتی نظر آنے والا یہ کام، بنیادی طور پر ''اسلامی تاریخ'' پر کیا جانے والا ان کا وہ کام ہے جو بلاشبہ وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک مورخ اور ایک قانون دان تھے۔ لہٰذا اسلامی تاریخ اور اسلامی قانون کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ وہ ایک نیا رجحان (trend) بنانے میں کامیاب ہوئے بلکہ اسے علمی دنیا، خصوصاً مستشرقین سے منوایا بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں ہندوستان (جہاں وہ پیدا ہوئے) میں اتنے لوگ نہیں جانتے، جتنے کہ یورپ میں جانے جاتے ہیں۔

بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی علمی زندگی کے ابتدائی پندرہ بیس سال خصوصاً، بعدازاں پوری زندگی عموماً علم السیر (اسلامی بین الاقوامی قانون) کی تحقیق میں صرف کیے۔ اس موضوع کو انہوں نے ڈی۔فل، ڈی لٹ اور پی ایچ۔ڈی کی ڈگریوں کے لیے چنا، جامعہ عثمانیہ میں وہ شعبہ دینیات کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے، بی اے اسی شعبہ سے کیا، مگر ایم اے کی کلاسیں انہوں نے بیک وقت شعبہ دینیات اور شعبہ قانون میں ایک ساتھ لینا شروع کیں۔ بین الاقوامی سطح پر تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے پیش نظر جامعہ عثمانیہ کا شعبہ قانون بھی متحرک تھا اور وقت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے خدمات انجام دے رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) قائم ہوئی اور بین الاقوامی قوانین پر پھر سے بحث و مباحثہ کا دروازہ کھلا، تو جامعہ عثمانیہ کے کلیہ قانون کے سربراہ، پروفیسر حسین علی مرزا کی کوششوں سے ایل ایل بی کے نصاب میں '' Public International Law'' کو لازمی کورس کے طور پر متعارف کرایا گیا۔ اس فیصلے کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ پہلے بیچ (batch) کے طالب علم تھے، اور ایک ہی سال میں یعنی ۱۹۳۰ء میں ایم اے دینیات اور ایل ایل بی کی ڈگریاں ایک ساتھ حاصل کیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب انہوں نے بین الاقوامی قانون کا مطالعہ کیا تو انہیں یہ اسلامی تاریخ اور اسلامی فقہ سے ملتا جلتا محسوس ہوا۔ اس بارے میں انہوں نے اپنے استاد حسین علی مرزا سے گفتگو کی، جن کی حوصلہ افزائی پر انہوں نے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور متعدد مضامین تحریر کر ڈالے۔[۲] یہ بین الاقوامی قانون سے ان کی دلچسپی کا آغاز تھا۔ اس کے بعد اسی موضوع پر انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہا۔ جس کی انہیں اجازت مل گئی لیکن اس موضوع پر حیدر آباد دکن کی لائبریریوں میں تسلی بخش مواد موجود نہ تھا۔ ان کی جامعہ نے انہیں دنیا کی دیگر لائبریریوں میں جا کر مواد اکٹھا کرنے کی اجازت دی تو انہوں نے حجاز، شام، فلسطین، مصر اور ترکی کا سفر کیا اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کا مواد اکھٹا کیا۔ جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر صاحب کو کمال مہربانی سے وظیفہ دیا تاکہ اپنے تحقیقی سرمائے پر کام کر سکیں۔ یہاں سے ڈاکٹر صاحب بون (جرمنی) پہنچے جہاں انہوں نے صرف نو ماہ میں یعنی اگست ۱۹۳۳ء میں اپنی تھیسس کا صرف ایک حصہ (جو غیر جانبداری کے اصولوں سے متعلق تھا) پیش کر کے ڈی فل کی ڈگری حاصل کر لی۔[۳]

ان کے مقالے کا عنوان Die Neutralitate in Islamischan

Voelkerrecht orthodoxes ''یعنی ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات میں غیر جانبداری کے اصول'' تھا۔ چونکہ ان کو جامعہ عثمانیہ سے ملنے والے وظیفے کی رقم ابھی باقی تھی لہٰذا وہ پیرس (فرانس) چلے گئے اور یہاں سے انہوں نے ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری لی۔ اس بار ان کے مقالے کا عنوان Documents sur ladiplomatic musullmna'e'epoqe de Prophete at de Khiliphes یعنی ''عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں اسلامی سفارت کاری'' تھا۔(۴)

وظیفے کی رقم ختم ہونے پر وہ واپس حیدرآباد دکن آئے اور ایک بار پھر جامعہ عثمانیہ سے منسلک ہوگئے۔ وہ یہاں ''قانون بین الممالک'' کے استاد مقرر ہوئے۔ اس وقت اس موضوع پر انگریزی کی چند کتابیں دستیاب تھیں۔ تاہم ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ''بیس برس قبل لکھی گئی یہ کتابیں، عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔(۵) جبکہ اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے طلباء کی ضرورتوں کے پیشِ نظر محض پچیس دنوں میں اس موضوع پر اردو کی پہلی کتاب ''قانون بین الممالک کے اصول ونظریں'' کے نام سے لکھی، جس کا پہلا ایڈیشن، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد سے ۱۹۳۶ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔

گویا اپنی اعلیٰ تعلیم کے سالوں میں اور تدریس کے ابتدائی سالوں میں ڈاکٹر صاحب کا اصل میدانِ تحقیق ''اسلامی قانون بین الممالک'' ہی تھا۔ اسی سلسلہ کا ایک اور اہم کام مشہور مستشرق ارنسٹ نیس کی جدید قانون بین الممالک کے موضوع پر لکھی جانے والی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب کی اہمیت اور ترجمہ کی ضرورت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر حمیداللہ لکھتے ہیں:

> ''ایک تو اپنے موضوع کی مستند اور متداول کتاب ہے، جس کا ہر کوئی حوالہ دیتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر مولف کی وسعتِ قلبی ہے کہ اپنوں کی کوتاہیوں اور غیروں کی خوبیاں اور احسان ماننے میں اسے ذرا تامل نہیں معلوم ہوتا۔ کم مغربی مولف ہیں جنہوں نے جدید قانون بین الممالک پر کثیر مشرقی اثرات کو اس صراحت سے تسلیم کیا، سراہا اور ثابت کیا۔''(۶)

اپنے مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے مزید وضاحت کی ہے کہ مصنف (ارنسٹ نیس) چونکہ مشرقی علوم سے، متعلقہ زبانوں سے عدم واقفیت کی بناء پر، براہِ راست استفادہ نہیں کرسکا ہے اور محض مشہور کتابیں اس کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ اس لیے بعض واقعاتی غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور کچھ سنی سنائی باتوں کو حقائق سمجھ کر قلم بند کردیا ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ نے بڑی وسعت قلبی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مصنف ارنسٹ نیس نے ایسا بر بنائے تعصب وعناد نہیں کیا بلکہ یہ اس کے عدم معلومات کا نتیجہ ہے۔(۷) ڈاکٹر صاحب نے جابجا حواشی میں متن کی تصحیح وتردید کے ساتھ ساتھ بعض مقام پر اسلامی نکتہ نظر کی بھی وضاحت کردی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی اپنے ایک مقالے ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور قانون بین الممالک'' میں تذکرہ کرتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوام عالم میں قانونِ بین الممالک اور اس کی اہمیت کا شدت سے احساس پیدا ہوا۔ چناچہ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے لیے ایک منشور ترتیب دیا گیا۔ جس میں باہمی تعلقات کی استواری اور دوسرے مسائل اور نزاعات کے حل کے لیے قوانین وضع کیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اقوام متحدہ کے اس منشور کو بھی اردو میں منتقل کیا۔(۹)

علامہ ابن القیم جوزیہ(۱۰) کی ''کتاب احکام اہل الذمہ'' ڈاکٹر صبحی الصالح کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس پر جو پُر مغز مقدمہ لکھا ہے وہ بھی اُن کے بین الاقوامی شعور کا غماز ہے۔ اس میں انھوں نے اسلام کے ملکی اور بین الاقوامی قوانین، غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات اور اہل الذمہ کے حقوق و معاملات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔(۱۱)

اس موضوع پر قدما میں امام سرخسی(۱۲) کی شرح السیر الکبیر معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ دراصل السیر الکبیر امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی کی تصنیف کردہ ہے۔ جس میں امام محمد نے جہاد و قتال اور صلح و جنگ کے طریقے، غیر مسلم اقوام سے تعلقات اور تجارت وغیرہ پر بحث کی ہے۔ اور اسلام کے بین الاقوامی قانون کو جاننے کے لیے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ امام سرخسی کے زمانے میں جبکہ صلیبی جنگیں لڑی جارہی تھیں، بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی قوانین یقیناً زیر بحث رہے ہوں گے اس وقت کے اہم تقاضے کو امام سرخسی نے اس طرح پورا کیا کہ امام محمد کی کتاب ''کتاب السیر الکبیر'' کی شرح لکھوائی۔ یہ شرح جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے حیدر آباد دکن اور مصر سے کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ اسکی اہمیت کے پیش نظر یونیسکو (UNESCO) نے اسے فرانسیسی زبان میں منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ یہ کام بھی ڈاکٹر صاحب کے قلم سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔(۱۳) تاہم یہ کتاب بہ زبان فرانسیسی ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی اسی حوالے سے ایک اور اہم تصنیف ''الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ'' ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس کتاب میں رسول اللہ کے مکتوبات اور ان کے دریافت جوابات، فرامین، معاہدے، دعوت اسلامی، عمّال کی تقرری، اراضی کے عطیات، آمان نامے، وصیت نامے وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں عہدِ خلافتِ راشدہ کی دستاویزات کو یکجا کیا گیا ہے۔(۱۴)

اس موضوع پر ڈاکٹر حمید اللہ کی ایک اور اہم کتاب The Muslim Conduct of State ہے۔ اس میں قانون بین الممالک کی غرض، اساس اور اس کے ماخذ سے بحث کی گئی ہے اور ماقبل اسلام قانون بین الممالک کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ موضوع کے دوسرے گوشوں مثلاً آزادی، اختیارات، سفارت، جنگ، بغاوت، ڈاکہ زنی، جنگی قیدیوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک، فوج میں مسلم خواتین وغیرہ جیسے موضوعات پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت عمدہ بحث و تحقیق پیش کی ہے۔ اس کے بارے میں مولانا ابوالجلال ندوی(۱۵) لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے بین الاقوامی آئین پر یہ پہلی کتاب ہے جو اس زمانے کی ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔تنگ اور محدود نسلی اور جغرافیائی قومیت کی پیدا کردہ عالم گیر کشمکش کی وجہ سے اب دنیا کا رجحان بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ وسعت صرف اسلام ہی میں مل سکتی ہے۔اس لیے اسلام کے بین الاقوامی قوانین کو پیش کرنا ایک بڑی مفید خدمت ہے۔''(۱۶)

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کے ۱۹۹۶ء تک چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ترکی زبان میں اسکا ترجمہ بھی ہوا۔یہ کتاب، پاکستان، انڈیا، ترکی کے علاوہ جرمنی سے بھی شائع ہوتی رہی ہے۔اس کے ہر ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب اضافے اور نظر ثانی کر کے اُسے پہلے سے بہتر بناتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک اور کتاب First written constitution in the world ہے۔(۱۷) جس میں رسول اللہ کے میثاقِ مدینہ پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اُسے پہلا عالمی دستور قرار دیا گیا ہے اور نہایت مدلل انداز میں ثابت کیا ہے کہ مدینہ کو پہلی کثیر قومی و نسلی اور مذہبی وفاق ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس سلسلے کی ایک اور انگریزی کتاب The Prophet establishing a state بھی ہے۔ جسے پاکستان ہجرہ کونسل نے اسلام آباد سے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ڈاکٹر صاحب کی بعض وہ کتابیں جو بظاہر سیرت پر ہیں۔مثلاً رسول اکرم کی سیاسی زندگی، عہد نبوی کے میدان جنگ، اور عہد نبوی میں نظام حکمرانی وغیرہ۔ان میں بھی قانون بین الممالک کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا انداز نہایت محققانہ اور مدلل ہوتا تھا ان کی تمام تحریریں اس کا ثبوت ہیں بطور خاص قانون بین الممالک کے میدان میں ان کا کام اپنے ہم عصر مفکرین میں نہایت منفرد تھا، انہوں نے قدیم نظریہ سیئر میں اضافے بھی کئے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی قانون بین الممالک کے ارتقا اور اس کی تشکیل نو میں ڈاکٹر حمید اللہ کا بڑا کردار ہے تو غلط نہ ہوگا۔اس کی تصدیق کے لیے ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریروں اور خطبات کا سہارا لیا گیا ہے جن کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں سمیٹا جاسکتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے لفظ انٹرنیشنل لاء (International law) جس کے لیے عموماً بین الاقوامی قانون کا لفظ مستعمل ہے۔عمداً ''قانون بین الممالک'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ قانون اصل میں سلطنتوں یا حکومتوں کے آپس کے تعلقات سے متعلق ہوتا ہے۔ حالت جنگ میں بھی اور حالت امن میں بھی سلطنت کے باشندوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی دو قوموں کے تعلقات سے اس میں بحث نہیں ہوتی بلکہ دو مملکتوں کے معاملات و مفادات سے بحث ہوتی ہے لہٰذا ''قانون بین الممالک'' کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔(۱۸) ابتداء میں International law کی جگہ ڈاکٹر حمید اللہ اسے Inter state law کہتے رہے۔(۱۹)

۲۔ قانون بین الممالک (یعنی علم السیر) ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کا رہین منت ہے اور مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے اسے علم کے طور پر متعارف کیا۔ مغربی اہلِ قلم اور دانشور یہ بات بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ جدید بین الاقوامی قانون مغربی مفکرین کی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جدید بین الاقوامی قانون کی داغ بیل سترھویں صدی کے ایک مفکر گروشش (۹۹۱ھ تا ۱۰۵۵ھ/۱۵۸۳ء تا ۱۶۴۵ء) نے ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے مغرب کے اس دعویٰ کو رد کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بین الاقوامی قانون اپنی عالمگیر اور آفاقی صورت میں صرف مسلمانوں کا رہنِ منت ہے۔ اس نوع کا قانون بین الممالک سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی ایجاد کیا۔[۲۰] یہ قانون بلا تفریقِ ملت، رنگ و نسل، تمام اقوام کے لیے یکساں ہے۔ یہ شریعت کا حصہ ہے اور ہر اسلامی مملکت اور ہر مسلمان حکمران کے لیے واجب الاتباع ہے۔

۳۔ بعض مغربی علماء یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ علم پہلے پہل یونانیوں نے متعارف کرایا لیکن ڈاکٹر حمید اللہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ بعض مغربی مصنّفین ہی کے بیان سے اس دعویٰ کو مسترد کرتے ہیں۔ ان مغربی مصنّفین کے بیان کے مطابق یونان کی شہری ریاستوں میں اگر باہمی تعلقات کے حوالے سے کچھ معین قاعدے تھے تو وہ صرف اپنے ہم نسل یونانیوں کے ساتھ برتاؤ سے متعلق تھے۔ یعنی ایک یونانی شہری ریاست دوسری یونانی شہری ریاست کے ساتھ تعلقات میں چند معین قواعد پر عمل کرتی دیگر باقی ساری دنیا کو وحشی قرار دے کر انہیں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ کسی معینہ قاعدے قانون کے تحت معاملات کریں۔ گویا یونانیوں کے پاس اگر انٹرنیشنل لاء تھا تو یہ قوانین جہاں اپنے اطلاق میں محدود تھے۔ وہیں وہ دوسری اقوام کے حوالے سے امتیازی بھی تھے۔[۲۱] یونان کا سب سے بڑا فلسفی ارسطو غیر یونانیوں کے بارے میں یہ فیصلہ دیتا ہے کہ ''فطرت نے انہیں یونانیوں کا غلام بننے کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کے متعلق یونانی اپنی صوابدید پر جو چاہے عمل کر سکتا ہے۔''[۲۲]

۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ بعض یورپی مصنّفین کے اس دعویٰ کو بھی مسترد کرتے ہیں کہ یہ بین الاقوامی قانون International Law رومیوں کے ہاں ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رومیوں کے ہاں جنگ و امن کے حوالے سے کچھ قوانین ضرور تھے لیکن یہ قوانین ساری دنیا کے لیے نہیں تھے۔ صرف ان ممالک کے لیے تھے جن کے ساتھ رومیوں کے معاہدے ہوتے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر حمید اللہ مشہور انگریز مورخ اوپن ہائم جس نے انٹرنیشنل لاء پر ضخیم کتاب تحریر کی، کے حوالے سے کہتے ہیں کہ رومیوں کا دعویٰ تھا کہ یہ کرۂ ارض رومیوں کا ہے۔ یعنی پوری دنیا رومیوں کی ملکیت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی اپنے گھر کے اندر قانون بین الممالک کا استعمال نہیں کرتا۔[۲۳]

۵۔ اس کے بعد یکا یک ایک ہزار سال کی جست لگا کر یورپی مورخین کہتے ہیں کہ بین الاقوامی قانون

(International Law) چودھویں، پندرھویں صدی میں شروع ہوتا ہے اس دوران گزرنے والے اسلامی دور کا، مغربی مورخین کچھ تذکرہ نہیں کرتے۔ بہرحال مغربی مورخین جسے 'جدید بین الاقوامی قانون' Modern International Law کہتے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ اس کو بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء تک معینہ قاعدوں پر یورپ میں صرف عیسائی سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے ضمن میں عمل کیا جاتا رہا۔ان کے بین الاقوامی قانون کا غیر عیسائی ریاستوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ مجبوراً یورپی عیسائی سلطنتوں نے اعتراف کیا کہ ان قوانین کا اطلاق ایک غیر عیسائی سلطنت (یعنی سلطنت عثمانیہ) کے ساتھ بھی ہوگا۔تاہم اس کے بعد پھر ساٹھ ستر سال تک کسی غیر عیسائی ریاست کو ان قوانین کا حقدار نہیں سمجھا گیا۔[۲۴]

۶۔ ڈاکٹر حمید اللہ لیگ آف نیشنز اور اقوام متحدہ کے انٹرنیشنل لاء کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ اقوام متحدہ میں بھی ہر ملک کو اپنی ذاتی حیثیت سے رکن نہیں بنایا جاتا جب تک کہ کم از کم دو ایسی سلطنتیں جو پہلے سے اقوام متحدہ کی ممبر ہوں، سفارش نہ کریں، اور یہ اطمینان نہ دلائیں کہ یہ واقعی متمدن سلطنتیں ہیں اور اس بات کی مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ انٹرنیشنل لاء کے مطابق عمل کیا جائے۔اس کے برعکس اسلامی انٹرنیشنل لاء میں اس فرق اور امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی دوسرا ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد وضوابط پر عمل کرتا ہے یا نہیں۔[۲۵]

۷۔ ڈاکٹر حمید اللہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قانون بین الممالک جو حقیقت میں بین الممالک بھی ہے اور قانون بھی ہے مسلمانوں سے شروع ہوتا ہے۔وہ اس کا آغاز رسول اللہ کی سیرت سے کرتے ہیں۔ ہجرت سے قبل مکہ میں State within state کی کیفیت میں، ازاں بعد مدینہ میں جب ایک اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو دیگر ممالک اور خودمختار اکائیوں سے ان کے تعلقات، امن و جنگ کا آغاز ہوا اور رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل مسلمانوں کے لیے نظیر بنتا گیا۔گویا رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور بعد ازاں ان کے خلفاء کے طریق کار میں وہ تمام اصول وضع ہوگئے جس پر آگے فقہا اضافہ کرتے رہے اور ایک واقعی ہمہ گیر نوعیت کا انٹرنیشنل لاء وجود میں آیا جس کو علم السیر کا نام دیا گیا۔[۲۶]

۸۔ اسلامی قانون بین الممالک تمام حکومتوں (خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) کے لیے ہے اس میں مذہب، علاقہ، نسل وغیرہ کی بنیاد پر کسی قوم کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے۔[۲۷] اسلامی قانون بین الممالک اسلامی شریعت کا ایک حصہ ہے چنانچہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ بھی معاہدات کی پابندی اسی طرح واجب ہے جس طرح دیگر عبادات۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلامی قانون بین الممالک کا حصہ غیر مسلم قوموں کے ساتھ عدل وانصاف پر مبنی تعلقات استوار کرنا ہے۔یہ قانون اپنے پیچھے ایک مضبوط اور موثر قوت نافذہ رکھتا ہے۔اس کی قوت نافذہ جہاں ریاست کی قوت قاہرہ اور اس کا قانونی نظام ہے، وہیں فکر آخرت اور خدا کے سامنے جوابدہی جیسے مفاہیم بھی ہیں۔[۲۸]

۹۔ ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کے علم السیر کے ارتقا کی تاریخ بتاتے ہوئے اطلاع دیتے ہیں کہ علم السیر پر قدیم ترین تحریر امام زید ابن علی (م ۱۲۰ھ/۷۳۸ء)(۲۹) کی کتاب ''المجموع فی الفقہ'' کا ایک باب ہے جس کو ''کتاب السیر'' کا نام دیا گیا ہے، علم السیر پر پہلی کتاب امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) کی تھی جس کے بعض نکات سے ان کے ہم عصر امام اوزاعی (۳۰) نے سخت اختلاف کیا اور اس کے خلاف ایک رسالہ لکھا۔ تاہم یہ دونوں کتابیں امام ابوحنیفہ کی کتاب اور امام اوزاعی کا رسالہ ضائع ہو گئیں۔ امام ابوحنیفہ کے ایک اور اہم شاگرد امام ابو یوسف (م ۱۸۳ھ/۷۹۶ء) نے امام اوزاعی کے نکات کو رد کرتے ہوئے ''الرد علی سیر الاوزاعی'' کتاب لکھی۔ یہ کتاب محفوظ ہے اور اس سے امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کے اختلافی نکات وغیرہ سامنے آتے ہیں۔ امام شافعی کی ''کتاب الام''(۳۱) میں بھی امام اوزاعی کے رسالے کے کچھ اقتباسات ملتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے تین اور شاگردوں نے علم السیر کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ ان میں امام محمد الشیبانی، امام زفر اور فزاری کے نام شامل ہیں۔ اول الذکر نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں:

۱۔ کتاب السیر الکبیر

۲۔ کتاب السیر الصغیر

اول الذکر کی شرح پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ امام سرخسی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے کی۔ آج دنیا میں اس موضوع پر محفوظ رہ جانے والی اور شائع ہونے والی قدیم ترین کتاب یہی ''شرح السیر الکبیر'' ہے۔ بعض اور ممتاز فقہاء و علماء نے اس موضوع پر کام کیا چنانچہ امام مالک (م ۱۷۹ھ/۷۹۵ء) نے بھی کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ تاہم یہ کتاب اب ناپید ہے۔ اسی طرح ان کے ایک اور معاصر مورخ واقدی نے بھی ''کتاب السیر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بھی اب نایاب ہے۔ تاہم امام شافعی کی ''کتاب الام'' میں ''سیر الواقدی'' کے نام سے ایک طویل اقتباس شامل ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ علم السیر پر لکھی جانے والی ان کتابوں اور رسائل کو ابتدائی اور آخری قرار دیتے ہیں۔ یعنی ایک خاص زمانے میں کسی خاص ضرورت سے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ پھر اس کے بعد شاید ضرورت نہ رہی۔ اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اس علم سے مسلمانوں کی دلچسپی برابر برقرار رہی۔ وہ اس طرح کہ فقہ کی جتنی کتابیں ابتداء سے لے کر آج تک لکھی گئی ہیں ان سب میں کتاب السیر کا باب ضرور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی عیسوی میں مرتب کی جانے والی ''فتاوائے عالمگیری'' میں بھی اس پر ایک باب ہے۔

۱۰۔ بعض مستشرقین کے خیال میں اسلام میں غیر جانبداری کا تصور نہیں۔ وہ دنیا کو دارالسلام اور دارالحرب کے دو متحارب بلاکوں میں تقسیم کرتا ہے ان کے درمیان وہ کسی تیسرے بلاک کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نظریہ ایک مستشرق مجید قدوری نے اپنی کتاب Islamic Law for War

and Peace میں دیا جو ۱۹۵۵ء شائع ہوئی۔ ایک اور مشہور مستشرق برنارڈ لیوس نے بھی Political Language of Islam میں جو شکاگو یونیورسٹی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی، اس خیال کا اظہار کیا اور اسلام کو ایک استعماری نظام کے طور پر پیش کیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے ان مستشرقین کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ بون یونیورسٹی میں پیش کیا جانے والا ڈاکٹر صاحب کی تھیسس کا عنوان ہی ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات میں غیر جانبداری کے اصول'' تھا۔ جس کے بعد مستشرقین کے مذکورہ بالا نظریات خود ہی بے بنیاد ڈھرتے ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خیال میں گو کہ اسلام کا پیغام عالمی و آفاقی ہے۔ جس کا تقاضا پوری دنیا میں اللہ کے دین کا غلبہ اور اس کے نظام کا قیام ہے۔ تاہم اس کا مطلب غیر مسلم ریاستوں کے حق بقا کی نفی نہیں ہے۔ اسلام مسلمانوں کو ایسی تمام اقوام کے ساتھ پرامن تعلقات کی ہدایت کرتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ سے احتراز کریں اور صلح اور امن کے ساتھ رہنا چاہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کے نظریہ سیر میں ریاستوں کے پرامن بقائے باہمی کا وہ اصول تسلیم کیا گیا ہے جو آج کے بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ نے اس تصور کو اہل علم اور اہل یورپ کے سامنے پورے استدلال سے پیش کیا ہے جس نے جدید نظریہ سیر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

۱۲۔ اک اور مسئلہ جو بعض مستشرقین کی طرف سے پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے باقی قوانین کے برعکس اسلامی قانون کا دائرہ اختصاص اور اس کی علاقائی حدود عمل متعین نہیں ہیں۔ یہ ایک شخصی قانون ہے جو دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے مسلمانوں پر لاگو ہوتا ہے۔ (۳۲) ڈاکٹر حمید اللہ نے بہت مدلل انداز میں اس اشکال کا جواب دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اسلامی قانون جہاں ایک شخصی قانون ہے وہیں یہ ایک متعین علاقائی دائرہ اختصاص بھی رکھتا ہے۔ (۳۳) ایک اسلامی ریاست اپنی فوجداری و تعزیری قوانین صرف انہی لوگوں پر نافذ کرسکتی ہے جو اس کے اپنے حدود عمل میں رہتے ہیں۔ (۳۴) ریاست کے حدود عمل کا متعین حدود ارض تک ہونے کا جو تصور ڈاکٹر حمید اللہ نے پیش کیا ہے وہ درحقیقت معاصر سیاسی فکر یعنی علاقائی اقتدار اعلیٰ Territorial Sovereignty کی ایک بازگشت ہے۔ اس سے اسلامی ریاست ان الجھنوں اور اشکالات سے بچ جاتی ہے جو اسلامی ریاست کے ماوراالحدود قرار دینے سے پیدا ہوتی ہیں۔

الغرض ڈاکٹر محمد حمید اللہ عصر جدید میں مسلمانوں میں قانون بین الممالک کے پہلے ایسے ماہر ہیں جنہوں نے مختلف زبانوں سے واقفیت کے سبب، مختلف قدیم، جدید قوموں اور ملکوں کے بین الممالک اصول و تصورات اور قوانین کا مطالعہ کیا اور کتابیں و مقالات قلم بند کئے۔ وہ یورپ کے قدیم و جدید قوانین بین الممالک سے اسلام کے قوانین بین الممالک کا بعض مقامات پر موازنہ و مقابلہ کر کے واضح کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین ہر لحاظ سے بہتر ہیں۔ (۳۵) وہ قانون بین الممالک کی تشریح میں یورپ

اورامریکہ کے ساتھ تاریخ اسلام اور فقہ اسلامی سے بھی استدلال کرتے ہیں کیونکہ وہ خوب واقف ہیں کہ مغربی اہل قلم عموماً اسلامی تاریخ کے محاسن کو نظرانداز کرتے ہیں۔ڈاکٹر حمیداللہ چونکہ مستشرقین کے طریقہ سے خواب واقف تھے اس لیے وہ دلائل و براہین کے ساتھ ابتدائی ماخذ کے حوالے دے کر یورپ کے پیمانہ تحقیق ہی کے مطابق ان کو جوابات دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر محمد حمیداللہ کو بلاخوف وخطر دور جدید میں اسلام کے بین الاقوامی قانون کا مجدد اور مؤسس نو قرار دیا جاسکتا ہے اگرامام محمد بن حسن شیبانی قدیم علم السیر کے مؤسس اول اور مدون ہیں تو ڈاکٹر حمیداللہ یقیناً جدید بین الاقوامی اسلامی قانون کے موسس و مدوّن ہیں اور بیسویں صدی کے شیبانی کہلائے جانے کے بجاطور پر مستحق ہیں۔''(۳۶)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، مشمولہ فکرونظر، ص۱۳، اسلام آباد،

۲۔ ڈاکٹر حمیداللہ ''The Muslim Conduct of State'' (شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۹۶ء) ص۸ پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ، (تحریر کی تاریخ ۱۹۴۱ء)

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ ''قانون بین الممالک'' (مکتبہ ابراہیمہ، حیدرآباد دکن، طبع ثانی، ۱۳۶۴ھ) ص۱۸ (پہلی اشاعت کا پیش لفظ)

۶۔ ارنسٹ نیس، 'جدید قانون بین الممالک کا آغاز' ترجمہ: ڈاکٹر حمیداللہ ص، ط (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء)

۷۔ ایضاً

۸۔ دیکھئے، سہ ماہی فکرونظر، ص۲۰۲، اسلام آباد،

۹۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر حمیداللہ کی کتاب ''قانون بین الممالک'' کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔اور یہ دستور اقوام متحدہ کا خلاصہ ہے۔جبکہ اصل دستور ایک سو گیارہ دفعات پر مشتمل اور انیس ۱۹ ابواب میں منقسم ہے۔

۱۰۔ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد الزرّعی ۶۹۱ھ/۱۰۹۸ء میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ابن القیم نے اپنے دور کے مشہور شیوخ سے علوم کی تکمیل کی۔۷۱۲ھ میں جبکہ ابن القیم بیس اکیس سال کے نوجوان تھے۔اپنے وقت کے مشہور عالم ابن تیمیہ مصر سے مراجعت کر کے دمشق میں مقیم ہوئے تو ابن القیم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابن تیمیہ کی وفات (۷۲۸ھ) تک ایک لمحہ کے

لیے بھی ان کی مفارقت گوارہ نہ کی۔حتیٰ کہ جب ابن تیمیہ کو ان کے انقلابی نظریات کی وجہ سے دمشق کے قلعہ میں قید کیا گیا تو ابن القیم بھی ان کے ساتھ زندان میں رہے۔ وہ ابن تیمیہ کے صحیح جانشین اوران کے علوم کے صحیح معنوں میں حامل تھے۔مسلک ابن تیمیہ کی تائید کی وجہ سے انہیں ساری زندگی مسائل کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ساٹھ سال کی عمر میں ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء میں دمشق میں انتقال کیا۔انہوں نے پچاس کے لگ بھگ کتابیں تحریر کیں۔جن میں اب زیادہ تر دستیاب نہیں۔تاہم بعض مشہور کتابوں میں ''زاد المعاد'' اور ''اعلام الموقعین عن رب العالمین'' ہیں۔جن کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔(دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، لاہور۔طبع ثانی ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ھ جلد۱، ص۶۵۱ تا ۶۵۳)

۱۱۔ سہ ماہی فکر ونظر، اسلام آباد، ص۲۰۲ (مقالہ نگار، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی)

۱۲۔ گیارہویں صدی عیسویں کے ممتاز عالم، شمس الائمہ ابوبکر محمد بن ابی سہیل احمد مشہور حنفی فقیہ تھے۔ وہ ۴۰۰ھ/۱۰۰۹۔۱۰۱۰ء میں غالباً سرخس میں پیدا ہوئے۔ جو مشہد اور مرو کے درمیان واقع ہے۔نوجوانی میں وہ بخارا جا کر شمس الائمہ عبدالعزیز الحلوانی کے شاگرد بنے۔اور علوم وفنون میں اسقدر امتیاز حاصل کر لیا کہ جب استاد کی وفات ہوئی (۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء) تو ان کی مسند درس کے ساتھ ان کا لقب (شمس الائمہ) کے بھی وارث قرار پائے۔حروب صلیبیہ کے باعث یہ بڑا پرآشوب زمانہ تھا۔شاید ان جنگوں ہی کے پیش نظر، سرخسی نے قتال و جنگ سے متعلق فقہی احکام ومسائل پر مستقل امام محمد شیبانی کی اہم تالیف السیر الکبیر کی شرح بھی، بحالت قید اپنے شاگردوں کو املا کرائی۔اس کے علاوہ امام محمد ہی کی ''کتاب المبسوط'' کی شرح بھی حالت قید میں اپنے شاگردوں کو املا کرائی، یہ قاہرہ سے تیس ۳۰ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(ڈاکٹر محمد حمیداللہ وادارہ، مادہ سرخسی، مشمولہ دائرہ معارف اسلامیہ، طبع اول، ص۸۱۱ تا ۸۱۵)

۱۳۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، خطبات بہاولپور، ص۱۲۵ (اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۱۹۸۱ء)

۱۴۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، مجموعہ الوثائق السیاستہ فی العہد النبوی والخلافتہ الراشدہ، (مطبوعہ لجنتہ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۹۴۱ء) اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا ابویحییٰ نوشہری نے کیا جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ مولانا ابوالجلال ندوی موجودہ اعظم گڑھ کے قصبہ محی الدین پور میں ۱۸۹۴ھ میں صدیقی شیوخ کے خانوادے میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم یہیں سے، جبکہ اعلیٰ تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے حاصل کی، یہاں ان کے اساتذہ میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حفیظ اللہ ہندی اعظم گڑھی کو امتیاز حاصل ہے۔ ماہر علوم قدیم وجدید مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء) سے علی الخصوص علوم قرانیہ وعربیہ سے تحصیل کی، ندوۃ سے فارغ ہونے کے بعد ایک عربی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ جلد ہی ان کے استاد سید سلیمان ندوی نے انہیں دارالمصنفین، اعظم گڑھ بلا لیا یہاں انہوں نے قلیل مشاہرہ پر دس سال تک علمی وتحقیقی کام کیا۔ بعدازاں مدراس چلے گئے۔ وہاں کے تعلیمی ادارہ جامعہ عربیہ سے منسلک ہوگئے۔ یہاں انہیں عربی زبان میں مہارت حاصل ہوئی وہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔ مدراس

میں ۲۰ سال قیام کے بعد وہ ایک بار پھر دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ دوبارہ مدراس چلے گئے جہاں کے عربی مدارس میں درس وتدریس کے ساتھ ہی مضامین بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی منتقل ہوئے، یہاں ان کا قیام ۲۵ سال رہا، وہ اس عرصہ میں آزادانہ طور پر تحقیق اور علمی کاموں میں مصروف رہے، نوے سال کی عمر میں اکتوبر ۱۹۸۴ء میں انتقال کیا، اور سعود آباد کے قبرستان میں دفن ہوئے ان کا بیشتر علمی کام قلمی مسودات کی شکل میں موجود ہے۔ اور زیادہ تر غیر مطبوعہ ہے۔ (علی محسن صدیقی، مضامین تاریخی ص ۳۱۶ (قرطاس، کراچی ۲۰۰۶ء)

۱۶۔ مولانا ابوالجلال ندوی۔ مطبوعات جدید ص ۳۱۷ (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۸ء)

۱۷۔ لاہور سے ۱۹۶۸ء تک اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۸۔ ڈاکٹر حمید اللہ، 'خطبات بہاولپور'، ص ۱۱۵

۱۹۔ ظفر اسحٰق انصاری، 'ڈاکٹر محمد حمید اللہ مشاہدات وتاثرات'، مشمولہ فکر ونظر، ص ۱۲، اسلام آباد

۲۰۔ ڈاکٹر حمید اللہ The Muslim Conduct of State، ص ۱۷

۲۱۔ 'خطبات بہاولپور'، ص ۱۱۷

۲۲۔ ارسطو، 'سیاسیات' مترجم سید نذیر نیازی۔ ص ۴۲۔۴۱ (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء)

۲۳۔ 'خطبات بہاولپور'، ص ۱۱۸

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقدمہ) ''احکام اھل الذمہ'' از علامہ ابن القیم، ص ۸۲ (دارالعلم للملایین طبع اول، ۱۱۸۲ھ)

۲۸۔ ڈاکٹر حمید اللہ The Muslim Conduct of State، ص ۱۷

۲۹۔ زید ابن علیؓ زین العابدین، حضرت حسینؓ کے پوتے ہیں، اور شیعوں کے فرقۂ زیدیہ کے بانی، ایک معنوں میں وہ امام ابوحنیفہ کے استاد سمجھے جاتے ہیں، زید ابن علی نے اموی خلافت کے خلاف بغاوت کی، لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخر کار وہ گرفتار ہوئے اور قتل کر دیئے گئے۔ یہ ۱۲۰ھ یا ۱۲۲ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا دور حکومت تھا۔

۳۰۔ ابوعمرو بن عبدالرحمٰن بن عمرو، جو امام اوزاعی کے نام سے مشہور ہوئے ۸۸ھ/۷۰۷ء میں دمشق کے نواحی قصبے اوزاع میں پیدا ہوئے۔ یہ شام میں فقہ اسلامی کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔ اور ''امام اہل شام'' کہلاتے تھے۔ ان کا انتقال بیروت میں ۱۵۷ھ/۷۷۴ء میں تقریباً ستر سال کی عمر میں ہوا۔ یہ امام ابوحنیفہ کے ہمعصر تھے۔ اور ایک علیحدہ فقہی مسلک کے بانی تھے۔ فقہ پر ان کی کوئی کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔ تاہم ان کی 'کتاب السیر' کا ایک اصلی نسخہ جو ان کے شاگرد نے تیار کیا تھا، گیارہویں صدی ہجری /

سترہویں صدی عیسوی تک موجود تھا۔(دائرہ معارف اسلامیہ طبع سوم)ج ۳،ص ۵۳۵

۳۱۔ خطبات بہاولپور میں امام شافعی کی کتاب کا نام ''کتاب الدم'' لکھا ہے۔ جو درست نہیں کتاب کا نام ''کتاب الام'' ہے جو امام شافعی کی مشہور زمانہ کتاب ہے۔

۳۲۔ مجید قدوری Islamic Law of Nation ص ۷(بالٹی مور ۱۹۴۴ء)

۳۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ he Islamic Review جولائی اگست ۱۹۶۶ء (پروفیسر مجید قدوری کی کتاب Islamic Law of Nation پر حمید اللہ کا تبصرہ)

۳۴۔ ڈاکٹر حمید اللہ The Muslim Conduct of State ص ۱۶

۳۵۔ 'خطبات بہاولپور'،ص ۱۳۱

۳۶۔ محمود احمد غازی،''علوم اسلامیہ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی خدمات''ص ۸۵ (مشمولہ فکر ونظر،)

اسبابِ زوالِ خلافتِ عثمانیہ کا تحقیقی مطالعہ

ذاکرہ پروین☆/ڈاکٹر ہمایوں عباس☆☆

Abstract:

"Rise and fall of Ottoman Empire with the causes and aftermaths have been described in these pages, though is abridged form, yet it conveys complete historical records pertaining the up rise and downfall of the unprecedented Muslim Empire under the supremacy of different monarchs in their relevant eras. These pages elaborate consistently the roots and ethics of the up rise of this gorgeous empire and also throw light on the causes of its gradual deterioration. This article illuminates the historical phases of Ottoman Empire and shows the propensity of the ruling class which is responsible to bring this domain to a crushing point from where the reader can easily asses and feel the actual factors working behind the screen to bring this domain to the total collapse."

Keywords: Ottomon Empire, Deterioration, Conspirecy, Cage system, Interiour disorder.

قدرت کا قانونِ عروج وزوال جو ابتدائے آفرینش ہی سے کارفرما ہے، خلافت عثمانیہ اس سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی۔ دراصل انحطاط وزوالِ اقوام کا معاملہ بھی جسمانی امراض وعوارض کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے کسی تندرست وتوانا جسم کو کوئی عارضہ لاحق ہوتا ہے تو آغاز میں اس کا احساس یا تو بالکل نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کی جاتی اور بالآخر مریض اور اس کے لواحقین کی عدم توجہ موت پر منتج ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح قوموں کے زوال وانحطاط کا معاملہ ہے، جب بدعملی، غفلت، عیش کوشی کے سبب کسی قوم یا حکومت کے جسم کو انحطاط وادبار کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے تو فطرت کی طرف سے

☆ پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
☆☆ ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

دو باتیں ہوتی ہیں اگر اُس قوم کے قلوب واذہان بیدار ہوں اور بصیرت جیسی نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہو اور اپنی کمزوریوں، غفلتوں، درماندگیوں اور کوتاہیوں کا ادراک رکھتی ہو تو فوراً اس کا انسداد و تدارک کر لیتی ہے نتیجتاً زوال وانحطاط رُک جاتا ہے اور اس کی عظمتِ رفتہ لوٹ آتی ہے، لیکن اگر اس کے برعکس ہو تو کسی قوم کو اگر اپنے جرائم اور گناہوں کا احساس تک نہ ہو تو تباہی و بربادی اور زوال اُس قوم وملت کا مقدر بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے:

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب ''قرآن کا قانونِ عروج و زوال'' میں نہایت وضاحت کے ساتھ عروج وزوال کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تورات، انجیل اور قرآن تینوں نے وراثت ارض کی ترکیب جا بجا استعمال کی ہے اور غور کرو یہ ترکیب صورت حال کی کتنی سچی اور قطعی تعبیر ہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں ہم دیکھتے ہیں ایک طرح کی بدلتی ہوئی میراث کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یعنی ایک فرد یا گروہ طاقت واقتدار حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ چلا جاتا ہے اور دوسرا فرد یا گروہ اس کی ساری چیزوں کا وارث ہو جاتا ہے۔ حکومتیں کیا ہیں، محض ایک ورثہ ہیں جو ایک گروہ سے نکلتا ہے اور دوسرے گروہ کے حصہ میں آ جاتا ہے۔''(۲)

اس وراثتِ ارضی کی منتقلی کے لیے قرآن نے عمل صالح کو مدار بنایا ہے۔ جن میں اصلاح اور صلاحیت نہ رہے وہ اس وراثت کے حق دار نہیں رہتے۔ سورۂ فاطر میں فرمایا:

''فَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلاً وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلاً''(۳)
(سو تم اللہ کی عادت میں ہرگز تبدل نہ پاؤ گے اور اللہ کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔)

اللہ تعالیٰ نے قانونِ ہستی کے قیام واصلاح کے لیے یہ اُصول مقرر کیا ہے کہ یہاں وہ چیز باقی رہ سکتی ہے جس میں نفع ہو اور جس میں منفعت نہیں وہ باقی نہیں رہ سکتی۔ اسے آخر کار نابود ہونا ہے کیوں کہ کائنات ہستی کا یہ بناؤ، یہ حسن، یہ ارتقاء قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں:

''فطرت ہمیشہ چھانٹتی رہتی ہے وہ ہر گوشہ میں صرف خوبی اور برتری ہی باقی رکھتی ہے فساد اور نقص محو کر دیتی ہے۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے اس کارگاہِ فیضان و جمال میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو کیوں کہ یہاں رحمت کارفرما ہے اور رحمت چاہتی ہے کہ افادہ فیضان ہو، وہ نقصان گوارا نہیں کر سکتی۔۔۔ٹھیک ٹھیک عمل ایسا ہی معنویات میں بھی جاری ہے جو عمل حق ہوگا قائم اور ثابت رہے گا، جو باطل ہوگا مٹ جائے گا اور جب کبھی حق و باطل کا مقابلہ ہوگا تو بقاء حق

کے لیے ہوگی نہ کہ باطل کے لیے، وہ اسی کو قضاء بالحق سے تعبیر کرتا ہے یعنی فطرت کا فیصلہ حق، جو باطل کے لیے نہیں ہوسکتا۔''(۴)

جب تک کوئی قوم قیام عدل کے لیے سعی کرتی رہتی ہے تو فتح وکامرانی اور نصرتِ الٰہی اس کے ساتھ رہتی ہے لیکن جب عدل کے بجائے ظلم وعدوان اور ترویج جور وستم اس کا شعار بن جاتا ہے تو پھر قانونِ قدرت حرکت میں آ جاتا ہے اور بیک جنبش ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالتا ہے اور ان کا نام لیوا بھی باقی نہیں رہتا۔ مولانا آزاد آگے چل کر لکھتے ہیں:

''جوں ہی تاریخ اسلام کا عہد تاریک شروع ہوا اور علم ومذہب، اعلانِ حق اور دفع باطل کے لیے نہ رہا بلکہ حصول عز وجاہ اور حکومت وتسلط کے لیے آلۂ کار بن گیا اور اس طرح علم ومذہب حصولِ قوتِ حکمرانی اور دولت وجاہ دنیوی کا ذریعہ بن گیا تو اجتماعی فسادات اور امراض کے چشمے پھوٹ پڑے۔ حکام عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے لگے اور علماء وفقہاء ان کے درباروں کی زینت بن گئے تو قوت حاکمہ کائنات کے دست قدرت نے بھی استبدال اقوام اور انتخاب ملل کے فطری قانون کو حرکت دی اور عمل بالمحاذات کے دستورِ اٹل کو عمل میں لائی تو پھر ہمارے ادبار اور شقاوت کو نہ ہماری حکومت روک سکی اور نہ ہی عسکری قوت، رسوائی وذلت کے اس بحر متلاطم کے تھپیڑوں سے نہ علماء ومشائخ بچ سکے اور نہ عمال اور زاہد۔''(۵)

تہذیب وتمدن اور عمرانیات کے تمام اُصولوں اور قوانین کا متن قرآن ہی کا بنیادی اُصول ہے۔ اسی اُصول کی ہمہ گیری ہے کہ گذشتہ اقوام کے حالات پر نظر غائر ڈالی جائے تو ہر ملت وقوم کا ایک دورِ عروج دکھائی دیتا ہے اور دوسرا زمانہ انحطاط وزوال، ان دونوں کے مابین مابہ الامتیاز اور حد فاصل اگر کوئی ہے تو وہ قیام عدل اور نفاذ حدود اللہ ہے۔ یہ عروج وزوال اور یہ گردشِ ایام قوموں، ملتوں، جماعتوں اور لوگوں کے مابین ہمیشہ سے جاری وساری ہے، اس کی گرفت سے دنیا کا کوئی شاہ وسلطان نہیں بچ سکتا۔ یہ قدرت کی لازوال اور اٹل حقیقت ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے خلافت عثمانیہ کے انحطاط اور ترک سلاطین کے ادبار وزوال پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے زوال سلطنت عثمانیہ کو ترکوں کے ساتھ ساتھ اُمت مسلمہ کی بدقسمتی بھی کہا ہے۔ موصوف رقم طراز ہیں:

''ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عین ترقی وعروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزل وانحطاط شروع ہوگیا اور قوموں کے پرانے امراض ان میں پیدا ہو گئے۔ آپس میں حسد وبغض کا نشو ونما ہوا، بادشاہ مستبد اور جابر ہونے لگے، حکمرانوں کی تربیت کا نظام بگڑ گیا، اخلاق میں انحطاط شروع ہوگیا، حکام اور سپہ سالار قوم وسلطنت سے خیانت اور غداری کرنے لگے، قوم میں راحت طلبی اور عافیت کوشی پیدا ہوگئی، غرض

زوال پذیر قوموں کی تمام صفات ان میں پیدا ہو گئیں۔‘‘(۶)

اسبابِ زوالِ خلافتِ عثمانیہ

علامہ شکیب ارسلان اپنی معروف کتاب ’’اسبابِ زوالِ اُمت‘‘ میں مسلمانوں کے زوال کے متعدد اسباب شمار کروانے کے بعد اہم ترین اسباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’مسلمانوں کے اسبابِ زوال میں یہ چار باتیں بہت اہم ہیں:

۱۔ جہالت: سب سے اوّل جہالت ہے، کچھ شک نہیں کہ جاہل لوگ جو سرکہ اور شراب میں تمیز نہیں کر سکتے، ہر قسم کی بیہودگی کو ماننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور جواب دینے کی طاقت نہ رکھنے کے باعث ہر وقت اغیار کے فریب کا شکار رہتے ہیں۔

۲۔ کم علمی: دوسری وجہ مسلمانوں کی کم علمی ہے، یہ چیز جہالت سے بھی بدتر ہے کیوں کہ اگر سچا عالم مل جائے اور جہلاء کو راہِ راست پر آمادہ کر سکے تو وہ فی الفور راستی قبول کر لیتے ہیں لیکن نیم تعلیم یافتہ اشخاص اپنی منطق کے سامنے کس کا قول بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

۳۔ اخلاق کا زوال: تیسری چیز مسلمانوں کے اخلاق کا گر جانا ہے۔ ہم نے قرآن حکیم کی ارشاد فرمائی ہوئی اچھی صفات، جن سے ہمارے اسلاف اعلیٰ مرتبوں تک پہنچے، بالکل ترک کر دی ہیں اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ قوم کو بنانے اور بڑھانے کے لیے علوم اور معارف کی نسبت اخلاق عالیہ کی موجودگی زیادہ ضروری ہے۔

۴۔ علماء اور حکمرانوں کا زوال: حکمران یہ خیال کرتے ہیں کہ عام لوگ محض ان کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اگر کوئی شخص انہیں راہِ راست پر لانا چاہے تو وہ اُسے مار ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ زیادہ افسوس یہ کہ ان ظالم حکمرانوں کو منافق مولوی بھی ملے ہوئے ہیں حالانکہ ان کا فرض تھا کہ وہ بادشاہوں کو سیدھا راستہ دکھاتے۔‘‘(۷)

سلطان سلیمان اعظم کے دور میں سلطنت عثمانیہ اپنی قوت، عظمت اور حدود کی انتہا کو پہنچ گئی تھی مگر اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان سلیم ثانی پھر اس کے پوتے سلطان مراد ثالث کے ادوار کے آخر میں زوال وانحطاط کے آثار واضح طور پر دکھائی دینے لگے تھے جب کہ سلطنت مالی اخراجات کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی اور محل کے حرم کی خواتین ملکی سیاست پر اثر انداز ہونے لگی تھیں۔ نظامِ حکومت میں رشوت، کروفر کے اظہار، اسراف اور حبِ جاہ کا چلن عام ہو گیا تھا نیز ایسے افراد حساس مناصب پر فائز ہونے لگے جو ان کے ہرگز اہل نہ تھے۔ فتوحات اور اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ فراموش کر دیا گیا تھا۔ آمرانہ طور طریق وزراء کی شناخت بن گئے تھے، حتیٰ کہ وہ شیخ الاسلام جیسی معزز اور قابل احترام شخصیتوں کو عام ملازمین کی طرح کھڑے کھڑے معزول کر دیتے تھے۔ علمائے دین مائل بہ فساد رہتے تھے اور اصحابِ مناصب تکبر وسرکشی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ جب یہ صورت حال ہو تو سرکش عناصر کو علماء کی توہین اور

انہیں نیچا دکھانے کا موقع مل جاتا ہے اور علماء دین کی آہنی دیوار کو منہدم کرنا ان کے لیے نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ عبداللہ شرقاوی جو شیخ الازہر تھے ان سے باغیوں کے کچھ اسی قسم کے اختلافات تھے جن کے سبب اُن کی توہین کی گئی اور محمد علی پاشا نے ان کی نظر بندی کے احکامات جاری کر دیئے وہ نہ اپنے گھر سے نکل سکتے تھے نہ کسی علمی و دینی سرگرمی میں حصہ لے سکتے تھے حتیٰ کہ نمازِ جمعہ کے لیے بھی مسجد جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس صورت حال کو علامہ جبرتی نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔(۸)

ان تمام باتوں نے سلطنت کے انحطاط و زوال میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ اس کے باوجود اصلاح احوال کی کوششیں بھی وقفے وقفے سے جاری رہیں اور سلطنت کی کمزوریاں دور کرنے کی سعی بھی کی جاتی رہی، یہی وجہ ہے کہ سلطنت کا زوال ہوتے ہوتے ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ ذیل میں ان اسباب کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

۵۔ظلم وعدوان اور قتل وخونریزی

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ سلطان سلیمان اعظم کا عہد خلافت عثمانیہ کے نقطۂ عروج کا عہد تھا۔ اس کے بعد اس کے انحطاط کا زمانہ شروع ہو گیا۔ دراصل زوال تو سلیمان اعظم کے دور حکومت کے آخر میں شہزادہ مصطفیٰ کے بہیمانہ قتل کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا بلکہ اس سے بھی پہلے اس کے سب سے طاقت ور اور زیرک وزیر اعظم ابراہیم پاشا کے قتل کے بعد ہی تزلزل رونما ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اگر چہ سلیمان تین براعظموں اور دو بحروں پر حکومت کر رہا تھا اور اس کی فوج بھی اتنی مضبوط تھی کہ یورپ کی دولِ متحدہ کو بری اور بحری دونوں قسم کی جنگوں میں بیک وقت شکست فاش دے سکتی تھی، لیکن دراصل وہ خود محکوم تھا اور اس کے اقلیم قلب ودماغ میں اس کی روسی ملکہ جس کا نام حوریم سلطان تھا، اس کی حکومت و بادشاہت کا سکہ چل رہا تھا۔ ترکی کی معروف سیاسی، علمی اور ادبی شخصیت محترمہ خالدہ ادیب خانم اپنی کتاب "Conflict of East and West in Turkey" (ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش) میں خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "The recognised zenith of Ottoman Power was the time of Soleyman the Magnificent. He ruled over three continents, and in Europe only his Empire extended to the walls of Vienna. Great powers sought his alliance, and his forces could beat the combined forces of the Western world on land and sea. But over Soleyman ruled his wife, Hurrem

Sultan, known as Roxalane to the Western world because of her Russian origin. This little woman witli red hair and a turned up nose, who was not much to look at, judging from her pictures, possessed a temperament and a capacity for intrigue which could boat all the Medici ladies put together."[(8)]

(یہ مسلم ہے کہ سلطنت عثمانیہ کا منتہائے عروج سلیمان اعظم کا زمانہ تھا وہ تین براعظموں پر حکومت کرتا تھا اور صرف یورپ میں اس کے مقبوضات ویانا کی دیواروں تک پہنچ چکے تھے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اسے اپنا دوست بنانے کی کوشش کرتی تھیں اور اس کی فوج بھی اتنی مضبوط تھی کہ یورپ کی دولِ متحدہ کو بری اور بحری دونوں قسم کی جنگوں میں بیک وقت شکست فاش دے سکتی تھی، لیکن اس پر اس کی بیوی حوریم سلطان کی حکومت تھی جو روسی نسل سے تھی جو اہل مغرب میں روکسلین کے نام سے جانی جاتی ہے، یہ ایک چھوٹی سی عورت تھی جس کے بال سرخ تھے اور ناک اوپر کو اُٹھی ہوئی تھی، وہ غضب کی تیز مزاج تھی اور سازش کرنے میں اٹلی کے میڈیچی خاندان کی تمام عورتیں مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔)

اسی روسی ملکہ سے سلیمان اعظم کا ایک بیٹا سلیم خان ثانی تھا جو نہایت آوارہ، بدچلن و بداطوار اور بادہ نوش تھا۔ ملکہ کی خواہش تھی کہ سلیمان کے بعد اس کا یہ بیٹا ہی تخت نشین ہو لیکن مشکل یہ تھی کہ سلطان سلیمان کا سب سے بڑا بیٹا شہزادہ مصطفیٰ جو کسی دوسری ملکہ کے بطن سے تھا، پہلے ہی ولی عہد قرار پا چکا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مصطفیٰ اپنی فوجی، دماغی اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے باقی تمام شہزادوں سے فائق تھا اس بنا پر ولی عہدی کا مستحق بھی تھا۔ یہ ولی عہد شہزادہ اپنے انہی اوصاف و کمالات کی بناء پر عوام اور فوج خصوصاً ینی چریوں میں انتہائی مقبول ومحبوب بھی تھا۔ لیکن روسی ملکہ نے اس کے خلاف ایک زبردست سازش تیار کی اور آخرکار سلطان کو شہزادہ مصطفیٰ کی طرف سے بدگمان کرکے یہ باور کرادیا کہ مصطفیٰ خود سلیمان کی زندگی میں ہی تخت وتاج کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ۱۵۵۳ء میں جب ایران سے جنگ کرنے کے لیے مصطفیٰ اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر رہا تھا تو سلطان سلیمان نے اپنے خیمہ میں بلا کر اپنے اس بہادر و جانباز شہزادے کو گلا گھونٹ کر مروادیا۔ پھر صرف اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ اس شہزادے کے نوعمر بیٹے کو بھی مروادیا۔

شہزادہ سلیم کی تخت نشینی کے لیے اب اس کے مقابل اس کا بھائی شہزادہ بایزید تھا لہٰذا شہزادہ مصطفیٰ کی طرح اس کے دوسرے بھائی بایزید کا بھی یہی حشر ہوا۔ مصطفیٰ کے قتل کے بعد بایزید کو یقین ہوگیا کہ اب اس کی جان کو بھی امان نہیں۔ چنانچہ اس نے سلیم ثانی کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا لیکن سلطان

سلیمان اور سلیم ثانی کی مشترکہ قوت نے مل کر بایزید کو شکست دے دی اور بایزید نے بھاگ کر ایران کے شاہ طہماسپ کے دامن عاطفت میں پناہ لے لی۔لیکن سلطان سلیمان نے شاہِ ایران کو جنگ کی دھمکی دے کر اور چار لاکھ اشرفیوں کے عوض اس کو شہزادے کی حوالگی پر مجبور کر دیا تو اس نے مجبوراً شہزادہ بایزید اور اس کے چاروں بیٹوں کو سلیم کے سفیر کے حوالے کر دیا جس نے ان سب کو فوراً قتل کر دیا۔

مصطفیٰ و بایزید کے قتل اور سلطان سلیمان کی وفات (۹۷۴ھ) کے بعد سلیم ثانی تخت سلطنت پر براجمان ہوا۔اس کی نااہلی، نالائقی، بادہ نوشی، عیش کوشی اور کج فہمی کی بنا پر خلافت عثمانیہ کے زوال کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے اور دولت عثمانیہ میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔خالدہ ادیب خانم اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"It would not have mattered much if the thing had ended there, for the force and stability of the Empire depended more on the ingenious way the system was organised, and great statesmen often covered the lapses of incapable Sultans. But Hurrem Sultan went further. She persuaded Soleyman to adopt the "Cage" system for the princes, and with that she dealt a fatal blow to the dynasty. The experimental and bodily part of the prince's training was abandoned, though he was still taught the classics and given some education, and lie was obliged to spend his lite in the harem to the moment he. could ascend the throne. The consequence was a series of hot-house princes, soft and ignorant of the conditions of their Empire."(9)

(اگر معاملہ یہیں تک رہتا تو کچھ ایسا حرج نہ تھا اس لیے کہ سلطنت کے استحکام اور قوت کا مدار زیادہ تر اس کے مکمل نظام پر تھا اور اکثر سلطانوں کی نالائقی کی تلافی ارکین سلطنت کی قابلیت اور تدبر سے ہو جاتی ہے مگر حوریم سلطان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سلیمان اعظم کو آمادہ کیا کہ شہزادوں کو محل میں قید رکھ کر تعلیم دی جائے۔یہیں سے شاہی خاندان کا زوال شروع ہوتا ہے،شہزادوں کی تعلیم کے نصاب سے جسمانی تربیت اور عملی تجربے کے اجزاء خارج کر دیئے گئے۔قدیم زبانوں اور مختلف علوم وفنون کی تعلیم انہیں اب بھی دی جاتی تھی مگر اب وہ تخت نشینی کے وقت تک قصر شاہی کے باہر قدم نہیں رکھنے پاتے تھے،نتیجہ یہ ہوا کہ اب بادشاہ ایسے لوگ ہونے لگے جو ناز ونعم میں پلتے تھے،عیش

وآرام کے عادی ہوتے تھے اور اپنی سلطنت کے حالات سے بالکل ناواقف۔)

۶۔خوشامد پسندی اور رشوت

سترہویں صدی کے آغاز سے ہی نااہل سلاطین کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو عیش پسند اور غافل تھے اور جو عیش پسند نہیں تھے وہ حد سے زیادہ ظالم تھے اور حرم کے زیر اثر تھے اور انتہائی بد اطوار تھے۔ ان کی منظورِ نظر ملکائیں سلطنت کے بڑے اور اہم عہدے نیلام کرنے لگیں۔ اسی طرح انتظامی اور فوجی عمال بھی سلطانوں کی دیکھا دیکھی عیش پسند ہو گئے اور رشوتیں دے کر اعلیٰ عہدے حاصل کرنا ان کا وطیرہ ہو گیا۔ قابلیت کے بجائے چاپلوسی اور ترقی کا معیار قرار پائی۔ رشوت کو سب سے پہلے وزیر اعظم رُستم پاشا نے فروغ دیا جو سلطان سلیمان اعظم کا داماد بھی تھا۔ ڈاکٹر محمد عزیر اپنی کتاب ''دولت عثمانیہ'' میں رقم طراز ہیں:

> ''رشوت ستانی کی بنیاد رُستم پاشا نے ڈالی، یہ شخص سلیمان کا داماد تھا اور پندرہ سال تک وزیر اعظم رہا۔۔۔سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ مقرر کیے جاتے رُستم پاشا ان کے تقرر کے موقع پر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا۔۔۔فوجی اور بحری عہدوں پر وہی اشخاص مقرر کیے جانے لگے جو اپنے تقرر کے وقت کثیر رقمیں پیش کرتے، گویا تمام ملازمتیں نیلام ہونے لگیں۔۔۔رُستم پاشا نے اپنی وفات پر جو جائیداد چھوڑی اس کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے: اناطولیہ اور رومیلیا میں ۸۱۵ مزروعہ زمینیں، ۴۷۶ پن چکیاں، ۱۷۰۰ اغلام، ۲۹۰۰ زرہ بکتر ۱۸۰۰۰ امامے، ۷۶۰ تیغے، ۶۰۰ جلدیں قرآن پاک کی، ۵۰۰۰ دوسری کتابیں اور بیس لاکھ دوکات۔''(۱۰)

سلاطین عثمانیہ جواب تک اپنے آباءواجداد کی طرح مردانگی کے جوہر رکھتے تھے، اب بازنطینی فرماں رواؤں کی طرح آرام طلب اور عیش پرست ہو گئے۔ اس عہد کا قصر عثمانی، بازنطینی شاہی محل کی طرح تھا۔ ان میں بہت کم سلاطین ایسے ہوئے جو طبعی موت مرے ہوں کیوں کہ سترہویں صدی میں فوج کی بغاوت اور سلاطین کی معزولی اور قتل ایک عام سی بات تھی۔

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ قتل و ہلاکت کے اس رواج کو انہوں نے قانون کا نام دے رکھا تھا۔ اس ہلاکت وخونریزی کے سلسلے کی تفصیلات کو مولانا سعید اکبر آبادی نے بیان کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''قصر شاہی طرح طرح کی ناپاک سازشوں اور فریب کاریوں کا مرکز بن جاتا ہے اور ان کا ظہور بسا اوقات نہایت ہی دردناک قتل کی صورتوں میں ہوتا ہے چنانچہ بایزید یلدرم نے اپنے برادرِ خورد یعقوب چلپی کو۔۔۔سلطان سلیم اوّل نے اپنے دو بھائیوں احمد اور کرکود کو قتل کرایا۔۔۔سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ نے۔۔۔عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ اپنے دودھ پیتے بھائی کو جو سرویا کی شہزادی کے بطن سے تھا۔۔۔حوض میں غرق کرا کر ہلاک کرا دیا۔ پھر محمد فاتح نے اپنے اس فعل پر نادم یا پشیمان ہونے کے بجائے بمصداق ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' یہ بھی کیا کہ حکومت وسلطنت

کے تحفظ کی خاطر بھائیوں کے قتل کو قانوناً جائز ہی قرار دے دیا۔ سلطان محمد فاتح کے اس خونیں قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ مراد ثالث نے اپنے پانچوں بھائیوں کو اور اس کے بیٹے محمد ثالث نے اپنے انیس بھائیوں کو اسی قانون کی آڑ لے کر بے رحمی سے قتل کرا دیا۔"(۱۱)

۷۔ ولی عہدی

زوال سلطنت عثمانیہ کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ولی عہدی کا رواج بھی ہے کیوں کہ اسلام نے بادشاہ یا خلیفہ کے انتخاب کا جو طریقہ تجویز کیا ہے وہی کسی حکومت کے استحکام اور مضبوطی کا کفیل ہو سکتا ہے۔ ولی عہدی کے رواج سے جیسا کہ عباسی خلافت میں کثرت سے ہوا، ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ خلیفہ یا بادشاہِ وقت کا ہر بڑا لڑکا یہ یقین رکھتا تھا کہ باپ کے بعد لازماً وہ وارث تاج وتخت ہوگا۔ اس بنا پر اس کو اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ شاہانہ عادات وخصائل پیدا کر کے اپنے آپ کو اس اعلیٰ منصب کا مستحق بھی ثابت کرے۔ وہ سمجھتا تھا کہ حکمرانی کی عدم صلاحیت کے باوجود بہرحال خلیفہ وہی ہوگا۔ دوسری جانب بعض عمال وامراء اور بوالہوس قسم کے مصاحبین اس کے گرد جمع ہو جاتے اور ہر اس کے ہر اچھے برے کام کو سراہتے اور اس کی ہاں میں ہاں ملا کر ولی عہد کے دل میں اپنے لیے جگہ بنا لیتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ولی عہد کو اپنی کمزوریاں اور خامیاں بھی اضافی خوبیاں محسوس ہوتیں اور وہ عمر بھر بر خود غلط بنا رہتا۔ پھر جب یہ ولی عہدی سے ترقی کر کے تخت نشین ہوتا تو یہی غرض کے بندے ندیم ومصاحب اس کو اپنی اپنی اغراض کے لیے آلہء کار بنا لیتے اور اس کی سلطنت فتنوں اور ہنگاموں میں گھر کر رہ جاتی۔

غرض یہ کہ ان تمام مفاسد اور خود غرضیوں اور سفاکیوں کا اصل سبب ولی عہدی کا رواج تھا جب کہ اگر اسلام کا عطا کردہ جمہوری طریقہ انتخاب رائج رہتا تو کم از کم خلافت وبادشاہت کا ہر اُمیدوار اپنے اخلاق وکردار اور افعال واعمال کو زیادہ سے زیادہ راست وپسندیدہ بنا کر رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتا پھر جو شخص بھی تخت پر متمکن ہوتا تو چونکہ جمہور کی رائے اس کی پشت پناہ ہوتی اس لیے کوئی اس کے خلاف سازش وبغاوت کی جرأت نہ کرتا۔

۸۔ غیر ملکی اور غیر مسلم خواتین سے شادیاں

زوال کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ سلاطین عثمانیہ کنیزوں اور غیر مسلم وغیر ملکی عورتوں سے شادیوں کے معاملہ میں نہایت غیر محتاط تھے اور ان سے نکاح کرنے یا کنیزوں کو محل کے حرم میں داخل کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے سلطان اُورخان نے کینٹا کوزین کی لڑکی تھیوڈورا سے شادی کر کے اُسے مسیحیت پر قائم رہنے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح

بایزید یلدرم نے شاہِ سرویا کی بہن ڈیسپنیا سے نکاح کیا۔اس کے بعد سلطان سلیمان اعظم نے روسی کنیز حوریم سے نکاح کیا اور اس کے بیٹے سلیم ثانی نے بھی غیر مسلم کنیز سے شادی کی۔ یہ سب خواتین تو محل میں بیگمات بن کر رہتی تھیں اور اُمورِ سلطنت میں بہت زیادہ دخیل تھیں۔ان کے علاوہ بہت سی غیر مسلم باندیاں اور کنیزیں حرم محل میں رہتی تھیں جن کا کوئی شمار نہ تھا۔ یہ ہمیشہ سازشوں کے تانے بانے بُنتی رہتیں۔ چنانچہ مشہور مصری دانش ور استاذ کرد علی خلافت عثمانیہ کے انحطاط وسقوط پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولعله يعد من الأسباب الجوهرية في الانحطاط تغير الدم السلطاني في آل عثمان تغيرا كبيرا الكثرة ما اقتنوا من السراری الجوری النصرانيات''[۱۲]

(آل عثمان کے انحطاط کا ایک جوہری سبب یہ ہے کہ عیسائی باندیوں اور کنیزوں کی کثرت کی وجہ سے سلطانی خون بہت زیادہ بدل گیا تھا۔)

چنانچہ سلیم ثانی نصف ترک اور نصف روسی تھا کیوں کہ اس کی ماں حوریم سلطان روسی نسل کی تھی۔محمد ثالث آدھا اطالوی تھا کہ اس کی والدہ وینس (Venice) کی باشندہ تھی۔اسی طرح عثمان ثانی، مراد رابع اور ابراہیم اوّل نصف رومی تھے کہ ان سب کے مائیں رومی النسل تھیں۔ان غیر مسلم اور غیر ملکی خواتین کی محل میں کثرت کا وہی نتیجہ رونما ہوا جو خلفائے عباسیہ کے ہاں ہوا تھا یعنی جب تک صاحب بصیرت، بیدار مغز اور شجاع سلاطین پیدا ہوتے رہے، اُمورِ سلطنت ان خواتین کے عمل دخل سے پاک رہے لیکن جب سے نا اہل، عاقبت نااندیش، غافل، عیش پسند اور نالائق سلاطین سریرآرائے سلطنت ہونے لگے تو عنانِ حکومت بھی در پردہ انہیں خواتین کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی۔''دولت عثمانیہ'' کے فاضل مصنف معروف مؤرخ اُمورِ سلطنت عثمانیہ ڈاکٹر محمد عزیر رقم طراز ہیں:

''حرم کی چار خاتونوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ اس پر بہت زیادہ تھا اور اُمورِ سلطنت کا انصرام حقیقتاً ان ہی خواتین کے منشاء کے مطابق ہوتا تھا۔''[۱۳]

۹۔ ینی چری فوج کی بغاوت اور اُمورِ سلطنت میں دخل اندازی

ینی چری، ترکوں کی ایک نہایت ہی منتخب اور بہادر فوج تھی، یہاں تک کہ ان کو سلطنت کا دست راست بھی کہا جائے تو بجا ہے لیکن محلاتی سازشوں کے ناگفتہ بہ حالات کی بنا پر فوج میں اطاعت اور فرماں برداری کا جذبہ رفتہ رفتہ مفقود ہوتا گیا۔ یہ بھی زوال سلطنت کا ایک اہم سبب تھا۔کیوں کہ سلیم ثانی اور مراد ثالث اور ان جیسے دیگر نااہل اور عیش کوش سلاطین کی اُمورِ حکومت سے غفلت ولاپروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ینی چری فوج سلاطین سے باغی ہوتی گئی اور اُمورِ سلطنت میں ان کا عمل دخل اس قدر ترقی کر گیا کہ وہ امراء اور وزراء کے ساتھ مل کر اور بعض اوقات ان کی مدد کے بغیر بھی جس کو چاہتے تخت سلطنت پر بٹھاتے اور جس کو چاہتے قتل کر دیتے۔ان کی سرکشی اور بغاوت اس قدر بڑھتی گئی کہ ۱۸۸۹ء میں ینی چریوں نے قصر

خلافت کے سامنے اپنے مطالبات منوانے کے لیے مظاہرہ کیا جن کو بالآخر سلطان کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کے بعد تو فوج کو اتنی جسارت ہوگئی کہ وہ جب چاہتی علم بغاوت بلند کر دیتی۔ حتیٰ کہ صدرِ اعظم اور دیگر اہم مناصب پر تقرر و تنزل بھی فوج کی منشاء اور خواہش کے مطابق ہونے لگا اور سلاطین کی حیثیت رفتہ رفتہ محض کٹھ پتلی کی ہوگئی اور حکومت ان کے ہاتھوں بازیچہء اطفال بن کر رہ گئی۔

۱۰۔ وزراء اور امراء کی خیانت وغداری

امراء و وزراء کی خیانت و غداری یہاں تک پہنچی کہ انہیں دولت عثمانیہ کے بدترین دشمنوں سے ساز باز کرنے میں بھی کوئی عار نہ محسوس ہوتی۔ ہوسِ دنیا، ذاتی مفادات، نفسانیت اور اغراض پرستی انہیں عین جنگ کے مواقع پر بھی وفاداری بدلنے پر مجبور کر دیتی۔ خلافت عثمانیہ کے دشمنوں میں سب سے زیادہ خطرناک دشمن روس تھا۔ سلطان احمد خان ثالث کے دورِ حکومت میں روسی شہنشاہ پیٹر اعظم قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی غرض سے خلافت عثمانیہ کے علاقوں پر تاخت و تاراج کے لیے روانہ ہوکر دریائے پرتھ کو عبور کرنے کے بعد خیمہ زن ہوا تو اس کو معلوم ہوا کہ سامنے کی پہاڑیوں میں ترکی کا صدر اعظم بلطہ جی محمد پاشا دو لاکھ کا لشکر جرار لیے ہوئے موجود ہے۔ اس وقت جنگی نقطہء نظر سے شہنشاہِ روس بڑی خطرناک حالت میں تھا وہ تین اطراف سے گھرا ہوا تھا۔ ایک تو اس کے لشکر کی تعداد ترکی فوج کے مقابلے میں بہت کم تھی، عقب میں دریا تھا جب کہ دوسری طرف ایک وسیع اور مہلک دلدل تھی اور سامنے صدر اعظم محمد پاشا ترکی کی فوج لیے موجود تھا۔ اس واقعہ کی تفصّل بیان کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

> ''اگر محمد پاشا چاہتا تو پیٹر اعظم کو قتل یا گرفتار کرسکتا تھا لیکن شہنشاہ کی ملکہ کیتھرائن نے جو حسن و جمال کے علاوہ ذہانت وذکاوت میں ممتاز تھی تدبیر یہ کی کہ بہت کچھ مال و دولت، سونا اور زیورات بلطہ جی محمد پاشا کے نائب کے پاس بطورِ نذرانہ بھیج دیا اور نائب نے صدر اعظم محمد پاشا کو آمادہ کیا کہ وہ ایک معاہدہ کرکے اپنا محاصرہ اُٹھالے، چنانچہ یہی ہوا اور روس کی فوج سلامتی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ ایسا ہی ایک واقعہ سلطان عبدالحمید کے عہد میں ہوا، محمد علی پاشا خدیو مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ترکوں کو نصیبین میں شکست فاش دی جس سے اغلب یہ تھا کہ ابراہیم کا اقتدار ایشیائے کوچک میں بڑھ جائے گا۔ ایسے نازک موقع پر احمد پاشا قپودان نے سارا ترکی بیڑہ اسکندریہ میں لاکر خدیو مذکور کے حوالہ کردیا، اگر انگلستان بیچ میں نہ پڑتا تو خدیو مصر قسطنطنیہ پر بھی قابض ہوجاتا اور ترکی سلطنت صفحہء ہستی سے ہی مٹ جاتی۔''(۱۴)

اسی طرح سلطان عبدالحمید ثانی کے دورِ اقتدار کے زمانہ میں انگریز جزیرۂ سائپرس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن سلطان اس پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر ۱۸۷۸ء میں جب صفوت پاشا وزیرِ اوّل مقرر ہوا تو اس نے سب سے پہلے جزیرۂ سائپرس ہی انگریزوں کے حوالے کر دیا اور سلطان کے سامنے یہ عذر گھڑ لیا کہ

اس عنایت خسروانہ پر انگریز برلن کانفرنس میں ہماری حمایت کریں گے۔

۱۱۔اہلِ علم کا جمود اور پس ماندگی

ترکوں میں سب سے بڑا مرض جو پیدا ہوا وہ ان کا جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون حرب وضرب اور تنظیم عسا کر کی ترقی میں بھی رفتہ رفتہ جمود چھا تا گیا۔ وہ قرآن کی اس ہدایت کو بالکل فراموش کر بیٹھے:

"وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَ مِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لاَ تَعْلَمُونَهُمْ"(۱۵)

(مسلمانو!) جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اپنا ساز وسامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔)

بعد میں آنے والے سلاطین عثمانیہ نے اسلام اور تعلیماتِ اسلام سے بھی روگردانی کی اور نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کو بھی پس پشت ڈال دیا:

"الحكمة ضالّة المؤمن حيث وجدها فهو حقُّ بها"(۱۶)

(دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں سے اس کو مل جائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔)

ان حالات میں جب کہ سلاطین عثمانیہ اپنی حریف مغربی اقوام اور مغربی ریاستوں میں گھرے ہوئے تھے، انہیں مصر کے فاتح سیدنا عمرو بن العاصؓ کی درج ذیل وصیت مدنظر رکھنی چاہیے تھی جو انہوں نے مصر کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کی تھی۔ آپؓ نے فرمایا تھا:

"واعلموا أنكم في رباط إلى يوم القيامة لكثرة الأعداء حولكم وتشوف قلوبهم إليكم وإلى داركم معدن الزرع والمال والخير الواسع البركة النامية"(۱۷)

(اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو اور ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہوئے ہو اس لیے تم کو ہمیشہ مسلح رہنا چاہیے کیوں کہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں۔)

اس ملی تنزل وانحطاط کے اثرات سے اہل علم وفضل بھی نہ بچ سکے حالانکہ علماء ومشائخ عوام اور مقتدر طبقے دونوں میں مقبول ومحترم تھے اور دونوں میں بڑا اثر واقتدار رکھتے تھے۔ محترمہ خالدہ ادیب خانم علماء کرام کے اغماض اور غفلت شعاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"As long as the world remained scholastic, the Moslem Religious Body did its duty admirably, and the Sulemanieh and Fatih Medressehs were the centres of learning, and of whatever science there was at the time. But when the West broke the chains of scholasticism and created a new learning and science, the effects of which were to change the face of the world, the Islamic Religious Body failed very badly in its educational function. The Ulema took it for granted that human knowledge had not grown beyond what it was in the thirteenth century, and this attitude of mind persisted in their educational system down to the middle of the last century. The complacence of the Ulema in Turkey particularly and in the Moslem world generally had nothing to do with their loyalty to the teachings of Islam, for scholastic philosophy and theology Christian or Moslem is Hellenic."(18)

(ملت اسلامیہ کی تعلیم انہی علماء کے ہاتھوں میں تھی، جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفے کی حکومت رہی، یہ لوگ اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے۔ مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسہ فتحیہ اس زمانے میں تمام مروجہ علوم وفنون کے مرکز تھے مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئے علم وحکمت کی بنا ڈالی، جس نے حیاتِ عالم میں ایک انقلاب برپا کر دیا تو علماء کی جماعت تدریسی فرائض انجام دینے کے قابل نہ رہی۔ یہ علماء سمجھتے تھے کہ علم تیرہویں صدی میں جس مقام پر تھا، وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا۔ یہ طرزِ فکر انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظامِ تعلیم پر حاوی رہا۔ ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کے علماء کا یہ طرز فکر جذبہء اسلامی سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ فلسفہ کلام یا علم کلام خواہ عیسائیوں کا ہو یا مسلمانوں کا، یونانیوں کے فلسفے پر مبنی ہے۔)

ترکی کے یہ علماء کرام لکیر کے فقیر تھے اور کسی اصلاحِ جدید کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب سلطان سلیم خان ثالث نے ترکی میں جدید علوم وفنون کے مدارس قائم کرنے اور فوج کو جدید فنونِ حرب وضرب سے روشناس کرانے، ان کو جدید آلاتِ حرب وضرب سے آراستہ کرنے کے لیے تعلیمی اور فوجی اصلاحات کرنا چاہیں تو اس منصوبہ کی سب سے زیادہ مخالفت علماء کی اسی جماعت کی

طرف سے ہوئی۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ جاری کر دیا کہ جدید فوجی لباس پہننا شعارِ اسلام کے خلاف ہے۔ ینی چری فوج کی پشت پناہی بھی علماء کو حاصل تھی۔ نتیجتاً ینی چریوں نے سلطان کے خلاف فوجی بغاوت کر دی اور جو امراء و حکام ان اصلاحات کے حامی تھے، سب کو چن چن کر اور بے دردی سے قتل کر دیا۔ یہ قتل عام دو دن تک جاری رہا، سلطان نے فوج کی یہ خودسری اور شورش پسندی دیکھ کر مجبوراً تمام اصلاحات منسوخ کر دیں لیکن ینی چری فوج کے آتشِ غضب اس پر بھی فرو نہ ہوئی بلکہ انہوں نے مفتی اعظم سے جواز کا فتویٰ اور شیخ الاسلام سے شرعی جواز کی سند حاصل کر کے سلطان سلیم کو معزول کر دیا۔

۱۲۹۳ھ میں سلطان عبدالحمید ثانی تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے بھی سلطنت کی اندرونی دگرگوں صورت حال کو واضح طور پر محسوس کیا اور مملکت اسلامیہ کی زبوں حالی وابتری کی درستی و اصلاح کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اصلاحات کی سکیم نافذ کرنی چاہی لیکن اس کا بھی وہی انجام ہوا کہ شریعت اسلام کے نام پر فوج اس نئے اصلاحی دستور کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی اور شیخ الاسلام سے فتویٰ حاصل کر کے سلطان عبدالحمید ثانی کو بھی تخت خلافت سے معزول کر دیا۔

۱۲۔ ترکی کی حریف اقوام کی بیداری

زوال کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ترکوں کا جمود اور اپنی حریف اقوام کی بہ نسبت پسماندگی بھی تھی۔ ایک طرف ترک قوم کی یہ حالت تھی کہ جمود و بے حسی اور غفلت و درماندگی کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی جب کہ دوسری طرف ان کا سب سے بڑا حریف اور دشمن یورپ اپنی جہالت و نادانی سے بیدار ہو کر اپنے تاریک دور سے نکل آیا تھا اور علوم وفنون کی طرف متوجہ ہو کر نئی نئی ایجادات اور جدید آلاتِ حرب وضرب سے مسلح ہو رہا تھا۔ اہل یورپ کے دلوں سے ترکوں کا رعب و دبدبہ اور مرعوبیت کا احساس محو ہو رہا تھا۔ اس سے یورپی اقوام میں طبعی طور پر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ ترکی پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ یورپ کا یہ ''مردِ بیمار'' اپنی آخری سانسوں ہی میں گھٹ کر ختم ہو جائے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس صورت حال کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> ''یورپین اقوام کے ان منصوبوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی، روس، یونان اور دوسری بلقانی ریاستوں نے انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ ساز باز کر کے ترکی پر یورشیں شروع کر دیں اور اب عثمانی مقبوضات یکے بعد دیگرے ترکوں کے قبضہ سے نکلنے شروع ہو گئے۔۔۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحر روم کے مشہور جزائر کریٹ، قبرص اور مالٹا ترکوں کے قبضہ سے نکلے۔ پھر بغداد، شام، لبنان اور فلسطین سے موصل تک کا سارا علاقہ ان سے چھین لیا گیا۔ جو بلقانی ریاستیں ترکی کی باج گزار تھیں وہ آزاد ہو گئیں اور خود ایشیائے کوچک کے بھی حصے بخرے ہو گئے۔''(۱۹)

۱۳۔عربوں کی بغاوت

عربوں کی بغاوت بھی ترکوں کے زوال کا سبب بنی۔پہلی جنگ عظیم کا سب سے اندوہ ناک پہلو یہ تھا کہ ترک سلاطین اپنی تمام تر غفلتوں، کوتاہیوں اور سیاسی کج اندیشیوں کے باوجود سلطان سلیم اوّل کے خلافت حاصل کرنے سے لے کر اب تک خود کو ''خادم الحرمین الشریفین'' کہلاتے اور اس پر فخر کرتے آئے تھے۔جب کہ اب تک انہوں نے عربوں کے لیے کچھ خاص نہیں کیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ عربوں اور خصوصاً شریفِ مکہ نے اپنے دینی فرائض اور اسلامی بھائی چارے سے صرفِ نظر کر کے ان کے ساتھ دجل وفریب کرتے ہوئے اور خود مختار عرب اسٹیٹ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کر کے علم بغاوت بلند کر دیا اور ترکی کی فوج جو حجاز میں تھی اُسے نکال باہر کیا۔

عربوں نے قوم پرستی اور نسلی تفاخر وتعصب کا ثبوت دیتے ہوئے اُمت مسلمہ کے اجتماعی مفادات کو پس پشت ڈال دیا۔اس افسوس ناک اور الم ناک رویہ کے بارے میں معروف ہندوستانی سکالر ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی رقم طراز ہیں:

> ''عرب مصنفوں نے بالعموم اس سلسلہ میں قوم پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، انہوں نے ایک مسلمان کی حیثیت میں اسلامی معیار پر ترکی اور خلافت عثمانیہ کو نہیں پرکھا بلکہ ایک قوم پرست کی نگاہ سے اس کا جائزہ لیا جو عربوں میں حق خودارادیت، تحریک آزادی اور ''پنجۂ استبداد'' سے رہائی کا پرجوش مبلغ تھا اس پر مستزاد یہ کہ قوم پرستی کی یہ تحریکیں عربوں میں اسلام دشمن طاقتوں کے درمیان سخت منافرت، تصادم اور آویزش کا ماحول پیدا کر دیا اور ترک دشمنی میں عرب ''کُونُوا عبادالله اخواناً'' کا ابدی پیغام فراموش کر بیٹھے۔''(۲۰)

یہ وہ اسباب تھے جن کی بنا پر خلافت عثمانیہ کا سقوط ہوا۔ترکی جسے ملت اسلامیہ اپنی آبرو اور اپنا محافظ تصور کرتی تھی، بدنصیبی سے اس طرح انتشار وخلفشار کا شکار ہوا کہ جنگ عظیم اوّل کے بعد اس کی طاقت وسطوت اور عظمت وشوکت منتشر ہو کر قصۂ پارینہ بن گئی۔یہود ونصاریٰ نے بھی در پردہ اور خفیہ سازشوں کے ذریعہ ترک افواج کو دین اسلام اور خلافت اسلامیہ سے برگشتہ خاطر کر کے اور جہالت وپسماندگی کی تمام تر ذمہ داری اسلام اور نظامِ خلافت پر ڈال کر سیکولرازم اور قوم پرستی کے جذبات کو نہایت سرعت اور ہوشیاری سے ہوا دی۔اس صورت حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مصطفیٰ کمال پاشا نے ترک خلافت کا خاتمہ کر کے عنانِ قیادت خود سنبھال لی اور اصلاح وترقی کے نام پر ایسے متعدد اقدامات کیے جن سے ترکی میں عربی زبان، رومی ٹوپی، اسلامی شعار اور مختلف دینی مظاہر پر پابندیاں عاید کر دیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، ضربِ کلیم، مشمولہ: ''کلیاتِ اقبال''، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص۵۹۹

۲۔ آزاد، ابوالکلام، مولانا، قرآن کا قانونِ عروج وزوال، لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء، ص۱۱۴

۳۔ فاطر۳۵: ۴۳

۴۔ آزاد، ابوالکلام، مولانا، قرآن کا قانونِ عروج وزوال، ص۱۱۵

۵۔ ایضاً، ص۱۲۲، ۱۲۳

۶۔ ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س ن، ص۱۸۳

۷۔ شکیب ارسلان، امیر، علامہ، اسبابِ زوالِ اُمت، (مترجم: ڈاکٹر احسان بک سامی حقی)، اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی، ۲۰۱۲ء، ص۴۲

۸۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: الجبرتی، عبدالرحمٰن بن حسن، العلامۃ، عجائب الآثار فی التراجم والأخبار، (تحقیق: الأستاذ الدکتور عبدالرحیم عبدالرحمٰن عبدالرحیم)، القاھرۃ: مطبعۃ دارالکتب المصریۃ طبع بولاق، ۱۹۹۷ء، ۱۳۴/۳

8. Khalida Adeeb Khanum, "Conflict of East and West in Turkey", Maktaba Jamia Millia Islamia, DELHI. 1935, Pg: 36

9. Ibid, Pg: 36,37

۱۰۔ محمد عزیر، ڈاکٹر، دولتِ عثمانیہ، اعظم گڑھ، انڈیا: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۹ء، ۲۰۲/۱

۱۱۔ سعید احمد اکبر آبادی، پروفیسر، مولانا، مسلمانوں کا عروج وزوال، لاہور: ادارہ اسلامیات، اپریل ۱۹۸۳ء، ص۱۵۶

۱۲۔ کرد علی، الاستاذ، الإسلام والحضارۃ العربیۃ، القاہرۃ: الإدارۃ الاسلامیہ فی عز العرب، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء، ۴۹۹/۲

۱۳۔ محمد عزیر، ڈاکٹر، دولتِ عثمانیہ، ۲۱۰/۱

۱۴۔ اکبر آبادی، سعید احمد، پروفیسر، مولانا، مسلمانوں کا عروج وزوال، ص۱۶۰، ۱۶۱

۱۵۔ الانفال۶:۶۰

۱۶۔ ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ، امام، الجامع، (تحقیق: احمد شاکر)، بیروت: داراحیاء التراث العربی، س ن، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، رقم الحدیث: ۲۶۸۷

۱۷۔ جرجی زیدان، تاریخ مصر الحدیث مع فذلکۃ فی تاریخ مصر القدیم، قاہرہ، مصر: مطبعۃ الہلال بالفجالۃ، الطبعۃ الثانیہ، ۱۹۱۱ء، ص۹۹

18. Khalida Adeeb Khanum, "Conflict of East and West in Turkey",

Pg: 40

۱۹۔ سعید احمد اکبرآبادی، پروفیسر، مولانا، مسلمانوں کا عروج وزوال، ص۱٦۳

۲۰۔ فلاحی، عبیداللہ فہد، ڈاکٹر، جدید ترکی میں اسلامی بیداری، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نومبر ۱۹۹۹ء، ص۷، ۸

فقہ ابن حزم میں ''دلیل'' بطور مصدر، ماہیت واقسام

ڈاکٹر حافظ امجد حسین☆/ ڈاکٹر محمد حامد رضا☆☆

Abstract:

"In principle, Fiqah Ibn-e-Hazmbelongs to Fiqah Zahri. In deriving of decrees, he rejects 'Qiyas' and opinions by relying on visible Nasoos. In history, Ibn-e-Hazm Andulisian (d.456 AH1064 AD) is counted among those jurists who discussed all topics in Islamic studies. In his Fiqah, Ibn-e-Hazm has relied exclusively on Four sources, Nasoos e Quran, Ahadeeth and the "Daleel" derived from these fundamental sources. In his opinion, Daleel is not 'Qiyas' but it is derived directly from Nasoos and Ijma'a. Ibn-e-Hazm has described seven kinds of Daleel derived from Nasoos and four kinds derived from Ijma'a. The research paper under discussion explains the meanings and kinds of fourth source of Fiqah Ibn-e-Hazm, Daleel."

Keywords: Islamic Jurishprudence, Ibn-e-Hazm Qiyas, Sources of Islamic Fiqh, Proof (Daleel).

تاریخ اسلامی میں مروّجہ فقہی مذاہب کے علاوہ امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ)، اسحاق بن راہویہ (م ۲۳۸ھ)، داؤد ظاہری (م ۲۷۰ھ)، امام طبری (م ۳۱۰ھ) اور امام ابن حزم (م ۴۵۶ھ) وہ نابغہ روزگار ہستیاں ہیں جو اپنے اپنے عہد میں اپنے فقہی اُصولوں اور اجتہادی بصیرت کی بنا پر مستقل مکاتب فکر رکھتے تھے۔ ان میں سے متاخر ہونے کے باوجود، امام ابن حزم کی متنوع شخصیت اپنی اجتہادی بصیرت اور مؤقر فقہی آراء کی بنا پر خاص اہمیت کی حامل ہے۔ استنباط احکام میں ائمہ اربعہ کے مروجہ فقہی مناہج سے ہٹ کر امام ابن حزم کا نقطہ نظر منفرد ہے۔ انہوں نے طریق اجتہاد میں قیاس ورائے ہر صورت کا رد کیا اور اپنے فقہی مصادر میں صرف ظواہر نصوص کتاب وسنت، اجماع اور دلیل پر ہی انحصار کیا ہے۔ اسی اہمیت کی

☆ لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، سمندری

☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

بنا پر مقالہ ہذا میں فقہ ابن حزم کے چوتھے مصدر و ماخذ ''دلیل'' کی ماہیت و اقسام، درج ذیل عناوین کے تحت بیان کی جا رہی ہیں:

۱۔ فقہ ابن حزم کا مختصر تعارف

۲۔ دلیل بطور مصدر فقہ، مفہوم و اقسام

۱۔ فقہ ابن حزم کا مختصر تعارف

تاریخی اعتبار سے فقہ ابن حزم کا اصولی تعلق، ابو سلیمان داؤد بن علی بن خلف الاصبہانی الکوفی البغدادی الظاہری (م ۲۷۰ھ) کی فکر سے شروع ہوتا ہے۔ اس فکر کے پیرو کار اہل ظاہر، ظاہریہ اور بانی کی نسبت سے داؤدی کہلاتے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی تمسک ظواہر نصوص کو اپنا فقہی اصول قرار دیا تھا۔ ظاہریہ فقہ اسلامی کا ایک فقہی مدرسہ ہے۔ یہ نام لفظ ''ظاہر'' سے مشتق ہے جو اسی مدرسہ کے اصحاب کی فکر میں محدود ہے۔ لغت میں ''ظاہر'' ''باطن'' کی ضد ہے جس کے معانی ہیں کسی چیز کو واضح کرنا۔[۱] اس فقہی مدرسہ کے اصحاب کے نزدیک ظاہریت سے مراد کتاب وسنت کے ظاہری الفاظ سے گہرائی میں جائے بغیر، عمومیت کی بنا پر معنی اخذ کرنا ہے۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کا مقالہ نگار لکھتا ہے۔ ''**فالظاهرية مذهب ياخد الشريعة بظاهر لفظ القرآن و السنة**،''[۲] ظاہریہ ایک دبستان فقہ ہے جس میں احکام کا استخراج الفاظ قران اور سنت کے ظاہری معانی سے کیا جاتا ہے۔

ظاہری فقہی اسلوب کو جن عراقی علماء نے اختیار کیا ان میں اہم یہ ہیں۔ داؤد ظاہری کے بیٹے محمد بن داود بن علی ابوبکر (۲۵۵ تا ۲۹۷ھ)؛ ابراہیم بن محمد نفطویہ (۲۴۴ تا ۳۲۳ھ)؛ ابو اسحاق ابراہیم ابن جابر؛ عبداللہ بن احمد بن محمد المغلس (م ۳۲۴ھ)؛ احمد بن القاضی المنصوری ابو العباس؛ عبداللہ بن علی بن حسین بن محمد النخعی (م ۳۷۶ھ)؛ ابو سعید الرقی؛ حسن بن عبید النہربانی ابو سعید؛ ابو طیب ابن خلال؛ ابو الحسن حیدرۃ؛ عبدالعزیز بن احمد الاصفہانی القاضی الجزری ابو الحسن (م بعد ۳۷۷) اور اندلس میں اشاعت حدیث سے فقہ ظاہری کے لیے راہ ہموار کرنے والے اہم علماء میں سے بقی بن مخلد بن یزید القرطبی ابو عبدالرحمٰن (۲۰۱ تا ۲۷۶ھ)؛ محمد بن وضاح بن بزیغ المروانی الاندلسی ابو عبداللہ (۱۹۹ تا ۲۸۷ھ)؛ قاسم بن اصبغ بن محمد بن یوسف البیانی القرطبی ابو محمد (م ۳۴۰ھ)؛ محمد بن عبد السلام بن ثعلبۃ الخشنی القرطبی (م ۲۸۶ھ)؛ احمد بن خالد بن یزید المعروف ابن الجباب (۲۴۶ تا ۳۲۲ھ)؛ احمد بن سعید بن حزم بن یونس الصدفی الاندلسی ابو عمر (۲۸۴ تا ۳۵۰ھ)؛ خالد بن سعید القرطبی ابو القاسم (م ۳۵۲ھ)؛ خلف بن قاسم بن سہل بن محمد الازدی القرطبی المعروف ابن الدباغ (م ۳۹۳ھ) اور محمد بن احمد بن یحیی بن مفرج القرطبی ابو عبداللہ (م ۳۸۰ھ) ہیں۔ ان محدثین کی مساعی جمیلہ کی بدولت بعد میں ایسے علماء جلوہ گر ہوئے جنہوں نے اعلانیہ فقہ ظاہری اختیار کی ان میں قاضی منذر بن سعید البلوطی الکزنی القرطبی ابو الحکم

(م۳۵۵ھ)؛ان کے بیٹے سعید بن منذر بن سعید(م۴۰۳ھ)؛اورابن حزم کے استاد مسعود بن سلیمان بن مفلت ابوالخیار(م۴۲۶ھ) فقہ ظاہری میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔[۳] پھر ظاہری فقہ کی حمایت و مدافعت کا فریضہ ایسے دور میں ابن حزم کو تفویض ہوا، جب ان ہی جیسی عبقری شخصیت کی ضرورت تھی۔ مغرب میں عین اس زمانے میں فقہ ظاہری کی ترویج کی ذمہ داری ابن حزم نے نبھائی جب مشرق میں ان کے ہم عصر ابن ابی یعلی (م۴۵۸ھ) نے فقہ ظاہری کو شکست دے کر مسلک حنبلی کو فروغ دیا۔ چوتھی صدی ہجری میں کچھ سال فقہ ظاہری نے فقہ حنبلی کی جگہ لی، تاہم اس فقہ کو مستقل قبول عام حاصل نہ ہوسکا۔

ابن حزم نے تمسک ظواہر نصوص کے اصول میں داؤد ظاہری کی پیروی ضرور کی، لیکن ان کی یہ متابعت تقلید کی طرح نہیں تھی کیونکہ انہوں نے عقائد وفقہ کے کئی مسائل میں ان کی مخالفت بھی کی ہے۔ابن حزم نے اپنی فقہ کے اصول وفروع کو قرآن وسنت سے آزادانہ استنباط کر کے مرتب کیا۔اوراس فقہی منہج کے موجود ادب مین بھی صرف ابن حزم کی کتب موجود ہیں جس کے سبب یہ فقہی منہج آج بھی علمی دنیا میں موجود ہے۔اسی لیے مقالہ ہذا میں فقہ ظاہری کو ابن حزم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

تعارف ابن حزم

فقہ ظاہری کے مدار المہام فارسی الاصل ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الاندلسی، رمضان المبارک کی آخری شب بروز بدھ ۳۸۴ھ بمطابق ۷نومبر ۹۹۴ءکو قرطبہ کے علاقہ منیۃ المغیرۃ کے محلے میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد منصور عامری (م۳۹۳ھ)اوراس کے بیٹے المظفر (م۳۹۹ھ) کے وزیر تھے۔اس لیے ابتدائی زندگی خوشحالی میں گزاری۔ابتدائی تعلیم وتربیت خواتین، مربی اوران اساتذہ سے حاصل کی جو آپ کے باپ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے۔آغاز میں فقہ مالکی کو پڑھا، پھر شافعی مسلک اختیار کرلیا اور آخر کار فقہ ظاہر کے پابند ہو کر اس سوچ کی معاونت میں زندگی صرف کردی۔اندلس میں آپ کو مخالفت کی وجہ سے قید بھی ہونا پڑااوراشبیلیہ میں آپ کی کتب بھی نذر آتش کی گئیں۔[۴] ابن حزم کی علوم اسلامیہ کے مختلف موضوعات حدیث، فقہ، اصول، سیرت وتاریخ، لغت وادب، منطق، کلام اور انساب وملل پر موجود ومفقود کتب ورسائل کی تعداد ایک صد سینتیس (۱۳۷) شمار کی گئی ہے۔جن میں سے "المحلی"، "الاحکام"، "الفصل فی الملل" اور "طوق الحمامۃ" نے بڑی شہرت حاصل کی۔[۵] یہ عظیم محدث وفقیہ ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ بروز اتوار بمطابق ۱۵ جولائی ۱۰۶۵ءکی رات اکہتر سال دس ماہ اورانتیس دن کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

فقہ ابن حزم کے دو بنیادی اوصاف ہیں۔

ا۔ظواہر نصوص پر انحصار

فقہ ابن حزم کے مطابق قرآن مجید اور کلام نبوی میں وارد، اوامر ونواہی کا، ظاہری مفہوم اور

وجوب مراد لینا فرض ہے۔ یہ وجوب فی الفور ہوگا سوائے اس کے کہ ان اوامر ونواہی کو وجوب سے ندب، کراہت یا اباحت کی طرف پھیرنے والی کوئی دلیل ہو۔ لکھتے ہیں ''**فصح ان اتباع الظاهر فرض، و أنه لا يحل تعديه أصلا**''،(۶) صحیح یہ ہے کہ ظاہر کی اتباع فرض ہے۔ کسی اور معنی کی طرف متعدی کرنے کو حلال نہیں سمجھا گیا ہے۔ ابن حزم ترک ظاہر اور تاویل کرنے والے کو تارک وحی اور علم غیب کا مدعی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''**و كل من صرف لفظًا من مفهومه فى اللغة فقد حرفه**''،(۷)

۲۔ تعلیل نصوص کی نفی

فقہ ابن حزم میں نصوص کے علل اور احکام کے اسباب تلاش کرنا جائز نہیں۔ قرآن وسنت نے جن مقامات پر احکام کو منصوص قرار دیا ہے، ان اسباب کی بنا پر احکام کو ان مقامات پر نافذ کرنا درست نہیں ہے جہاں یہ اسباب بیان نہیں ہوئے۔ ابن حزم کے مطابق احکام میں علت تلاش کرنا اللہ تعالی سے اس کے افعال کے بارے میں استفسار کرنے کے مترادف ہے جبکہ قرآن پاک میں ہے: ﴿**لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ** (الانبیاء:۲۳)﴾(۸)

احکام شریعت معلوم کرنے کے لیے فقہ ابن حزم میں صرف چار اصول ومصادر پر انحصار کیا گیا ہے:

۱۔ نصوص قرآن

۲۔ نصوص احادیث رسول ﷺ

افعال نبوی ﷺ کو مندوب ومستحسن(۹) جبکہ خبر واحد کی حجیت کو علم وعمل دونوں میں واجب اور قطعی قرار دیتے ہیں۔(۱۰) قرآن سنت میں ہر ایک کے ذریعے دوسرے کے نسخ اور نبی ﷺ سے منقول اجماع سے بھی نصوص کے نسخ کو جائز قرار دیتے ہیں۔(۱۱) ابن حزم کے نزدیک احکام شریعت کی تین (فرض، حرام اور حلال) اقسام ہیں۔ مکروہ اور مندوب کو مباح ہی میں داخل کرتے ہیں۔ ابن حزم کا موقف ہے کہ دنیا کی ہر چیز مباح اور حلال ہے، ماسوائے ان اشیاء کے جنہیں اللہ تعالی نے صراحتاً حرام قرار دیا ہے۔

۳۔ علماء امت کا اجماع

صحت اجماع کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد نصوص پر ہو، امت مسلمہ ان اجماعی احکام کو عہد بعہد نقل کرتی آئی ہو اور علماء اسلام میں سے کوئی بھی اس کا مخالف نہ ہو۔(۱۲)

۴۔ دلیل: مقالہ کے دوسرے حصہ میں اس کے مفہوم اور اقسام کو تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

فقہ ابن حزم میں ان تمام دلائل شریعت کو مسترد کر دیا گیا ہے جن کی بنیاد محض رائے پر ہو، جن میں قیاس،(۱۳) استحسان،(۱۴) سدالذرائع،(۱۵) عرف وعادت، غیر منصوص اجماع،(۱۶) تفسیر باطنی،(۱۷)

تعلیل و تاویل[۱۸] اور مفہوم مخالف[۱۹] شامل ہیں۔امام ابن حزم نصوص میں حقیقی تعارض کے قائل نہیں کیونکہ نصوص میں تعارض واختلاف کے اثبات سے ان کا من عند غیر اللہ ہونا لازم آتا ہے۔تاہم بظاہر درآنے والے تعارض کی چار صورتوں (اقل کا اکثر سے استثناء، ایک نص کے حکم کو دوسری کے عموم میں داخل کرنا، دلیل کی بنا پر ایک نص کو دوسری کی مخصص یا منسوخ قرار دینا) میں تطبیق وتوفیق کر دیتے ہیں۔[۲۰] اور انہوں نے ایک نص کو دوسری پر ترجیح دینے کی بھی مخالفت کی ہے۔[۲۱] ان کے نزدیک تقلید جائز نہیں خواہ کسی صحابیؓ ہی کی کیوں نہ ہو۔[۲۲] اور ہر عام وخاص کے لیے اجتہاد کو لازم قرار دیا ہے۔[۲۳] منصوص مقاصد شریعت پر اعتبار کرتے ہوئے کئی مسائل کے حل میں انسانی مصالح کا خیال رکھا ہے۔[۲۴]

۲۔دلیل بطور مصدر فقہ، مفہوم واقسام

دلیل واحد ہے اس کی جمع ادّلہ، ادّلاء، دلالۃ ہے اور ان کی جمع الجمع دلائل ہے۔اس کے معنی ہیں ہر وہ چیز جس سے راہنمائی ہو سکے یعنی حجت، دلیل ومرشد وغیرہ۔[۲۵] ابن حزم کے نزدیک مفہوم کے اعتبار سے برہان، حجت، دلالۃ، دلیل کے مترادف ہیں اور کسی سے دلیل طلب کرنا استدلال کہلاتا ہے۔ لکھتے ہیں۔''**الدلیل ما استدل به وقد یکون برهانًا**''[۲۶] اہل ظاہر احکام میں قیاس کو حجت شرعی تسلیم نہیں کرتے۔قائلین قیاس کہتے ہیں کہ اہل ظاہر نے قولاً تو قیاس کو رد کیا مگر استنباط احکام سے مجبور ہو کر فعلاً قیاس پر عمل کیا، جس کا نام انہوں نے دلیل رکھ لیا۔ابن حزم کے ہم عصر ابوبکر احمد بن علی الشافعی المعروف خطیب البغدادی (م۴۶۳ھ) نے داؤد ظاہری کے ترجمہ میں لکھا ہے:

''**ونفی القیاس فی الأحکام قولاً، واضطر الیه فعلًا فسمّاه الدلیل**''[۲۷]

صحیح بات یہ ہے دلیل قیاس نہیں، کیونکہ قیاس میں نص واجماع سے علت کا استخراج کر کے اشتراک علت کی بنا پر اصل کا حکم فرع پر لگایا جاتا ہے جبکہ دلیل، نص واجماع کی ذات سے براہ راست نکالی جاتی ہے۔ابن حزم اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہیں کہ دلیل قیاس ہے یا یہ نص اور اجماع سے کوئی علیحدہ چیز ہے۔ابن حزم لکھتے ہیں:

> ''**ظن قوم بجهلهم أن قولنا بالدلیل خروج منا عن النص والاجماع، و ظن آخرون أن القیاس والدلیل واحد، فاخطئُوا فی ظنهم افحش خطأ......الدلیل مأخوذ من النص و من الاجماع**''[۲۸]
>
> (جہلا نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم دلیل کو بطور اصل تسلیم کر کے نص اور اجماع سے باہر نکل گئے ہیں۔بعض لوگوں کا یہ گمان ہے کہ قیاس اور دلیل ایک ہی چیز ہیں، یہ سب لوگ اپنے اپنے گمان میں سخت غلطی پر ہیں......دراصل دلیل تو نص یا اجماع سے براہ راست ماخوذ ہوتی ہے۔)

دلیل اور قیاس میں یہ فرق ہے کہ قیاس میں مشترکہ علت کی بنا پر اصل کا حکم فرع میں لگایا جاتا

ہے۔ جبکہ دلیل نصوص قرآن وسنت اوراجماع سے براہ راست ماخوذ ہوتی ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تین اُمور، یعنی قرآن مجید، سنت اور علماء اسلام کے اجماع کی اطاعت ہم پر واجب قرار دی ہے۔ جب ان تین دلائل پرغور کرتے ہیں توان میں ایسی چیزیں پاتے ہیں کہ جب وہ جمع ہوجائیں تو اس سے ایک منصوص حکم وجود میں آجائے گا۔ یہ دلیل ہے جو پہلے تین مصادر سے باہر کوئی چیز نہیں۔ ابن حزم نے نصوص وقرآن وسنت اوراجماع کے بعد چوتھے نمبر پر دلیل کو احکام شریعت معلوم کرنے کے لیے مصدروماخذ بنایا ہے۔[۲۹] اسے نص واجماع سے ماخوذ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الدلیل ماخوذ من النص و من الاجماع"[۳۰]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دلیل بھی جا کر نص یا اجماع پرختم ہوجاتی ہے تو اسے نص یا اجماع ہی کہہ دینا چاہیے، ایک مستقل قسم بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سوال کے مندرجہ ذیل جوابات ہیں۔

۱۔ ابن حزم ظاہری ہیں اور فقہ ظاہری میں تعلیل وتاویل کے بغیر معانی ظاہر نص سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ ان ظاہری معانی کو کسی دوسری نص کے ظاہری مفہوم کے بغیر ترک نہیں کیا جاتا۔[۳۱] فہم نصوص کے اس منہج کے مطابق ان دلالات کو نصوص کی ظاہری دلالت قرار نہیں دے سکتے، جن کے بارے میں نصوص واضح الدلالۃ مفہوم نہ بتائیں۔ لہٰذا اہل ظاہر کے نقطہ خیال سے ان کا الگ نام تجویز کرنا ازبس ضروری تھا۔ اس لیے ظاہریوں نے اس کا نام دلیل رکھ لیا۔

شیخ محمد ابوزہرہ کے مطابق کیونکہ یہ مفہوم ظواہر الفاظ سے ماخوذ نہیں ہوتا بلکہ ان دلائل میں ان معانی کو اخذ کیا جاتا ہے جنہیں ان کی دلالت شامل ہے، جو بادی النظر میں ظاہر نہیں ہوتے بلکہ نظر وتامل سے واضح ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی فی الجملہ الفاظ کے ظاہری معانی کے لوازم ہیں۔ تاہم یہ معانی آخرکار الفاظ اور نصوص ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور انہی سے مشتق ومتفرع ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قیاس میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ کیونکہ قیاس کو بھی الفاظ پرمحمول کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں قیاس اور دلیل ایک چیز نہیں۔ قیاس نص پرمحمول تو ہوتا ہے بالکل نص نہیں ہوتا۔ کیونکہ نص یا اجماع سے علت کا استخراج کرکے فرع پر اس اصل کے مطابق حکم لگادیا جاتا ہے جبکہ دلیل نص واجماع سے براہ راست ماخوذ ہوتی ہے۔[۳۲]

۲۔ اجماع سے دلیل کے ماخوذ ہونے پر بھی یہی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اگر وہ حکم، ذات اجماع سے لیا جارہا ہے تو اس کا نام، علیحدہ سے دلیل رکھنے کی کیا ضرورت تھی، اس کو بھی اجماع ہی کہہ دینا چاہیے تھا؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس حکم کا فائدہ حاصل کیا جاتا ہے بعض اوقات اس پر اجماع منعقد نہیں ہوتا بلکہ ذات حکم اور اس کا فہم محل نزاع ہوتا ہے۔ یہ اختلاف اس وقت رونما ہوتا ہے کہ جب اس مسئلہ میں وارد ہونے والی خاص نص پر اعتماد کیا گیا ہو اور وہ عموم جس پر حکم کا اعتماد ہے مبنی بر اجماع ہو۔ یعنی نفس مسئلہ میں اجماع نہیں بلکہ ایک اُصولی اجماع سے مسئلہ کو ماخوذ کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کا

نام اجماع نہیں رکھا جا سکتا۔ اہل ظاہر نے اس کا نام دلیل رکھا ہے۔(۳۳)

الف۔ نص سے ماخوذ دلیل کی اقسام

امام ابن حزم کے مطابق نص سے ماخوذ دلیل کی سات اقسام ہیں۔ جو تمام نص کے تحت آتی ہیں(۳۴) اور وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دلیل جو نص کے ایسے دو مقدمات پر مشتمل ہو جس کا نتیجہ دونوں مقدمات میں سے کسی میں بھی صراحت سے مذکور نہ ہو۔ ان دونوں مقدمات سے نتیجہ کے استخراج کو دلیل کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"کل مسکرٍ خمر و کل خمر حرام"(۳۵)

پہلا مقدمہ: ہر مسکر خمر ہے۔

دوسرا مقدمہ: ہر خمر حرام ہے۔

نتیجہ: ہر مسکر حرام ہے۔

مندرجہ بالا نص کے دونوں مقدمات، اس حکم پر واضح دلیل ہیں کہ ہر مسکر حرام ہے۔ اس حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ ہر مسکر حرام ہے، لیکن نص کے مقدمات سے یہی نتیجہ ماخوذ ہوتا ہے کہ ہر مسکر چیز حرام ہے۔(۳۶)

اس طریقہ استدلال میں عموماً دو قضیے (Propositions) پیش کیے جاتے ہیں، جن سے نتیجہ اور حکم اخذ کیا جاتا ہے۔ ان دو قضیوں کو مرتب اس طرح کیا جاتا ہے کہ پہلے قضیہ میں موضوع مخصوص ہوتا ہے اور دوسرا قضیہ ایسی عمومی بات پر مشتمل ہوتا ہے جس کا اطلاق زیادہ تعداد کے افراد پر ہوتا ہے۔ مثلاً القرآن کتاب سماویٌ وکل کتابٍ سماوی مقدس

پہلا قضیہ: قرآن مجید آسمانی کتاب ہے

دوسرا قضیہ: ہر آسمانی کتاب مقدس ہے

نتیجہ: قرآن مجید مقدس کتاب ہے(۳۷)

اہل ظاہر اسے قیاس سے موسوم نہیں کرتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ نص ہی سے ماخوذ حکم ہے۔

۲۔ دلیل کی دوسری قسم ایسی شرط ہے جو کسی وصف سے مشروط ہو۔ جب بھی یہ وصف پایا جائے تو اس شرط کا حکم واجب ہوگا۔ دراصل یہ قسم، فعل شرط کے عموم کی بنا پر نص سے ماخوذ ہوتی ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قل للّذین کفروا اِن ینتھُوا یُغفرُلھم مَّا قد سَلَفَ"(۳۸)

سے ثابت ہوا کہ ہر وہ شخص جو آئندہ برے کاموں کے ارتکاب سے باز آجائے تو اللہ تعالیٰ

اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیں گے۔ اس حکم کا اطلاق تمام افراد پر ہوتا ہے خواہ وہ مومن ہوں یا مشرک۔ (۳۹)

۳۔متلائمات

متلائمات کے معنی ہیں مناسب رکھنے کی اشیاء۔ دلیل کی یہ تیسری قسم ہے جس کا مطلب ہے۔''**مختلفة الالفاظ متفقة المعانی**''ابن حزم اس کی تعریف یوں بھی کرتے ہیں۔''**ا خبار و قضایا بألفاظ شتی و معناها واحد**''(۴۰) دلیل کی اس قسم کے متعلق الاحکام میں ابن حزم یوں لکھتے ہیں۔''**لفظ بفهم منه معنی فیؤدی بلفظ آخر**''(۴۱)

یعنی ایسا لفظ جس کا ایسا معنی مراد لیا جاتا ہے جسے کسی دوسرے الفاظ سے بھی ادا کیا جا سکتا ہو۔

ا۔مثلاً قرآن مجید کی آیت ہے: ﴿**إنّ ابراهیم لأواه حلیمٌ**﴾(۴۲)یعنی ابراہیمؑ بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ احمق نہ تھے، کیونکہ حماقت وسفاہت حلم کے مفہوم سے ہم آہنگ نہیں۔

۲۔﴿**إنّ ابراهیم لحلیمٌ اواهٌ منیبٌ**﴾(۴۳)

(اس آیت میں ''لحلیم''، ''اواہ''اور ''منیبٌ''متلائمات ہیں۔)

۳۔**ضیغم، اسد، اللیث، الضرغام اور عنبسة**.''(۴۴)

(ان تمام اسماء کا ایک ہی معنی ہے۔ یہ بھی متلائمات میں سے ہیں۔)

۴۔﴿**ولا تقل لّهما أُفٍ وّلا تنهرهما**﴾اور ﴿**وبالوالدین احسانًا**﴾(۴۵)

ان آیات میں والدین کو پیٹنے کی ممانعت بھی پائی جاتی ہے کیونکہ مار پیٹ ان احکام کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی جو اس آیات میں دیے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ والدین کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کیجئے۔انہیں اُف تک نہ کہیے اور ان سے حسن سلوک کیجئے۔بعض علماء کا دعویٰ ہے کہ اہل ظاہر قیاس جلی سے احتجاج کرتے ہیں۔مگر ظاہر یہ اسے قیاس تصور نہیں کرتے بلکہ دلالت لفظ پر محمول کرتے ہیں۔(۴۶)

۴۔ دلیل کی چوتھی قسم یہ ہے کہ اگر کسی چیز کی تمام اقسام سوائے ایک کے باطل ہوں، تو صرف وہ ایک قسم ہی صحیح ہوگی۔مثلاً اگر کوئی چیز حرام ہو تو اس پر حرام کا حکم نافذ ہوتا ہے۔اگر کوئی چیز فرض ہے تو فرض کا حکم ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چیز مباح ہوتی ہے تو وہ صرف مباح ہوگی، فرض یا حرام نہیں ہوگی۔(۴۷) یہ قسم استصحاب الحال میں داخل ہے، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

۵۔قضایا مدرجہ

یہ نص سے ماخوذ دلیل کی پانچویں قسم ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ اوپر والا درجہ اپنے نیچے

والے درجہ پر فوقیت رکھتا ہے، اگر چہ اس پر کوئی نص نہ آئی ہو۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ سے افضل ہیں اور حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ سے افضل ہیں تو یقیناً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ سے بھی افضل تھے۔[(۴۸)]

یہ قسم دراصل دلیل کی پہلی قسم میں داخل ہے کیونکہ یہاں دونوں مقدمات مذکور ہیں اور وہ نتیجہ مذکور نہیں، جوان مقدمات سے ضمنی طور پر مفہوم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ جب افضل الانبیاء ہیں تو لازماً افضل الخلق بھی ہیں۔ کیونکہ انبیاء افضل الخلق ہیں۔

۶۔ عکس مستوی

عکس مستوی کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قضیہ کی تصدیق کرنا مقصود ہو تو اس قضیہ کو الٹ کر دیکھا جائے۔ اگر اس قضیہ کا عکس بھی صحیح ہو تو وہ قضیہ درست ہے۔[(۴۹)] ابن حزم کہتے ہیں کہ کلیہ موجبہ ہمیشہ کلیہ جزئیہ کے برعکس ہوتا ہے۔ ابن حزم نے اپنی کتاب ''التقریب لحد المنطق'' میں کئی شرعی مثالیں ذکر کی ہیں۔ مثلاً:

i- ہر مسکر حرام ہے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ بعض محرمات مسکر ہیں۔

ii- بعض لونڈیوں سے وطی حرام ہے۔ اور ہر حرام سے اجتناب فرض ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعض لونڈیوں سے اجتناب فرض ہے۔[(۵۰)]

۷۔ دلیل تضمنی

دلیل کی اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ لفظ ظاہراً ایک معنی پر دلالت کرتا ہو، لیکن اس معنی کے کچھ لوازم ہوں جو لفظ سے مفہوم ہوتے ہوں۔ مثلاً یہ قول ''زید یکتب''۔ ظاہر ہے یہ جملہ زید کی کتابت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ تاہم اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زید زندہ ہے۔ اس کی انگلیاں متحرک ہیں اور اس کا ایک ہاتھ سالم ہے۔ یہ سب کچھ اشارہ سے سمجھا جاتا ہے عبارت سے نہیں۔

مثلاً قرآن کی یہ آیت: ﴿کل نفسٍ ذائقة الموت﴾[(۵۱)]

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ زید کو موت آئے گی جس طرح ہر ذی روح کو موت آتی ہے اگر چہ مندرجہ بالا آیت میں کسی ذی روح کی صراحت نہیں۔[(۵۲)]

ابن حزم نے دلالت لفظیہ کے بیان کو ختم کر کے لکھا ہے کہ یہ سب دلائل نص کے تابع ہیں جدا نہیں۔ یہ اقسام یا تو اجمال کی تفصیل ہے یا ایک ہی مفہوم کو مختلف عبارتوں سے ظاہر کرتی ہیں۔ حواس و عقل کو قبول کرنا اس آیت کے مطابق ہے ﴿أم لهم أعين يُبصرون بها﴾[(۵۳)]

حواس و عقل ہی کے ذریعے ہم نے قرآن، خدا اور نبوت کو پہچانا ہے۔ یہ عقل و حواس نص کے مطابق ہیں۔ اگر نص نہ ہوتی تو عقل اور حواس کا ادراک کبھی درست نہیں ہوسکتا تھا۔ اور نہ ہی یہ قیاس

ہے۔ کیونکہ یہ براہ راست نصوص واجماع سے ماخوذ ہیں۔[(۵۴)]

ب۔اجماع سے ماخوذ دلیل کی اقسام

ابن حزم نے اجماع سے ماخوذ دلائل کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فأما الدليل المأخوذ من الاجماع فهو ينقسم أربعة أقسام كلها انواع من أنواع الاجماع وداخلة تحت الاجماع و غير خارجة عنه، و هي استصحاب الحال، و أقل ما قيل، و اجماعهم على ترک قوله ما، و اجماعهم على أن حكم المسلمين سواءً''[(۵۵)]

اجماع سے ماخوذ دلائل چار ہیں۔ یہ تمام اقسام، اجماع سے خارج نہیں بلکہ اس کے تابع ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔استصحاب الحال

استصحاب کا لفظ مصاحبت سے نکلا ہے جس کے معانی ہیں ساتھ رہنا، ایک دوسرے سے چمٹے رہنا، باقی رکھنا اور جاری رہنا۔ اصطلاح میں اس سے مراد ہے کہ ماضی میں کسی چیز کی حالت کو زمانہ حال میں جاری رکھنا، جب تک کہ اس حالت کو تبدیل کرنے کی کوئی دلیل نہ پائی جائے۔ اگر کسی چیز کا وجود ماضی میں دلیل کے ساتھ ثابت شدہ ہے اور زمانہ حال میں اس کے وجود کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ملتی تو پھر اس چیز کو زمانہ حال میں بھی اسی طرح موجود سمجھا جائے گا، جیسے وہ ماضی میں تھی کیونکہ اس چیز کا موجود ہونا پہلے سے ہی ثابت چلا آ رہا ہے۔ اگر ماضی میں اس چیز کا عدم وجود دلیل کے ساتھ ثابت ہے اور بعد کے زمانے میں اس کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ملتی تو ماضی میں اس چیز کے عدم وجود کا حکم موجودہ زمانہ میں بھی اسی طرح باقی رکھا جائے گا۔

استصحاب کی حجیت

امام مالک (م۱۷۹ھ)، امام شافعی (م۲۰۴ھ) اور امام احمد بن حنبل (م۲۴۱ھ) استصحاب کو مطلق حجت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک استصحاب کا اُصول احکام کے اثبات اور نفی دونوں میں حجت شرعی ہے۔ حنفی فقہاء استصحاب کو حجت تو مانتے ہیں لیکن اس کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں استصحاب نفی اور عذر میں حجت ہے لیکن اثبات واستحقاق میں حجت نہیں۔ یعنی یہ اُصول کسی کا دعویٰ زائل کرنے میں تو استعمال ہوگا لیکن استقرار حق کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔[(۵۶)]

ابن حزم استصحاب کو حجت تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کا اُصول استصحاب دیگر مسالک فقہ سے زیادہ محدود ہے۔ امام ابن حزم استصحاب کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ جب کسی معاملہ میں قرآن یا سنت ثابتہ سے نص آ جائے اور کوئی شخص اس حکم کی تبدیلی یا باطل ہونے کا دعویٰ اس بنا پر کرے کہ جس چیز

سے متعلق حکم آیا تھا وہ زمان و مکان کی تبدیلی سے بدل چکی ہے، تو مدعی پر اپنا دعویٰ ثابت کرنا لازم ہے۔ وہ قرآن یا سنت صحیحہ سے نص پیش کرے کہ وہ حکم تبدیل یا باطل ہو چکا ہے۔ اگر وہ ایسی دلیل پیش کر دے تو اس کا قول صحیح ہے ورنہ اس کا دعویٰ باطل ہے۔ تمام لوگوں پر فرض ہے کہ وہ مبنی بر نص حکم پر اس وقت تک قائم رہیں جب تک اس چیز کا نام باقی ہے، جس کا حکم نافذ ہوا تھا۔ یہ یقینی امر ہے اور اس میں تبدیلی کا دعویٰ ایسی بات ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ پس یہ دعویٰ جھوٹا ہے، جب تک کہ اس کے حق میں دلیل نہ آ جائے۔(۵۷)

اس عبارت سے حجیت استصحاب میں ابن حزم کا نظریہ مندرجہ ذیل ہے:

☆ استصحاب اس حکم کے باقی رہنے کا نام ہے جو قرآن وسنت کی کسی نص سے ثابت ہو۔ سوائے اس کے کہ اس میں تبدیلی کی کوئی دلیل پائی جائے۔

☆ بلانص کسی چیز کے اصل کا باقی رہنا استصحاب نہیں۔

☆ نص پر مبنی استصحاب، زمان و مکان کی تبدیلی سے نہیں بدلے گا۔ اس کی تبدیلی صرف نص سے ممکن ہوگی کیوں کہ آپ ﷺ قیامت تک سب لوگوں کے لیے نبی ہیں۔

☆ لوگوں پر فرض ہے کہ نص پر مبنی حکم پر اس وقت تک قائم رہیں جب تک اس چیز کا نام باقی ہے۔ اور جب نام بدل جائے تو استصحاب کی رو سے یقیناً اس کا حکم بھی بدل جائے گا۔ لکھتے ہیں۔

> **"وَ اَمّا اِذا تبديل الاسم فقد تبديل الحكم بلا شک كالخمر ينحلل أو بخلل لانَه حرمت الخمر، والخل ليس خمرًا، و كالعذرة تصير ترابًا فقد سقط حكمها"(۵۸)**

امام ابن حزم الباب السادس، میں صراحت کرتے ہیں کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ جو اس وقت تک موجود رہتی ہے جب تک اشیاء کی فرضیت یا ان کے حرام ہونے پر دلیل نہ آ جائے۔ ابن حزم نے اشیاء کی اباحت اصلیہ کو عقل کی بجائے نص سے ثابت کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> **"وقد كان آدم عليه السلام رسولًا فى الارض و قال تعالىٰ له، إذا نزله الى الارض: ولكم فى الارض مستقرٌ و متاعٌ الى حين. فأباح تعالىٰ الاشياء بقوله انها متاع لنا، ثم حظر ما شاء، و كل ذلک بشرع"(۵۹)**

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا رسول بنا کر بھیجا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو زمین پر اُتارا تو فرمایا: ﴿ولكم فى الارض مستقرٌ و متاعٌ الىٰ حين﴾(۶۰) اس آیت میں اشیاء کی اباحت کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول متاع سے ثابت ہوا کہ ہمارے لیے تمام اشیاء مباح قرار دی گئی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا حرام کر دیا اور یہ سب کچھ شریعت کے تحت ہوا۔

ابن حزم کے نزدیک تمام اشیاء میں اصلاً اباحت ہے جو نص سے ثابت ہے۔ کسی چیز کو فرض یا

حرام قرار دینے کے لیے کوئی نص ہونا ضروری ہے۔استصحاب کی رو سے ہر ثابت شدہ چیز اپنی اصل پر قائم رکھی جاتی ہے جب تک کہ اس کے برعکس دلیل نہ مل جائے، یا اس کی تبدیلی نص سے نہ ثابت ہو جائے۔

دلیل تبدیلی کی نص سے آنی چاہیے۔زمان و مکان کی تبدیلی سے حکم نہیں بدلے گا کیونکہ نبی مکرم ﷺ قیامت تک تمام لوگوں کی طرف رسول بن کر آئے ہیں۔لکھتے ہیں:

"البرهان على ذلك صحة النقل من كل كافر و مؤمن على أن رسول الله ﷺ أتانا بهذا الدين. وذكر أنه آخر الانبياء و خاتم الرسل، و أن دينه هذا لازم لكل حى، و لكل من يُولد الى القيامة في جميع الارض، فصح أنه لا معنى لتبديل الزمان، ولا لتبديل المكان، ولا لتغير الأحوال، و أن ما ثبت فهو ثابت أبدًا فى كل زمان و فى كل مكان، و على كل حال، حتى يأتى نص بنقله عن حكمه في زمان آخر، او مكان آخر أو حال أخرى"(٦١)

(ہر مومن و کافر پر اس بات پر واضح دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہمارے پاس یہ دین لے کر آئے۔آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ آپ خاتم الانبیاء اور خاتم الرسل ہیں اور یہ کہ آپ ﷺ کا دین تمام زندہ انسانوں اور اس کرہ ارض پر تا قیامت پیدا ہونے والے تمام لوگوں کے لیے ہے۔معلوم ہوا کہ زمان و مکان اور احوال کی تبدیلی سے اس دین پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔اس دین میں جو چیز ثابت شدہ ہے وہ ہر زمانہ، ہر جگہ اور ہر حال میں ہمیشہ ثابت شدہ رہے گی سوائے اس کے کہ کوئی نص آ جائے جو یہ بتلائے کہ اس کا حکم کسی اور زمانہ، جگہ یا حالت کی طرف منتقل ہو چکا ہے۔)

استصحاب کی اقسام

i۔استصحاب اباحت

اس کا مطلب ہے کہ مباح ہونے کی اصل کو باقی رکھنا۔یہ اُصول ابن حزم نے قرآن پاک کی اس آیت سے مستنبط کی ہے:﴿ولكم فى الأرض مستقر و متاعٌ الى حين﴾(٦٢) اس کے بعد لکھتے ہیں:

"فأباح تعالىٰ الاشياء بقوله انها متاع لنا، ثم حظر ماشاء، و كل ذلك بشرعٍ"(٦٣)

ii۔استصحاب براءت اصلیہ

بری الذمہ ہونے کی اصلیت کو برقرار رکھنا۔یعنی اصلاً کسی انسان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

جو بھی کوئی دعویٰ کرے گا اسے ثبوت لانا ہوگا۔ ابن حزم اس کی کئی مثالیں ذکر کرتے ہیں۔

☆ ہر مدعی نبوت کا انکار ہوگا جب تک کہ وہ اسے ثابت نہ کر دے کیونکہ ہر آدمی اصلاً غیر نبی ہے۔

☆ اگر کوئی کہے کہ ارتداد یا زنا کے ارتکاب سے فلاں مباح الدم ہے۔ اس دعوے دار سے یہ کہا جائے گا کہ ہم نے اس فلاں کو ہر چیز سے بری پایا تھا۔ لہٰذا وہ بری الذمہ ہے جب تک کہ تم اپنے دعویٰ کی دلیل نہ لے آؤ۔

☆ اگر کوئی کہے کہ فلاں عادل فاسق بن گیا یا فلاں فاسق عادل بن گیا یا فلاں زندہ اب فوت ہو گیا یا فلاں عورت سے فلاں مرد نے شادی کر لی ہے یا فلاں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے یا فلاں اپنی ملکیت کا اب مالک نہیں رہا یا فلاں ان اشیاء کا مالک بن گیا ہے جو اس کی ملکیت میں نہیں تھیں اور اس طرح ہر معاملہ میں اشیاء کو ان کی سابقہ حالت پر قائم رکھیں گے جب تک کہ اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ (۶۴)

براءت اصلیہ کا یہ قاعدہ شرعی احکام مثلاً عبادات وغیرہ میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ احکام شرعیہ میں اصل یہ ہے کہ ہر شخص انہیں ادا کرنے کا مکلّف ہے۔ اللہ نے ان سے توحید اور عبادات کی ادائیگی کا وعدہ لیا، کہا ﴿الستُ بربکم قالوا بلٰی﴾ (۶۵) گویا اس میثاق کے دن سے ہر شخص توحید اور اس کے احکام کا مکلّف ہے۔ یہ تکلیف و ذمہ داری صرف اس عرصہ تک کے لیے عدم اہلیت کی بنا پر منقطع ہوتی ہے جو یوم میثاق سے لے کر بلوغت کی عمر کے درمیان ہے۔

۳۔ استصحاب وصف

جب تک کسی چیز کا نام نہ بدلے صرف وصف کی تبدیلی سے حکم نہیں بدلتا۔ ابن حزم نے اس کی مندرجہ ذیل مثالیں ذکر کی ہیں:

☆ شراب سرکہ میں بدل جائے یا تبدیل کر دی جائے تو حرمت کا حکم بدل جائے گا کیونکہ سرکہ حرام نہیں۔

☆ گندگی جب مٹی میں تبدیل ہو جائے تو اس کا وصف و نام بدل جاتا ہے، حکم بھی بدل جائے گا۔

☆ خنزیر حرام ہے لیکن اگر مرغیاں خنزیر کا دودھ یا شراب پی لیں یا مردار کھالیں یا بکری کا بچہ خنزیر کا دودھ پی لے، شراب اور مردار کے نام باقی نہ رہے تو ان کی حرمت بھی ختم ہو جائے گی۔ (۶۶)

گویا جب وصف برقرار رہے تو حکم استصحاب برقرار رہتا ہے۔ جب وصف بدل جائے جسے ابن حزم نام کی تبدیلی قرار دیتے ہیں، تو حکم بھی بدل جائے گا۔

۴۔ استصحاب عام

کسی چیز کا حکم عام اس وقت تک برقرار رکھنا جب تک اس کو خاص کرنے کی دلیل ظاہر نہ ہو۔ وجہ تخصیص کی غیر موجودگی میں کسی چیز کے حکم کی عمومیت کو باقی رکھا جاتا ہے۔ اہل ظاہر کا یہ خاصا ہے کہ وہ

نصوص کے الفاظ کو ان کے عموم پر اس وقت تک برقرار رکھتے ہیں جب تک کہ کسی نص سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ عموم مراد نہیں۔(۶۷)

۵۔استصحاب النص

نص شرعی سے ماخوذ حکم کو اس وقت تک جاری سمجھا جائے گا جب تک کہ کوئی دوسری نص اس کا حکم منسوخ یا تبدیل نہ کر دے۔

''وَ امّا ما ثبت فھو ثابت أبدًا فی کل زمان و فی کل مکان، و علی کل حال، حتی یأتی نص بنقله عن حکمه''(۶۸)

امام ابن حزم نے اپنی فقہ میں اُصول استصحاب سے تمام احوال میں احتجاج کیا ہے۔ان کے نزدیک نقصان کا ازالہ اور حقوق کا اثبات استصحاب سے ہوتا ہے۔جو بات یقین کامل کی روشنی میں ثابت ہو جائے اس کا ازالہ بھی کسی ایسی چیز سے ہوگا جو یقین میں اس کی شبیہ و مثل ہو۔مثلاً یقینی وضوء کے بعد وضوء کے ختم ہونے میں تردد سے وضو نہیں ٹوٹے گا کیونکہ وضوء کرنا یقینی ہے اور ٹوٹنا مشکوک(۶۹) اس سلسلے میں وہ اس فقہی قاعدہ ''**الیقین لا یزول بالشک**''، پر عمل کرتے ہیں۔(۷۰)

ابن حزم کے نظریہ استصحاب میں اس قاعدہ فقہیہ سے مسائل میں اجتہاد کا دروازہ کھل گیا، جس کی وجہ سے فقہی استنباطات میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی۔ابن حزم نے اپنے نظریہ استصحاب کے پیش نظر کئی مسائل کا استخراج کیا ہے۔مثلاً:

سب حیوانات کا بچا ہوا پانی یہاں تک کہ خنزیر کا بھی پاک ہے۔کتّے کے سوا کوئی حیوان مستثنیٰ نہیں۔اس طرح کتا اگر کسی برتن میں منہ ڈال دے تو سات مرتبہ دھونے کی ضرورت ہے جن میں سے ایک بار مٹی سے ہو۔وضوء اور غسل کا استعمال شدہ پانی بھی پاک ہے کیونکہ اصل کے اعتبار سے طاہر و مطہر ہے۔(۷۱) ابن حزم نے یہ سب مسائل استصحاب عام کے تحت اخذ کیے ہیں۔

۶۔الحکم بأقلِّ ماقِیل

جتنی آراء منقول ہوں ان میں سے کم از کم مقدار کو حکم کی بنیاد قرار دینا، کیونکہ اس صورت میں کم از کم مقدار پر اجماع منعقد ہو چکا ہوتا ہے۔اس لیے کم از کم مقدار کو بطور دلیل لیا جاتا ہے۔

امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت نے الحکم بأقل ما قیل کو اجماع کی انواع میں سے ایک نوع کہا ہے۔یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر نص اور اجماع کا اتباع لازم قرار دیا ہے اور بلا دلیل قول سے منع کیا ہے۔جب علماء کسی مسئلہ میں اختلاف کریں تو ان کی ایک جماعت کوئی خاص مقدار واجب ٹھہراتی ہے، مثلاً نفقات پاداش، دیات اور زکوٰۃ کی بعض اقسام وغیرہ۔علماء کی دوسری جماعت اس سے زیادہ مقدار کو واجب ٹھہراتی ہے۔ابن حزم اس قسم کا حکم لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فانّهم اتفقوا علی وجوب إخراج المقدار الأقل كلهم بلا خلاف منهم، واختلفوا فيما زاد علی ذلک، فالإجماع فرض علينا أن ناخذ به"(۷۲)
(ان تمام علماء کا ایک کم از کم مقدار کے وجوب پر اتفاق ہوتا ہے اور اس سے زیادہ مقدار پر ان کا اختلاف ہوتا ہے۔لہٰذا کم از کم مقدار کے حکم کو بطریق اجماع لینا فرض ہے۔)

ابن حزم مزید فرماتے ہیں جو شخص اس مقدار سے زیادہ کو واجب قرار دیتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ محتاج دلیل ہے۔اگر وہ دلیل پیش کرے گا تو ہم اسے تسلیم کریں گے، ورنہ اس کے قول کو ترک کر دیں گے۔اور وہ قول یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی باطل ہے۔ہم کم از کم پر عمل کرنے میں یقینی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاں حق بجانب ہیں کیونکہ یہ امر اجماعی ہے اور اتفاق اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔اجماعی امور بلاشبہ فرض ہیں۔اختلاف اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہوتا۔(۷۳) ابن حزم نے الحکم بأقل ما قیل کی کئی مثالیں ذکر کی ہیں جن میں دو مندرجہ ذیل ہیں:

☆ پانچ نمازوں کی فرضیت پر اجماع ہے بعض کے نزدیک وتر بھی فرض ہیں۔دیگر پانچ نمازوں کو فرض سمجھتے ہیں۔وتر کے وجوب کے قول کو تسلیم نہیں کیا جائے گا بلکہ اقل ما قیل پر حکم صادر کرتے ہوئے صرف پانچ نمازوں کے وجوب کو ہی ثابت کیا جائے گا۔

☆ پچاس گائیوں میں سے ایک گائے زکوٰۃ ہوگی، اس پر اتفاق ہے۔جبکہ بعض نے ہر پانچ پر ایک بکری، اور بعض نے تیس یا چالیس پر ایک بکری زکوٰۃ دینے کا کہا ہے۔ابن حزم ان مثالوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:"فوجب الأخذ بما اتفقوا عليه، و ترک ما اختلفوا فيه، اذا لم ياتوا بدليل علی ما ادعوا من ذلک"(۷۴)

لہٰذا اختلاف کو چھوڑ کر ہر پچاس میں سے ایک گائے زکوٰۃ دینا لازم ہوگا کیونکہ اس پر اتفاق ہے۔

☆ سفر میں روزہ چھوڑنے کی مقدار پر ابن حزم نے ائمہ کے کئی اقوال نقل کیے ہیں۔مثلاً امام ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) کے نزدیک تین دن کی مسافت ہے۔امام مالک سے ۳۶، ۴۲، ۴۵ اور ۴۸ میل کے اقوال جبکہ امام شافعی سے ۴۶ میل کی مقدار منقول ہے۔ابن حزم نے ان تمام اقوال پر رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدود فاسدہ ہیں کیونکہ اس پر صحابہ کرامؓ سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ایسی صورت میں ابن حزم نے اجماع سے ماخوذ دلیل "الحکم باقل ما قیل" کے ذریعہ مسئلہ حل کیا ہے۔کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے۔" لو خرَجتُ ميلًا تقصرت الصلاة"(۷۵) ابن عمرؓ کے اس قول سے سفر کی کم از کم مقدار معلوم ہوتی ہے۔

قرآنی نص ﴿و من كان منكم مريضًا او علی سفر فعِدّة من ايامٍ اُخر﴾(۷۶) کے عموم سے استشہاد کرتے ہوئے ابن حزم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سفر کی مقدار کی تخصیص نہیں کی۔لکھتے ہیں:

"فلم يخص تعالٰی سفرًا من سفر، و وجدنا ما دون الميل ليس له حكم

السفر لأنه قد صح أن النبیﷺ کان یبعد للغائط والبول فلا یقصر ولا یفطر، و لم نجد فی أقل من المیل قولًا عند أحد من اھل العلم بالدین واللغة."(۷۷)

یہاں ابن حزم نے اجماع سے ماخوذ دلیل "**أقل ما قیل**" سے استنباط کیا ہے۔

۳۔ترک قول پر اجماع

کسی مسئلہ میں متعدد اقوال ہوں اور ایک قول کو بالاتفاق ترک کر دیا گیا ہو تو یہ اس قول کے بطلان پر دلیل ہے۔ یہ دلیل اجماع سے ماخوذ ہوتی ہے جو اس قول کے ترک پر منعقد ہوتا ہے۔ مثلاً دادا کی وراثت پر صحابہ کرامؓ مختلف الرائے ہیں۔ صحابہؓ میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ جب باپ نہ ہو تو دادا بھی وارث نہیں ہوگا۔ یا یہ کہ دادا ۱/۶ سے کم ورثہ لے گا۔ اس قول کے ترک کرنے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع، اس قول کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔ یہ دلیل اس اجماع سے ماخوذ ہے جو اس قول کے ترک کرنے پر منعقد ہوا ہے۔ (۷۸)

۴۔مساوات اہلِ اسلام

اجماع سے ماخوذ دلیل کی یہ چوتھی قسم ہے۔ اس اُصول کی بنیاد یہ ہے کہ شریعت اسلامی کا ہر حکم تمام مسلمانوں پر نافذ ہے۔ کسی خاص مسلمان کو مخاطب کر کے جو حکم دیا گیا تو وہ بھی تمام مسلمانوں کے لیے ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ حکم کسی خاص مسلمان سے وابستہ کرنے کی نص پائی جائے۔ نبی اکرمﷺ تمام جہانوں اور سب زمانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپﷺ کی رسالت عام ہے۔ شرعی احکام میں تمام مسلمانوں کی مساوات اس اجماع سے ثابت ہے جو عہد رسالت سے تواتر سے منقول ہے۔ اس کی مثالیں بہت سی وہ احادیث ہیں جو مخصوص اشخاص کے حق میں وارد ہوئیں اور پھر ان کے حکم کو عام کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عموم مسلمانوں کی مساوات سے ہی سمجھا گیا ہے۔ ابن حزم کے مطابق چونکہ آنحضورﷺ کی بعثت اس لیے عمل میں نہیں آئی تھی کہ اپنے زمانے والوں کو شرعی احکام پہنچائیں بلکہ آپﷺ ان سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جو تا قیامت پیدا ہوں گے۔ (۷۹)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ سالمؓ (مولیٰ ابوحذیفہؓ) حضرت ابوحذیفہؓ کے ساتھ ان کے گھر میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی حضرت سہلہ بنت سہیلؓ نے نبی اکرمﷺ کے پاس حاضر ہو کر عرض کی کہ سالمؓ بالغ ہو چکا ہے اور وہ مردوں کی باتیں سمجھتا ہے۔ وہ ہمارے گھر میں آتا ہے اور میرا خیال ہے کہ حضرت ابوحذیفہؓ کے دل میں اس سے کراہت ہے تو آپﷺ نے ارشاد فرمایا:

"**ارضعیه تحرمی علیه و یذھب الذی فی نفس ابی حذیفة**"(۸۰)

تم سالمؓ کو دودھ پلا دو تا کہ تم اس پر حرام ہو جاؤ اور ابوحذیفہؓ کے دل میں جو کراہت ہے وہ

جاتی رہے۔

سہلہؓ زوجہ ابوحذیفہؓ دوبارہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی اور کہا: میں نے سالمؓ کو دودھ پلا دیا ہے اور ابوحذیفہؓ کی کراہت ختم ہوگئی ہے۔

ظاہری فقہاء کی رائے میں اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بالغ لڑکے کا عورت کا دودھ پینے سے اس کے اور اس عورت کے درمیان حرمت رضاعت قائم ہو جاتی ہے۔ ابن حزم کے نزدیک یہ حکم عام ہے۔ یہ حدیث اگرچہ سالمؓ نامی لڑکے سے متعلق ہے لیکن اس کا حکم عام ہے جس کی بنیاد ایک عام اجماعی قضیہ پر رکھی گئی ہے، اگرچہ بذات خود، اس مسئلہ پر اجماع منعقد نہیں ہوا ہے۔ اس اُصول کی رُو سے فقہ ظاہری میں یہ حکم پایا جاتا ہے کہ جس آدمی نے کسی عورت کا دودھ پیا، وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ حرمت رضاعت کے اس مسئلہ میں رضاعت کے اعتبار سے نابالغ اور بالغ میں کوئی فرق نہیں۔ (۸۱)

جمہور فقہاء کے نزدیک حرمت صرف اس رضاعت سے ثابت ہوگی جو عمر کے ابتدائی دو سال میں ہو۔

یہ تھیں اجماع سے ماخوذ دلیل کی چاروں اقسام جن کے متعلق ابن حزم کی رائے ہے کہ ہم جو دلائل و مفاہیم استعمال کرتے ہیں، یہ تمام دلائل نص کے تحت آتے ہیں اور صحیح بات یہ ہے ہمارا اُصولِ دلیل، نص یا اجماع سے ہرگز خارج نہیں ہے۔ (۸۲)

خلاصہ کلام

فقہ ابن حزم کا اصولی تعلق فقہ ظاہری سے ہے۔ جس میں احکام کا استخراج ظواہر نصوص سے کیا جاتا ہے اور قیاس و رائے کی ہر صورت کو رد کر دیا گیا ہے۔ تاریخ اسلامی میں ابن حزم اندلسی (م ۴۵۶ھ) کا شمار ان فقہاء میں ہوتا ہے جو مجتہد مطلق کے درجے پر فائز تھے اور انہوں نے تقریباً علوم اسلامیہ ہر موضوع پر لکھا۔ فقہ ابن حزم کے مصادر، نصوص قرآن وحدیث، اجماع اور ان سے ماخوذ دلائل ہیں۔

دلیل قیاس نہیں ہے کیونکہ قیاس میں علت کا استخراج کر کے اصل کا حکم فرع پر لگایا جاتا ہے جبکہ دلیل نصوص و اجماع سے براہ راست ماخوذ ہوتی ہے۔ ابن حزم نے نصوص و اجماع سے ماخوذ دلیل کی مندرجہ ذیل اقسام ذکر کی ہیں۔

الف۔ نص سے ماخوذ دلیل کی اقسام

۱۔ نص کے ایسے دو مقدمات پر مشتمل وہ نتیجہ، جو دونوں مقدمات میں سے کسی میں مذکور نہ ہو۔

۲۔ نص میں موجود ایسی شرط جو کسی وصف سے مشروط ہو۔ جب بھی یہ وصف پایا جائے تو اس شرط کا حکم بھی واجب ہوگا۔ یہ قسم، فعل شرط کے عموم کی بنا پر نص سے ماخوذ ہوتی ہے۔

۳۔ اگر کسی چیز کی تمام اقسام سوائے ایک کے باطل ہوں، تو صرف وہ ایک قسم ہی صحیح ہوگی۔ مثلاً اگر کوئی چیز حرام ہو تو اس پر حرام کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز فرض ہے تو فرض کا حکم ہوتا ہے۔ اسی طرح

اگر کوئی چیز مباح ہوتی ہے تو وہ صرف مباح ہوگی، فرض یا حرام نہیں ہوگی۔ یہ قسم استصحاب الحال میں داخل ہے۔

۴۔ متلازمات ۵۔ قضایا مدرجہ

۶۔ عکس مستوی اور ۷۔ دلیل تضمنی ہیں۔

ب۔اجماع سے ماخوذ دلیل کی اقسام

۱۔استصحاب الحال ۲۔الحکم باقل ما قیل ۳۔ترک قول پر اجماع اور

۴۔احکام اہل اسلام کی مساوات شامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ الرازی، الامام محمد بن اَبی بکر بن عبدالقادر، مختار الصّحاح، مکتبۃ لبنان، بیروت، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۱۔

۲۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ، طہران، ۱۵/۴۰۹ (الظاھریۃ)؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، ۱۲/۶۲۳ (ظاہریہ)۔

۳۔ تراجم کے لیے دیکھیے۔الذھبی، شمس الدین ابوعبداللہ محمد عثمان بن قایماز الدمشقی الشافعی (۷۴۸ھ)، تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام، تحقیق: الدکتور عمر تدمیری، دار الکتاب العربی، بیروت، ط/الاولیٰ، ۱۴۰۷ھ؛ الذھبی، تذکرۃ الحفاظ، دار احیاء التراث العربی، حیدرآباد، الھند، ط/الثانیۃ، ۱۳۷۶ھ-۱۹۵۶ء؛ الذھبی، سیر اعلام النبلاء، تحقیق: شعیب الارناؤط، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ط/الثانیۃ، ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء؛ السبکی، تاج الدین اَبونصر عبدالوھاب بن علی بن عبدالکافی (۷۷۱ھ)، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، تحقیق: محمود محمد الطناحی، عبدالفتاح محمد الحلو، دار ھجر، السعودیۃ، ط/الثانیۃ، ۱۴۱۳ھ؛ ابن الفرضی، ابوالولید عبداللہ بن محمد بن یوسف بن نصیر الازدی (۴۰۳ھ)، تاریخ علماءِ الأندلُس، تحقیق: روحیۃ عبدالرحمٰن السویفی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط/الاولیٰ، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء؛ الحمیدی، اَبوعبداللہ محمد بن اَبی نصر فتوح بن عبداللہ الازدی الاندلسی (۴۸۸ھ)، جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الأندلس، تحقیق: الدکتور روحیۃ عبدالرحمٰن السویفی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط/الاولیٰ، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء؛ الخطیب البغدادی، اَبی بکر احمد بن علی الخطیب الشافعی (۴۶۳ھ)، تاریخ بغداد، مکتبۃ الخانجی، القاھرہ، ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء؛ الصفدی، صلاح الدین خلیل بن ایبک، الوافی بالوفیات، تحقیق: احمد الارناؤط، ترکی مصطفیٰ، دار احیاء التراث، بیروت، ۱۴۲۰ھ؛ الصنعانی، الامیر، مجموعۃ الرسائل المنیریۃ، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، لصاحبھا و مدیرھا محمد منیر عبدہ آغا الدمشقی، مکتبۃ طیبۃ، الریاض، ط/الاولیٰ، ۱۳۴۳ھ؛ الضبی، احمد بن یحییٰ بن احمد بن عمیرہ (۵۹۹ھ)، بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اھل الاندلس، تحقیق: الدکتور روحیۃ عبدالرحمٰن السویفی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ط/الاولیٰ، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء؛ عارف خلیل محمد ابوعید، الامام داؤد الظاہری واَثرہ فی الفقہ الاسلامی، دار

الارقم للنشر والتوضیع، الکویت، ط/الاولی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء؛ ابن الندیم، ابوالفرج محمد بن اسحاق بن ابی یعقوب الندیم الوراق (۳۸۳ھ)، کتاب الفہرست، تحقیق: رضا تجدد، منشورات نور محمد، اصح المطابع، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی، س۔ن، ص ۲۷۱، ۲۷۲

۴۔ ترجمہ ابن حزم کے لیے دیکھیے، شاگرد ابن حزم امام حمیدی (م ۴۸۸ھ) کی جذوۃ المقتبس فی ذکر ولاۃ الاندلس، ص ۲۷۷، (ت ۷۰۸)؛ الضبی، بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس، ص ۳۶۴ (ت ۱۲۰۵)؛ تراجم کی تمام کتب، نیز ابوعبدالرحمٰن ابن عقیل الظاہری نے ''ابن حزم خلال الف عام'' (دار الغرب الاسلامی، بیروت، ط/الاولی، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) میں دو جلدوں (۱۶ اجزاء) میں زمانہ ابن حزم سے لے کر عصر حاضر تک ۲۳۸ کتب تراجم کی عبارات مع تعلیقات جمع کی ہیں۔

۵۔ امجد حسین، حافظ، Ph.D مقالہ بعنوان ''امام ابن حزم کا فقہی منہج، استنباط واستخراج، ایک تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوع، (جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، سیشن (B)2009-12ء)، ص ۶۶۔۷۸

۶، ۷۔ ابن حزم، ابومحمد علی بن حزم الاندلسی، الاحکام فی اصول الاحکام، دار الحدیث بجوار ادارۃ الازھر، ط/لی، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء، ص ۱/۳۰۴

۸۔ حوالہ مذکور، ۲/۵۴۶، (الباب التاسع والثلاثون فی ابطال القول بالعلل فی جمیع احکام الدین)

۹۔ حوالہ مذکور، ص ۱/۱۴۶

۱۰۔ حوالہ مذکور، ۱/۱۰۳، ۱۱۱، ۱۱۲؛ ۲۵۔ ابن حزم، النبذ فی اصول الفقہ، تحقیق: ابوعبداللہ محمد بن احمد الحمو دالنجدی، مکتبۃ دار الامام الذھبی للنشر والتوزیع، ط/الاولی، ص ۶۲

۱۱۔ ابن حزم، الاحکام فی اصول الاحکام، ۲/۱۵۵، ۱۵۶

۱۲۔ ابن حزم، مراتب الاجماع فی العبادات والمعاملات والاعتقادات، ویلیہ نقد مراتب الاجماع لابن تیمیۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، س ن، ص ۱۲، ۱۷

۱۳۔ ابن حزم، المحلی، تحقیق: احمد محمد شاکر، دار التراث، القاھرہ، س ن، ص ۱/۹۷ (مسئلہ نمبر ۱۰۰)؛ ابن حزم، الاحکام، ۱/۲۲۶

۱۴۔ حوالہ مذکور، ص ۲/۱۹۲، ۱۹۳

۱۵۔ حوالہ مذکور، ۲/۱۷۹

۱۶۔ حوالہ مذکور، ۱/۵۱۳

۱۷۔ حوالہ مذکور، ص ۱/۳۰۲

۱۸۔ ابن حزم، المحلی، ص ۱/۹۷ (مسئلہ نمبر ۱۰۰)

۱۹۔ ابن حزم، الاحکام، ۱/۳۸۹ تا ۴۰۱

۲۰۔ حوالہ مذکور، ص ۱/۱۵۸

۲۱۔ حوالہ مذکور، ص ۱/۱۷۵

۲۲۔ ابن حزم، النبذ فی اصول الفقہ، ص ۱۴۰

۲۳۔ حوالہ مذکور، ص ۱۵۱؛ ابن حزم، الاحکام، ص ۲/۳۰۴

۲۴۔ امجد حسین، حافظ، Ph.D مقالہ بعنوان ''امام ابن حزم کا فقہی منہج استنباط واستخراج، ایک تنقیدی مطالعہ، غیر مطبوع، (جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، سیشن (B)2009-12ء)، ص ۳۳۱۔۳۴۲

۲۵۔ ابن منظور، لسان العرب، (مادہ، دل)؛ بلیاوی، عبدالحفیظ، مصباح اللغات، ص۲۴۱

۲۶۔ ابن حزم، الاحکام، ۱/۴۱ ۔ ۲۷۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۲۶۹/۸

۲۸۔ ابن حزم، الاحکام، ۹۸/۲ ۔ ۲۹۔ حوالہ مذکور، ص ۶۹/۱

۳۰۔ حوالہ مذکور، ص ۹۸/۲ ۔ ۳۱۔ ابن حزم، المحلی، ص ۵۳/۱ (مسئلہ نمبر ۹۵)

۳۲۔ ابوزہرہ، محمد، الامام، ابن حزم حیاتہ وعصرہ - آراؤہٗ وفقہہٗ، دارالفکر العربی، القاھرہ، ط/الاولیٰ، ۱۹۷۷ء، ص ۴۰۴

۳۳۔ حوالہ مذکور، ص ۴۰۵-۴۰۶ ۔ ۳۴۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۹۸/۲-۱۰۰

۳۵۔ احمد، الامام، المسند، ۲/ ۲۹ (مسند ابن عمرؓ)؛ ابوداؤد، السنن، کتاب الاشربۃ، باب ما جاء فی السکر، (حدیث نمبر ۳۶۷۹)

۳۶۔ ابن حزم، الاحکام، ۹۸/۱؛ ابن حزم، رسائل ابن حزم الاندلسی، تحقیق: الدکتور احسان عباس، المؤسسۃ العربیۃ للدراسات والنشر المرکز الرئیسی، بیروت، ط/الثانیۃ، ۲۰۰۷ء، کتاب التقریب لحد المنطق، ج ۲، جزء ۴، ص ۲۲۰۔

۳۷۔ الندوی، ڈاکٹر عبداللہ عباس، تفہیم المنطق، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۳

۳۸۔ الانفال (۸) ۳۷ ۔ ۳۹۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۹۸/۲

۴۰)۔ ابن حزم، رسائل ابن حزم، کتاب التقریب لحد المنطق، ج ۲، جزء ۴، ص ۲۱۳

۴۱۔ ابن حزم، الاحکام، ۹۸/۲ ۔ ۴۲۔ التوبۃ (۹) ۱۱۴

۴۳۔ ھود (۱۱) ۷۵ ۔ ۴۴۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۹۸/۲

۴۵۔ لاسراء (۱۷) ۲۳

۴۶۔ ابوزہرہ، ابن حزم حیاتہ وعصرہ - آراؤہٗ وفقہہ، ص ۴۰۲

۴۷، ۴۸۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۹۹/۲

۴۹۔ الندوی، عبداللہ عباس، تفہیم المنطق، ص ۱۹۳

۵۰۔ ابن حزم، رسائل ابن حزم، کتاب التقریب لحد المنطق، ج ۲ جز ۴، ص ۲۲۵-۲۴۰

۵۱۔ آل عمران (۳) ۸۵ ۔ ۵۲۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۹۹/۲

۵۳۔ الاعراف (۷) ۱۹۵

۵۴۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۹۹/۲-۱۰۰ دلیل کی مختلف اقسام اور امثلہ، ابن حزم نے اپنی کتاب التقریب لحد المنطق میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ (رسائل ابن حزم ج ۲ جز ۴، ص ۹۳-۳۵۴)

۵۵۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۹۸/۲

۵۶۔ الطّوفی، نجم الدین، شرح مختصر الروضۃ، تحقیق: عبدالمحسن الترکی، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ط/الاولیٰ، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء، ص ۱۴۸/۳؛ الزرکشی، البحر المحیط، تحقیق: لجنۃ العلماء، دارالکتبی، القاھرہ، ط/الاولیٰ،

۱۳۱۳ھ-۱۹۹۴ء، ص ۶ /۱۷؛ سکروڈوی، مولانا جمیل احمد، اجمل الحواشی علی اصول الشاشی، المیزان، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۴۳۳-۴۳۳۔ ابن قدامۃ، ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ المقدسی الحنبلی، المعروف ابومحمد موفق الدین (۶۲۰ھ)، روضۃ الناظر وجنۃ المناظر، دار الکتاب العربی، بیروت، ط/۱ الاولیٰ، ۱۹۸۱ء، ص ۱۵۱۔

۵۷۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۲/ ۵

۵۸۔ حوالہ مذکور، ص ۲/ ۸

۵۹۔ حوالہ مذکور، ص ۱/ ۵۲

۶۰۔ البقرہ (۲) ۳۶

۶۱۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۲/ ۸

۶۲۔ البقرہ (۲) ۳۶

۶۳۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۱/ ۵۸

۶۴۔ حوالہ مذکور، ص ۲/ ۶

۶۵۔ الاعراف (۸) ۲۷

۶۶۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۲/ ۶؛ ابن حزم، المحلی، ص ۱/ ۱۲۸ (مسئلہ نمبر ۱۳۲)

۶۷۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۱/ ۳۷۹ (فصل فی بیان العموم والخصوص)

۶۸۔ ابن حزم، الاحکام، ۲/ ۸؛ صبحی محمصانی، فلسفہ شریعت اسلام، ص ۱۷۶

۶۹۔ حوالہ مذکور، ص ۲/ ۶

۷۰۔ ابن حزم، النبذ فی اصول الفقۃ، ص ۹۱

۷۱۔ ابن حزم، المحلی، ص ۱/ ۱۷ (مسئلہ نمبر ۱۲۸)

۷۲، ۷۳۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۲/ ۴۸

۷۴۔ حوالہ مذکور، ص ۲/ ۴۹

۷۵۔ ابن حزم، المحلی، ص ۶/ ۲۴۴ (مسئلہ نمبر ۷۶۲)

۷۶۔ البقرہ (۲) ۱۸۵

۷۷۔ ابن حزم، المحلی، ص ۶/ ۲۴۶ (مسئلہ نمبر ۷۶۲)

۷۸۔ ابوزہرہ، ابن حزم وحیاتہ وعصرہ، ص ۴۰۵

۷۹۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۱/ ۳۴۴

۸۰۔ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الرضاع، باب رضاعۃ الکبیر، (حدیث نمبر ۳۶۰۱)

۸۱۔ ابن حزم، المحلی، ص ۱۰/ ۱۸۸-۲۰۲ (مسئلہ نمبر ۲۰۱۷)

۸۲۔ ابن حزم، الاحکام، ص ۲/ ۹۸

پُرامن اوراعتدال پسند معاشرے کی تشکیل وضرورت اسلام کی روشنی میں

ڈاکٹرحمیرا ناز☆

Abstract:

"Allah never changes the condition of any nation until it is determined to change itself. This order of Allah is the true representation of our society. It means that man himself is responsible for all social changes, political dynamics and economical reformation. His life will shape in accordance with the formation of reasons, construction of society and shaping of economic system. If a society is not formed on the principle of economic system, peace and justice and on the principle of equality than a chaos and disorder will become fate of that society. Today nothing is responsible for the current situation of our society except ourselves.

If fundamental systems of life is collapsed in any society then it means that either the society is failed to understand the law of nature or it has ignored it entirely. If any nation recognizes the root cause of its illness and realize that all these problems are the result of its own actions than it can bring change in its economic, political and social system and can go toward the road of prosperity."

Keywords: Society, Peace, Balanced, Social Responsibility, Islam, Religion of Peace.

خالق کائنات نے ازل سے انسانیت کی ہدایت ورہنمائی کے لیے نبوت کاعظیم الشان سلسلہ شروع کیا اور تاریخ کے مختلف ادوار میں انبیاء کومبعوث فرما کرانسان کوفطری اورطبعی تقاضوں کے مطابق

☆ اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی

زندگی بسر کرنے کا ایسا راستہ فراہم کیا کہ معاشرے میں نیکی کا عنصر پروان چڑھے اور بدی کا خاتمہ ہو سکے۔ نبی آخرالزماں حضرت مصطفیٰ ﷺ کی آمد کے ساتھ ہی گزشتہ تمام انبیاء کی لائی ہوئی شریعتوں کو منسوخ کر کے ''دین اسلام'' کو تمام امت کے لیے پسندیدہ قرار دے دیا گیا اور اللہ رب العزت نے اعلان فرمادیا کہ:

''بے شک دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔''

پھر دینِ اسلام ہی کی برکات سے ایسے عظیم اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں آیا کہ جہاں اخوت، بھائی چارہ، عدل واحسان اور انصاف ومساوات کے وہ عظیم الشان مناظر دیکھنے میں آئے کہ زمین وآسمان نے اس سے پہلے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ معاشرے میں حقوق وفرائض کا ایسا نظام قائم کیا کہ تمام انسانی طبقات کو اس کے حقوق کی ادائیگی کا پابند بنادیا۔[۱] لیکن آنے والے وقتوں میں یہ اسلامی معاشرہ بتدریج پستی کی طرف گامزن ہوگیا۔ آج پستی کے اس سفر کی ذمّہ داری ہم معاشرے پر ڈال کر بری الزمہ نہیں ہوسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بگاڑ کے ذمّہ دار ہم خود ہیں۔ جس طرح زندگی میں کسی بھی رویے کی تبدیلی یا کسی بھی ردعمل کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ہماری زندگی کے بگاڑ کے بھی کچھ اسباب ضرور ہیں۔ یہ بگاڑ کوئی ایک دن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ ایک طویل عرصے کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ اس طویل عرصے میں یہ بگاڑ بڑھتا بڑھتا ہمارے معاشرے میں سرایت کر گیا۔ ہم نے اسلامی مملکت جغرافیائی نقشے پر تو حاصل کر لی۔ لیکن صحیح معنوں میں نہ اسلامی مملکت بنی اور نہ ہی اسلامی فلاحی جمہوریت رائج ہوئی۔[۲] آج ہماری وحدتِ فکر وعمل مفقود ہے۔ مذہبی رواداری، اتحاد ویگانگت، اعتدال اور میانہ روی کا جو درس اسلام نے دیا تھا اس کو ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے پورا معاشرہ افراط وتفریق میں مبتلا ہے۔ عدم برداشت، فرقہ پرستی، انتہا پسندی، تعصب دین ومذہب اور سیاست کے نام پر قتل وغارت گری، معاشی وسماجی انصاف کی عدم فراہمی کے علاوہ مذہبی وسیاسی استحصال بھی معاشرے کو کھوکھلا کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ آج ایک اعتدال پسند معاشرے کی تشکیل و ضرورت ایک ایسا موضوع ہے جس پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر آج اگر ان حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کے اس بگاڑ کا ذمّہ دار کوئی ایک شخص نہیں بلکہ سارا معاشرہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں معاشرے کا ہر فرد ذمّہ دار ہے۔ اس بگاڑ کے اسباب زندگی کے ہر شعبے میں ملتے ہیں۔ یعنی مذہبی، سماجی، معاشی ومالی اور سیاسی نقائص سے وجود میں آئے ہیں آج کی زندگی میں ان شعبوں میں سے ہر ایک شعبہ ایک مخصوص نوعیت کے بگاڑ سے ہمکنار ہے۔ سیاسی شعبے میں ظلم استبداد رائج ہے۔ معاشی شعبے میں ناہمواری اور عدم استحکام عام ہے اسی طرح مذہبی طور پر دین سے غفلت اور دوری، اس بگاڑ کی اصل وجہ ہے۔ چنانچہ ان بگاڑ کے اسباب کو صحیح طور پر معلوم کیے بغیر اصلاح نہیں ہوسکتی اور نہ ہی پرامن معاشرے کے قیام کو ممکن بنایا جاسکتا ہے اور یہی وہ اسباب ہیں جو ایک

پُرامن، مہذب وشائستہ معاشرے کے قیام میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔(۳) جن کا جائزہ درج ذیل میں لیا گیا ہے:

ا۔ مذہبی ودینی اسباب

ا۔ دین سے غفلت

دین سے غفلت اور دوری دراصل معاشرے کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ اسلام جو عقیدہ واقرار ہے، عمل بھی اور مکمل ضابطہ حیات ودستور العمل بھی اور اس کا مجموعی نام دین ہے۔ جس میں عقائد، عادات اور معاملات (انفرادی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، عسکری، عدالتی اور بین الاقوامی) سب شامل ہیں۔(۴) دین جو ایک کلّی حقیقت ہے اگر مسلمانوں کی کُل زندگی دینی اصولوں کے تابع ہے تو عبادت ہے۔(۵) کیونکہ مسلمانوں کا ہر عمل خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی، انفرادی ہو یا اجتماعی، دین سے الگ نہیں۔ اگر یہ یقین ہر مسلمان پیدا کر لیں تو معاشرے میں اس کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ وہ معاشرے میں خود بھی امن سے رہے گا اور دوسروں کو بھی عافیت مہیا کرے گا۔ گویا اسلام میں دین کا تصور ایک انقلابی اور ہمہ جہتی ہے۔ جو افراد کے اندر طبائع کا تزکیہ کرتا اور ان کو ایک اجتماعی صلاحیت کا مالک بناتا ہے۔ انسانی نفوس میں خواہشات، جذبات اور مختلف ہیجانات کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہے۔ ظاہر وباطن اور خلوت و جلوت میں انسانی اعمال کا محتسب ونگراں کار ہے۔(۶) دوسرے لفظوں میں یہ مسلمان کے قلب ودماغ کی چشم بصیرت پر ایک ایسی رنگین عینک ہے کہ وہ جس کسی چیز کو دیکھتا ہے اسی رنگ میں دیکھتا اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس بناء پر معاملہ دینی ہو یا دینوی، اقتصادی ہو یا معاشرتی دین سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔(۷) دین کا صحیح تصور دلوں میں جس قدر چڑھا ہوگا۔ دل اسی قدر کھوٹ وخیانت، خودغرضی، منافقت، جھوٹ سے پاک ہوں گے اور وہ بے تکلف ایک ایسے معاشرے کی شکل اختیار کر لیں گے جس کے ہر فرد کا فکر وعمل وحدت کی طرف مائل ہوگا۔ وہ مل کر ایک ایسی اکائی کی صورت اختیار کر لیں گے جن میں پھر کبھی دوئی، تفرقہ پیدا نہ ہو سکے گا اور ان کے افکار اور ان کی عملی زندگی ہر قسم کے انتشار سے پاک ہوگی۔(۸) لیکن آج ہم نے دین ودنیا کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اپنے ہر عمل کو دین کی نگاہ سے نہیں دیکھتے یہی ہماری زندگی کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ سب سے اولین غفلت جو ہوئی وہ یہ کہ ہم اپنی نسلوں کو پے در پے ایمان کی بالیدگی وتازگی اور شریعت کی معلومات فراہم کرنے کی طرف سے بے پرواو غافل ہو گئے۔ نتیجتاً قوم کا ہر فرد دین سے لاتعلق ہوتا گیا۔ مذہبی کوتاہیوں سے جو حالات رونما ہوتے ہیں وہ سماجی مسائل بن جاتے ہیں جو معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔(۹) آج ہم انہی حالات سے دوچار ہیں پس دین سے دوری اور ایمان کے فقدان کی وجہ سے آج کا انسان ہر سطح پر نہ صرف انتشار کا شکار ہے بلکہ معاشرے پر بھی اس کے منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔

۲۔شریعتِ محمدی سے انحراف

دوسرا سبب ہمارے معاشرے کے بگاڑ کا وہ شریعت محمدی سے انحراف ہے۔توحید کے لازوال قوت کے ساتھ جب تک محبت رسولﷺ کی بنیاد پر اتباع رسولﷺ کا مکمل اہتمام نہ ہوگا اُس وقت تک معاشرتی اقدار کی تکمیل ناممکن ہوگی۔اس لیے توحید باری تعالیٰ کے ساتھ شریعت محمدی کا احترام معاشرے کے افراد کے لیے لازمی ہوگا۔(۱۰) آج بھی اتباع رسول سے ہم اپنی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ایک مسلمان کی حیثیت سے انفرادی اوراجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں ہرقدم پر سرکار دوعالمﷺ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔حضور اکرمﷺ نے حیات انسانی کے ہرشعبے، ہرگوشے میں مکمل ہدایات اور مثالی اعمال کے ذریعے ہمیں سیدھا، سچا، روشن اور بہترین راستہ بتایا ہے۔(۱۱) پس حضور اکرمﷺ کی حیات طیبہ قیامت تک کے لیے پوری انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔انسانوں کے ہرطبقہ اورگروہ کے لیے اس سیرت پاک میں نصیحت پذیری اور عمل کی رہنمائی موجود ہے۔(۱۲) پس جب تک مسلمان اتباع رسولﷺ کا اہتمام کرتے رہے۔سربلندی ان کے قدم چومتی رہی۔معاشرہ صلاح و فلاح سے آراستہ وپیراستہ ہوتا رہا اور جیسے جیسے ہم اس سے غفلت برتتے گئے، پستی میں گرتے چلے گئے۔ ذلت ہمارا مقدر بن گئی اور آج ہمارے معاشرے کی تمام خرابیوں کی اصل اوراس کی اساس ہماری یہی بے عملی ہے۔درسِ اخلاق موجود ہے۔دعویٰ محبت رسولﷺ کا موجود ہے لیکن عمل مفقود ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مکارم اخلاق کے بجائے ہم رذائل اخلاق کے خوگر ہوتے چلے گئے اگر آج ہم اپنا ایمان کامل کرلیں اور یقین کو محکم کرکے توحید پر ایمان اور رسول اللہ کی اتباع کو واجب سمجھ لیں اور یہ بھی ذہن نشین کرلیں کہ آپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔آپﷺ کو خوش کرنا اللہ کو خوش کرنے کے مترادف ہے تو ہمارا دین اور دنیا دونوں منور ہوجائے گی۔اللہ اور اللہ کے رسولﷺ کی خوشنودی بھی حاصل ہو سکے گی۔(۱۳) ارشادنبوی ہے۔

> ''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں جب تک کہ وہ اپنی خواہشات کو میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ کردے۔'' (شرح السنۃ بحوالہ مشکوۃ ۳۰)

گویا مسلمانوں کی دینوی واخروی ہرطرح کی صلاح وفلاح اتباع سنتِ رسول اللہ میں مضمر ہے۔ جو صرف نماز، روزہ اور دیگر عبادات کی حد تک نہیں بلکہ زندگی کے ہرشعبہ پر خواہ وہ معاشی ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا اقتصادی ان کے ساتھ ساتھ اخلاق، عادات اور معاملات سب پر محیط ہے۔(۱۴) پس جس معاشرے کے افراد اتباع رسول پر عمل کریں گے تو وہ معاشرہ عدل واحسان، احساس ذمہ داری، حقوق وفرائض کی پاسداری اور مواخات کے زریں اصولوں پر مبنی ایک ہمہ صفتِ صالح اور خوبصورت معاشرہ وجود میں آئے گا۔(۱۵)

۳۔روز جزا کا غیر یقینی سمجھنا

روز جزا یقینی ہے اور وہاں جوابدہی ہوگی اگر اعمال کی باز پرس، جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا و سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیا سے انسانیت، سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے۔یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت وخلوت میں ان کی ذمّہ داری محسوس کراتا ہے(۱۶)لیکن آج حقائق ہمارے سامنے ہیں۔آج چند گروہوں نے (مذہب کے نام پر) زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ان کو نہ عاقبت کی جوابدہی کا کوئی احساس ہے، نہ بارگاہ ایزدی کے سامنے حاضری کا یقین ہے اور نہ ہی قیامت کو ممکنات میں سے سمجھتے ہیں۔ان چند لوگوں نے انسانیت کو بالخصوص مسلمانوں کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ایسے لوگ ملک کے دشمن اور امن کے دشمن ہیں۔(۱۷)قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے بارے میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ:

''ان کے لیے اس کے سوا نہ کوئی کارساز ہوگا نہ کوئی شفاعت کرنے والا''

(سورہ الانعام: آیت ۵۱)

اسی روز جزا اور یوم آخرت کے تمام پہلوؤں کو قرآن مجید نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس دنیا کی زندگی کو ایک امتحانی زندگی قرار دیتا ہے۔یہاں ہم ایک امتحان گاہ میں اتارے گئے ہیں اور ہماری جانچ ہو رہی ہے کہ خدا کی عطا کردہ حیات، علم، قوت و اختیار اور اس کی نعمتوں سے ہم کس طرح کے مقاصد کے لیے کیا کام لیتے ہیں؟ یہ تصورِ امتحان، ایمان وتقویٰ کی راہ اختیار کرنے کا محرک بھی بنتا ہے اور بدی کی قوتوں کے خلاف کشمکش کرنے اور راستی اور نیکی کے خدائی نظام کو برپا کرنے کی جدوجہد کا درس بھی دیتا ہے۔اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسروں سے محبت کرو اور اس کی خدمت انجام دو نہ یہ کہ ان پر ظلم کرو اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔(۱۸)حقیقت یہ ہے کہ روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح وفلاح ممکن نہیں اور نہ ہی ایک پُرامن معاشرے کا تصور یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

۲۔سماجی اسباب

ا۔خود احتسابی اور معاشرے کے احتساب کا جذبہ عنقا ہے

اسلام کے نزدیک خود احتسابی سے ہی اصلاح کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔جس کا انحصار زیادہ تر ایمان پر ہوتا ہے۔خود احتسابی اور ایمان دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔خود احتسابی سے انسان اپنے گفتار، کردار، اعمال و افعال کا مواخذہ کر سکتا ہے اور اپنے اندر کا جائزہ لے کر درستگی لا سکتا ہے۔لیکن آج بدقسمتی یہ ہے کہ آج ہم خود احتسابی کی نہ تو ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے لیے ہمارے پاس وقت ہے اور نہ ہی اتنی اخلاقی ہمت ہے کہ اپنا مواخذہ ایمانداری سے کر سکیں۔جس کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔درحقیقت خود احتسابی ہی ایک واحد طریقہ ہے جس سے بندہ اپنے

اوپر خود قانون نافذ کرسکتا ہے اور پھر ہی خارجی قوانین کا احترام کرنا سیکھتا ہے۔[۱۹] اور یہی احترام معاشرے میں درستگی لاتا ہے۔ اپنی خوداحتسابی کے ساتھ ساتھ معاشرے کا احتساب بھی ہماری بنیادی ذمّہ داری ہے احتساب کے معنی یہ ہیں کہ جہاں جو بُرائی ہورہی ہواس کو اسی سطح پر روکنے کی کوشش کی جائے فرد کی سطح پر ہورہی ہوتو فرد اس کو روکے، خاندان میں ہورہی ہوتو خاندان کے بزرگ اور ذمّہ دار لوگ اس کو روکیں، اولاد کو منع کریں، سمجھائیں، تعلیم دیں، معاشرے میں ہورہی ہوتو معاشرے میں اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔قرآن مجید میں اس بات کو سخت ناپسند قرار دیا گیا ہے کہ معاشرے میں بُرائی ہورہی ہواور لوگ اس کے خلاف آواز نہ اٹھارہے ہوں۔قرآن مجید میں ایک جگہ کسی سابقہ قوم کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے تمام افراد کو تباہ کردیا۔ جواس بُرائی میں مبتلا تھے ان کو بھی اور جو بُرائی میں مبتلا نہیں تھے ان کو بھی تباہ کردیا۔اس لیے کہ جو بُرائی میں مبتلا نہیں تھے وہ دوسروں کو اس بُرائی سے روکتے نہیں تھے۔ان کی ذمّہ داری تھی کہ روکنے کی کوشش کرتے اور اس کے خلاف آواز اٹھاتے۔انھوں نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اس لیے وہ مجرم قرار پائے اور اجتماعی عذاب کا وہ بھی شکار ہوئے۔[۲۰] پس جس معاشرہ میں فطرت کے نظام، اللہ کے احکام اور شریعت کے فرمان کا احترام ہو گا وہ صالح معاشرہ کہلائے گا۔مگر جو معاشرہ اپنی ساخت میں اسلامی خصوصیات کا حامل نہیں ہوگا وہ بگاڑ سے دوچار ہوجاتا ہے۔رسول پاک ﷺ نے جب انسانیت کی اصلاح فرمائی، اس وقت ایک نظام قائم ہوا تھا۔ وہ نظام تسلیم ورضا کا نظام تھا، اطاعت ووفا کا نظام تھا۔خوداحتسابی اور معاشرے کی درستگی اور احتساب اس کا شعار تھا اور عملی تنظیم اس کا کردار تھا۔لیکن وقت کے ساتھ وہ اسلامی قدریں اور رویے بدلتے گئے مذہب وسنت کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی، اس وقت سے نظام حیات بگڑنے لگا اس طرح معاشرہ بگاڑ کی نذر ہوگیا۔[۲۱]

۲۔فرقہ واریت وباہمی اختلافات

معاشرے میں شروفساد پیدا کرنے والے اسباب میں فرقہ واریت اور باہمی وگروہی اختلافات کو بھی دخل ہے آج مسلمان مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔اسی فرقہ واریت کی بناء پر قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے۔سینکڑوں لوگ اسی فرقہ واریت کے بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ہر طبقہ، ہر گروہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھا ہے جس کی وجہ سے آج ہماری وحدّتِ فکروعمل مفقود ہے۔ہم امت محمّدی اس طرح تفریق وافراط میں مبتلا ہیں کہ ہم میں اتحادویگانگت کا فقدان ہے۔اس کا فائدہ ہمارے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کو پہنچ رہا ہے۔تاریخ بھی گواہ ہے کہ جب تک مسلمان متحد رہے دنیا کی کوئی طاقت انہیں زیرنہ کرسکی۔لیکن جب فرقہ پرستی اور گروہ بندی نے ان میں قدم جمالیے تو وہ اپنے باہمی اتحاد واتفاق کو قائم نہ رکھ سکے اور منتشر ہوگئے جس کا فائدہ ان کے دشمنوں کو پہنچا۔ یہ صرف سقوطِ بغداد تک ہی

محدود نہیں، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ دشمنانِ اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جب بھی مسلمانوں میں گروہی، مسلکی اور فرقہ وارانہ اختلافات عروج پر پہنچے، دشمن نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان پر چڑھائی کردی اور مسلمان ملّتِ واحدہ بن کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی تباہی پر خوش ہوتے رہے۔اور پھر دنیا نے دیکھا کہ جو گروہ اپنے مخالف گروہ کی تباہی پر خوشیاں منا رہے تھے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ عبرت بن گئے۔اسی حوالے سے حاجی امداداللہؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''اتفاق کی جڑ تواضع ہے اگر ہر شخص کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنے مقابلے میں دوسرے کو بہتر سمجھنے لگے تو نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ نااتفاقی اسی سبب سے پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر تصور کرتا ہے اور اپنی ذات اور بات کو ہر حال میں مقدم رکھنا چاہتا ہے۔''

اختلاف اگر حدود کے اندر ہو تو مذموم نہیں بلکہ ایسے اختلاف کو تو رسول اکرمﷺ نے موجب رحمت قرار دیا ہے۔جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ: اگر صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا تو مجھے خوشی نہ ہوتی کیونکہ اگر ان میں اختلاف نہ ہوتا تو گنجائش نہ رہتی۔ ہمارے لیے صحابہ کرام کا اختلاف باعثِ رحمت ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اختلافات کو بنیاد بنا کر الگ الگ فرقے بنا لیے جائیں۔اختلافات کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے اختلافات کو قرآن وسنت پر پیش کیا جائے اور وہاں سے رہنمائی حاصل کر کے اپنے اندر اتحاد واتفاق کو قائم رکھا جائے اور فرقہ واریت کے فروغ کے بجائے اسلام کی ترویج واشاعت کا فریضہ انجام دیا جائے۔ [۲۲]

۳۔اجتماعی ذمہ داری کا احساس نہ ہونا

اصولاً اسلامی معاشرہ فرد اور جماعت کے مابین توازن قائم رکھنا پسند کرتا ہے۔ایک طرف فرد کو بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور دوسری طرف افراد میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔ ایک طرف انسان کی انفرادی زندگی کی اصلاح کا کام کرتا ہے تو دوسری طرف اجتماعیت کو مربوط انداز میں فروغ دیتا ہے۔اس طرح معاشرہ میں امن وسکون برقرار رہتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں فروغ وترقی ہوتی رہتی ہے۔لیکن آج ہماری زندگی جن مراحل سے گذر رہی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں آج کا معاشرہ کن کن خامیوں سے دوچار ہے، جو اس کے بگاڑ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔آج کوئی بھی کسی طرح کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی کسی جوابدہی کے لیے تیار ہے۔نہ انسانیت کی طرف سے، نہ ملک کی طرف سے، نہ گھر کی وابستگی سے کوئی غرض، نہ پاس پڑوس کا کوئی خیال اور نہ اوروں کے حقوق کا کوئی دھیان۔ یہاں تک کہ اپنے نفس، اپنے اعضاء، اپنی جان کی جوابدہی کا بھی خیال نہیں۔ [۲۳] جیسا کہ ہمارا ایمان ہے کہ جس باری وبرتر نے ہمیں اتنی نعمتوں سے نوازا ہے وہ اس کا روزِ محشر کو حساب

کتاب لے گا۔ یہاں تک کہ ہماری ذاتی صلاحیتوں کا محاسبہ کرے گا۔ لہٰذا ہم اپنی جان، اپنے اعضاء، اپنی روح جسے ہم اپنا سمجھتے ہیں، وہ بھی مستعار دی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس لیے ان کا مواخذہ کیا جائے گا۔ ہمارے حواسِ خمسہ کی بابت پوچھ گچھ ہوگی۔ مثال کے طور پر قوتِ گویائی سے یہ معلوم کیا جائے گا کہ اسے ذکرِ الٰہی میں استعمال کیا تھا یا پھر گالی گلوچ یا غیبت کرنے یا دوسروں پر لعن طعن کرنے یا اسی طرح کی دوسری بُری باتوں میں استعمال کیا؟ اس طرح ہر نوعیت کی غیر ذمہ داری کا محاسبہ ہوگا۔(۲۴)

معاشرتی نقطہ نظر سے غلط افواہوں اور بے بنیاد باتوں کو اڑانا ایک خطرناک عادت ہے۔ قرآن نے بھی اس کو لڑائی جھگڑا اور معاشرے میں فتنہ وفساد کے برپا کرنے کا سبب قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

> ''اے ایمان والو! اگر کوئی غیر ذمہ دار شخص تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی خوب چھان بین کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی نادانی میں تم کسی قوم سے مڈبھیڑ کر بیٹھو اور پھر تم اپنے کیے پر پشیمان ہو۔'' (سورہ الحجرات: آیت ٦)

بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن قرآن کے اس اخلاقی حکم کا تعلق انسان کی اجتماعی اور تمدنی زندگی سے ہے۔ اسی طرح کے بہت سے اخلاقی احکام ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔(۲۵) جو انسان کی اجتماعی اور تمدنی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جس کے اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں۔ پس اللہ نے ہمیں اپنی نعمتیں دے کر یوں آزاد نہیں چھوڑا بلکہ وہ ہماری ہر ہر چیز کا مواخذہ کرے گا اس کے ساتھ ہی اس نے زندگی گذارنے کے اخلاقی احکامات بھی بتا دیے اگر ہم ان احکامات کے مطابق زندگی گزاریں گے تو روزِ قیامت میں اس کی شفاعت سے بہرہ مند ہوں گے اور نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ معاشرے میں بھی مثبت تبدیلی لاسکیں گے۔

۳۔ معاشی واقتصادی اسباب

ا۔ غیر متوازن اقتصادیات

ہمارے معاشرے کے بگاڑ کا ایک سبب غیر متوازن اقتصادیات میں بھی ہے اور اس کے اسباب کی صرف نشاندہی کافی نہیں بلکہ اس کا تدارک کرنا بھی ضروری ہے۔ کسی قوم کی اقتصادی نظام پر اس کی معاشی حالات کا انحصار ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کی صحت اس کے معاشیات پر منحصر ہے۔ نظامِ معاش اپنے عوامل وعواقب کے اعتبار سے صالح بھی ہوتا ہے اور فاسد بھی۔ اگر کسی نظام میں معاش سے اجتماعیت یا فرد کی زندگی میں صلاح وفلاح اور رفاہیت اور آسودگی پیدا ہوتی ہے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس نظامِ معاش کے اصل محرکات وضوابط صالح اور غیر فاسد ہیں۔(۲۶)

عصرِ حاضر کے ترقی یافتہ دیگر معاشی نظاموں کے مقابلے میں اسلام کا معاشی نظام اپنے بلند

مقاصد، ارفع و اعلیٰ نتائج، فوز و فلاح کے لحاظ سے بہترین معاشی نظام ہے۔ اسلامی اقتصادیات اعتدال کی علم بردار ہے۔ (۲۷) یہ نظام معاشرے سے غربت و افلاس کو ختم کرنا چاہتا ہے لیکن اس پورے عمل کو اس طرح انجام دینا چاہتا ہے کہ مادی ترقی اور اخلاقی نشو و نما بیک وقت واقع ہو سکیں لہٰذا معاشی نظام کا ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی اخلاقی ترقی کا ذریعہ ہو، ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ ایک طرف لوگوں کی حقیقی مادی ضرورتیں پوری ہوں اور دوسری طرف ان میں اخلاق حسنہ پھلیں پھولیں اور رذیلہ اخلاق نہ پنپ سکیں۔ معاشی نظام لوگوں میں ہمدردی، فیاضی، دیانت، تعاون، اعتدال، عدل، احسان جیسے عمدہ خصائل پیدا کرے اور سنگدلی، ظلم، بخل، تنگ دلی، خیانت وغیرہ جیسے رذیلہ اخلاق کی حوصلہ شکنی کرے۔ کوئی ایسا نظام جو ان اخلاقی اقدار سے متعلق ہو وہ بلاشبہ اسلام کا معاشی نظام ہی ہے۔ یہی اس کی صداقت و جامعیت کی روشن دلیل ہے۔ (۲۸) معاشرے کی اصلاح کے لیے معیشت کا صحت مند ہونا ضروری ہے صحت مند معیشت اس وقت ہو سکتی ہے جب معاشی امور کو اخلاقی ضابطہ کا پابند بنایا جائے اور یہ خصوصیت اسلام کے معاشی نظام میں ہے اس نظام میں شریعت نے تمام معاشی معاملات میں حلال و حرام کی قیود لگائی اور تاکید فرمادی کہ تمھاری معاش کا ذریعہ وجہ حلال ہو، حرام نہ ہو۔ یہ معاشرے سے عمومی خطاب ہے چونکہ اصلاح معاشرہ مقصود ہے۔ پس اسلام محض حلال و حرام کے اصول ہی متعین نہیں کرتا بلکہ وہ انسانیت کی روح پر اعتماد کرتے ہوئے اسے معاملات میں مکارمِ اخلاق کو معیار قرار دینے، عدل و احسان اختیار کرنے اور صرف قوانین کو سب کچھ نہ سمجھنے اور اخلاقی اصول کو قانون کا اولین مرجع قرار دینے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلام ہر ایسے مالی تصرف کو حرام قرار دیتا ہے جو خود خرچ کرنے والے، اس کے اقارب یا معاشرے کے لیے ضرر کا موجب ہو۔ (۲۹) معاشرے کی اسی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا اور سود کو حرام بتایا، ساتھ ہی خیرات کی ترغیب کے لیے اس کے ثمرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا تاکہ مسلمان سود سے احتراز کریں۔ جو رزق محنت سے حاصل کیا جائے وہ حلال ہے خیرات و صدقات میں ان کے قدم آگے بڑھیں، جس کے نتیجہ میں معاشرے میں توازن و اعتدال از روئے معیشت سے پیدا ہوگا اور معاشرے کے غریب لوگ اس خیر سے بہرہ اندوز ہو کر محفوظ رہیں گے۔ (۳۰) معاشی مساوات کا فطری تصور پیدا ہوگا۔ غرض اس نظام میں وہ تمام محاسن اور خوبیاں موجود ہیں جو جماعتِ انسانی کے لیے بھی مایہ شرف ہے اور ہمارے لیے بھی۔ بشرطیکہ ہم اپنے مالی اغراض، اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس سنہرے نظام کے قواعد و ضوابط کی پروا نہ کریں اور جدید تہذیب سے مرعوب کر اس نظام پر عمل پیرا نہ ہوں۔ (۳۱) پس یہی وہ نظام ہے، جس پر عمل کر کے ہم معاشرے میں حقیقی امن لا سکتے ہیں۔

۲۔ سرمایہ داری اور طبقاتیت

سوسائٹی کے امن کو تباہ کرنے والے سبب میں سرمایہ داری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے

والی طبقاتیت بھی ہے۔اسلام اس کی بھی بیخ کنی کرتا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے جو انسانی معاشرے میں فساد برپا کرتی ہے۔طبقہ متوسط وادنیٰ کے اقتصادی جسم کا خون جونک کی طرح چوس کر جسم کو نحیف ونزار کردیتی ہے۔جس سے طبقاتیت یعنی گروہ بندی کا نشو ونما ہوتا ہے۔(۳۲) اس طبقاتی تقسیم کا لازمی نتیجہ ارتکاز دولت کی صورت میں نکلتا ہے۔ظاہر ہے جب ایک طبقہ قوی سے قوی تر ہوتا جائے گا، ریاست کے تمام وسائل اس کو حاصل ہوتے جائیں گے۔ان حالات میں صارفین اپنے مفادات کا تحفظ کرنے میں مزید ناکام ہوں گے اور وسائل کا بہاؤ بااثر طبقے کی طرف بڑھتا جائے گا۔غریب اور نادار طبقے سے کم ہوتا جائے گا۔یوں غرباء اور بے وسیلہ طبقے کی ضروریات سے مزید غفلت اور بے اعتنائی پیدا ہوجائے گی اور یوں یہ طبقہ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا اور بااثر طبقہ مزید بااثر اور طاقتور ہوتا جائے گا۔(۳۳) آج ہمارے معاشرے میں یہی صورتحال ہے۔جو معاشرے میں فساد پیدا کررہا ہے۔

اسلام دولتمندی کا ہرگز مخالف نہیں وہ دولت کو خیر کہتا ہے:

''وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْد''(سورۃ العادیات آیت:۸)

ترجمہ:(اور بلاشبہ وہ محبتِ مال میں(بھی)یقیناً بہت سخت ہے۔)

لیکن سرمایہ داری کو بیخ وبُن سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور کسبِ زر وصرفِ زر کے لیے ایسے ضوابط وقوانین مقرر کرتا ہے کہ ایک شخص دولت مند تو ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیے لیکن سرمایہ دار نہیں ہوسکتا۔(۳۴) سرمایہ داری کے عناصر ترکیبی تین چیزیں ہیں۔(۱) افراطِ زر (۲) دولت کا چند لوگوں میں دائر سائر رہنا (۳) اور جمع مال وزر یہی وہ تین دروازے ہیں جن کے ذریعے سرمایہ داری کسی قوم کی معیشت کے جسم میں جراثیم بن کر داخل ہوتی ہے۔لیکن اسلام نے ان دروازوں پر ممانعت اور زجر وتوبیخ کے پہرے بٹھادیے ہیں۔(۳۵) ایک طرف اسلام نے دولت کے جمع کرنے پر قدغن لگائی تو دوسری طرف ایک شخص کی دولت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اور خلق اللہ کے حقوق ایسے اور اتنے مقرر کردیے کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی بڑی آمدنی کا مالک ہو بہرحال سرمایہ دار نہیں ہوسکتا۔(۳۶)

لیکن ہمارا معاشرہ اسی منجھدار میں الجھا ہوا ہے۔سرمایہ دار اور جاگیر دار پورے ملک کے والی وارث بنے ہوئے ہیں جن کے قبضے میں ہمارے پورے ملک کی دولت ہے وہ جس طرح چاہتے ہیں ملک کو چلاتے ہیں حکومت پر بھی ان کا قبضہ ہے۔عموماً سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کے بعض ممالک میں الگ الگ طبقے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بیشتر صورتوں میں یہ دونوں ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے وفادار سرداروں اور بااثر لوگوں کو زمین دے کر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا کیا۔اس زمیندار طبقہ نے ملک کے زرعی وسائل کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔پھر ان زرعی وسائل سے کام لے کر صنعتیں قائم کیں۔یوں ملک کے بڑے بڑے تجارتی ادارے ان کے انتظام میں آگئے۔اس معاشی قوت سے کام لے کر انھوں نے سیاسی قوت بھی حاصل کرلی۔اس طبقے کے بہت سے لوگ سول بیوروکریسی میں

شامل ہوگئے اور اب صورتحال یہ ہے کہ وہ طبقہ جس کو انگریز نے اپنے استعماری مفادات کی خاطر وسائل سے نوازا تھا، جس کی بدولت چار ہزار انگریز پورے برصغیر پر حکومت کرتے رہے۔ وہ طبقہ اب ہمارے ملک کا مستقل طور پر مالک بنا چکا ہے۔ اور یہ طبقہ اب پاکستان کا مستقل طور پر حاکم بھی بن گیا ہے۔ (۳۷)

غرض ان غیر اسلامی نظام معیشت کے قیام میں اصل محرک خودغرضی کا عنصر ہوتا ہے اور یہی فسادات کا بنیادی نقطہ بن جاتا ہے۔ فلسفہ اخلاق میں اس کو شر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس شر و فساد کو دوسرے رذائل اخلاق اور فاسدِ نظام سیاست اور زبوں حال معاشرہ کی بدولت پروان چڑھنے کا خوب موقع ملتا ہے اور آج بعینہٖ ہماری یہی حالت ہے۔ (۳۸)

ان غیر اسلامی نظامِ معاش کے دیگر مضر اثرات رفتہ رفتہ تمام معاشی و معاشرتی صلاح و فلاح پر متاثر ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تنگ نظری، خودغرضی، بداندیشی، بخل و بددیانتی، نفس پرستی، عیش کوشی اور ظلم کے جیسے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ آج ہماری معاشرتی زندگی کو دیکھ لیجیے کس طرح ان رذائل کی دیمک تہہ بہ تہہ لگ چکی ہے اور ان مفاسد ماحول میں کس قدر تباہ کاریاں جنم لے چکی ہیں اور لے رہی ہیں۔ یعنی عصمت فروشی، جرائم گردی، قتل و غارت گری، جسمانی کمزوریاں اور روحانی بیماریاں جنم لے رہی ہیں جو ہمارے معاشرے کو دن بدن کمزور کر رہی ہیں۔ (۳۹)

ان تمام مسائل کا بنیادی دائمی اور اصل حل تو یہ ہے کہ اسلامی معیشت کا نظام مکمل طور پر نافذ کیا جائے۔ ان تمام احکام اور قوانین پر ایک ایک کر کے عمل درآمد شروع کیا جائے جو شریعت نے ان مسائل کے حل کے لیے تجویز کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی سرگرمی میں حکومت کا موثر کردار، قانون سازی، پالیسی اور نگرانی کا رویہ، نگرانی کا ادارہ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ (۴۰) جو یقیناً ایک مخلص حکومت کر سکتی ہے۔ جو واقعتاً عوام کی نمائندہ ہو۔ عوام کے لیے ہو اور اس کا مطمع نظر عوام کی بہتری ہو۔

۴۔ سیاسی اسباب

ا۔ سیاست کا اسلامی متعین کردہ راہوں سے فرار

ہمارے معاشرے کے بگاڑ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پاکستانی اربابِ سیاست و حکومت نے اسلام کے متعین کردہ اصولوں سے پردہ پوشی اختیار کی ہوئی ہے۔ ہم نے اسلام کا نام لے کر اسلامی ریاست تو حاصل کر لی۔ لیکن اپنی مفاد پرستی اور خودغرضی کی بناء پر اسلامی جمہوری نظام کو قائم کرنے سے متعلق اپنے ارادوں اور خواہشات میں مخلص نہیں رہے۔ جس کی وجہ سے ریاست کی بنیادیں کمزور ہونا شروع ہوگئیں اگر ہم اسلامی تاریخ پر غور کریں اور بڑی بڑی مسلم ریاستوں کے آغاز کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر کا آغاز دینی محرکات کی بنیاد پر ہوا ہے اور جب تک وہ دینی محرک قوی رہا۔ ریاست قوی رہی۔ جب دینی محرک کمزور ہوگیا تو ریاست کی بنیادوں میں کمزوری کے آثار نمایاں ہونے

لگے۔[۴۱]

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دین ہر شعبہ زندگی پر محیط ہے زندگی کا کوئی بھی رخ، کوئی بھی پہلو جس کا تعلق چاہے کسی فرد سے ہو، چاہے اجتماعی انداز کا ہو، چاہے کسی ایک معاشرہ سے، چاہے قومی و بین الاقوامی سطح پر ہو، ہر حالت میں اسلام کے دائرہ کار سے باہر نہیں۔غرض اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں فکر وعمل کی رہنمائی کا کام دیتا ہے۔[۴۲] تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات اور دستور العمل ہے اس کے قانونِ عدل وانصاف، اس کے نظامِ اخلاق ومعاشرت اور دستور حکومت وسیاست میں دنیا کی تمام اجتماعی اور انفرادی مسائل ومعاملات کا مکمل حل اور علاج ہے اور یہ کسی مخصوص زمانے اور کسی خاص قوم کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر زمانے اور دنیا کی ہر قوم کے لیے ایک کامیاب ترین نسخہ شفا ہے۔[۴۳] وہ ہر عہد اور ہر دور کے باطل نظامہائے حیات اور غلط افکارِ زندگی کے خلاف مسلسل دعوتِ انقلاب واحتجاج دیتا رہتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کے قیام پر زور دیتا ہے۔جو ایک عالمگیر برادری کی بنیاد پر قائم ہو۔ایک ایسا معاشرہ جو تعصّبات ومکروہات اور نسلی وفرقہ وارانہ امتیازات سے منزہ، رنگ ونسل اور وطنی ولسانی حد بندیوں سے پاک ہو اور جس کی اساس ایسی فکری واخلاقی قدروں پر ہو۔جس کے افراد باہمی طور پر اخوت ومساوات کے رشتوں سے ایسے منسلک ہوں کہ زمانے کے بڑے سے بڑے انقلابات بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔[۴۴] یہ اسلام کی وہ بنیادی قدریں ہیں جو کسی بھی معاشرے کی اصلاح کا سبب بنتی ہیں، یہ قدریں عالمگیر ہیں۔پوری دنیا کی فلاح بھی اسی میں مضمر ہے کہ ان قدروں کو انسانی زندگی کا مقصد بنانے کی کوشش کی جائے جبکہ اسلامی معاشرے کے لیے تو یہ لازمی قدریں ہیں۔جن کے بغیر ہم اسلامی معاشرے کو پروان نہیں چڑھا سکتے۔گویا ایک پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے اسلام نے جس وسعت نظر سے کام لیا ہے وہ کسی اور مذہب نے نہیں لیا۔اسلام فکر ونظر سے لے کر اصول و اخلاق تک اور شخصی کردار سے لے کر معاشرتی قوانین تک اور خاندانی زندگی کے ضابطوں سے لے کر بین الاقوامی معاملات ہر چیز کے بارے میں رہنمائی دیتا ہے۔غرض اسلام ہی وہ معتدل روحانی، سیاسی، اجتماعی، اقتصادی، اخلاقی، تعلیمی اور تربیتی نظام قائم کر سکتا ہے جو کہ انسان کی تشکیلِ نو کر سکے اور ایک ایسے پُرامن اور اعتدال پسند معاشرے کے قیام کو یقینی بنا سکے جو آج تمام انسانیت کی فلاح وبقا کے لیے ناگزیر ہیں۔آج اسلام ہی تباہ حال انسانیت کے لیے واحد راہ نجات ہے۔[۴۵]

حوالہ جات

۱۔ فاروقی، جمیل الرحمٰن، اسلامی فلاحی معاشرے کا قیام، ص۵، مشمولہ: روز نامہ جنگ، کراچی، ۲۶/اپریل ۲۰۱۳ء
۲۔ قاضی، گوہر ممتاز، سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۵۴، کراچی، سردار سنز، جون ۱۹۸۹ء
۳۔ ایضاً، ص۳۲۷، ۳۵۵
۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد۲، ص۶۹۳، دانش گاہ پنجاب لاہور، طبع اول، ۱۹۸۰ء،
۵۔ ایضاً، ص۶۷۴
۶۔ دیدات، شیخ احمد، مترجم: مصباح اکرم، اسلامی نظام زندگی: قرآن عصری سائنس کی روشنی میں، ص۱۸۱، لاہور، عبداللہ اکیڈیمی، ۲۰۱۰ء
۷۔ اکبرآبادی، سعید احمد، نظرات، مشمولہ، ماہنامہ برہان''، جلد۹۰، شمارہ ۵، ص۳۲، دہلی، ندوۃ المصنّفین، مئی ۱۹۸۳ء
۸۔ قاضی، گوہر ممتاز، سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۵۷
۹۔ ایضاً، ص۳۵۶
۱۰۔ ایضاً، ص۳۵۹
۱۱۔ دیدات، شیخ احمد، اسلامی نظام زندگی: قرآن عصری سائنس کی روشنی میں، ص۲۲، ۲۳
۱۲۔ ایضاً، ص۲۳
۱۳۔ قاضی، گوہر ممتاز، سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۶۰، ۳۶۱
۱۴۔ ایضاً، ص۶، ۷، ۳۶۱، ۳۶۲
۱۵۔ ایضاً، ص۳۷۳
۱۶۔ احمد، خورشید، اسلامی نظریہ حیات، اشاعت ششم، ص۱۶۸، ۱۶۹، کراچی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، جنوری ۱۹۸۱ء
۱۷۔ قاضی، گوہر ممتاز، سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۶۶
۱۸۔ دیدات، شیخ احمد، اسلامی نظام زندگی: قرآن عصری سائنس کی روشنی میں، ص۶۸
۱۹۔ قاضی، گوہر ممتاز، سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۷۴، ۳۷۵
۲۰۔ غازی، محمود احمد، محاضرات شریعت، ص۱۵۵، لاہور، الفیصل، ستمبر ۲۰۰۹ء
۲۱۔ قاضی، گوہر ممتاز، سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۷۴
۲۲۔ محی الدین، ابوزہرہ، مفتی، فرقہ واریت و باہمی اختلافات کا خاتمہ، مشمولہ، روز نامہ جنگ، ص۵، کراچی، ۵/اپریل ۲۱۰۳ء

۲۳۔ قاضی، گوہرممتاز، سیرت النبیﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۷۶، ۳۷۷

۲۴۔ ایضاً، ص۳۷۷

۲۵۔ سورۃ الحجرات کی آیت: (۱۱۔۱۲) میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: ''اے ایمان والوں! دیکھو کوئی ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے تم جس کا مذاق اڑا رہے ہو وہ تم سے بہتر ہو اور اس طرح عورتیں عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں ممکن ہے جس کا مذاق اڑایا گیا ہے وہ مذاق اڑانے والیوں سے بہتر ہوں اور ہاں! آپس میں ایک دوسرے کو طعن و تشنیع نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کا نام دھرو، ایمان لانے کے بعد یہ بدتہذیبی بہت بڑی ہے اور جو لوگ ان چیزوں سے توبہ نہیں کرتے بس ظالم وہی ہیں، اے ایمان والوں! لوگوں کی نسبت زیادہ بدگمانی سے بچتے رہو، کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے ٹٹول میں نہ رہا کرو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو کیا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے جس سے تم نفرت کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو'' بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔''

۲۶۔ قاضی، گوہرممتاز، سیرت النبیﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۷۹

۲۷۔ ایضاً، ص۳۸۰

۲۸۔ خان، محمد اکرم، مولانا مودودی کے معاشی افکار، ص۲۹، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۹۰ء

۲۹۔ جیسے ان میں جوا اور شراب حرام ہے، ناجائز جنسی خواہشات پوری کرنے کا معاوضہ حرام ہے، لہوولعب اور رقص وسرور وغیرہ میں دولت کا ضائع کرنا حرام ہے اور اسی طرح دولت کا خرچ نہ کرتے ہوئے گن گن کر رکھ چھوڑنے والا بھی قابل گرفت ہے۔
عبدالرشید، ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ، ص۴۹۴، کراچی، طاہر سنز، جولائی ۲۰۰۴ء

۳۰۔ قاضی، گوہرممتاز، سیرت النبیﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۸۱

۳۱۔ ایضاً، ص۳۸۲

۳۲۔ اکبرآبادی، سعید احمد، اسلام اور انسانیت کی بقاء، مشمولہ، ماہنامہ برہان، جلد ۸۶، شمارہ ۲، ص۹، دہلی، ندوۃ المصنّفین، فروری ۱۹۸۱ء

۳۳۔ غازی، محمود احمد، محاضراتِ معیشت وتجارت، ص۱۳۱، لاہور، الفیصل، اپریل ۲۰۱۰ء

۳۴۔ اکبرآبادی، سعید احمد، اسلام اور انسانیت کی بقاء، ص۹

۳۵۔ دیکھیے: سورۃ العادیات: ۸، ۹، ۱۰، سورۃ التوبۃ: ۳۴، ۳۵، سورۃ الھمزۃ

۳۶۔ اکبرآبادی، سعید احمد، سفرنامہ پاکستان، مشمولہ، ماہنامہ برہان، جلد ۷۹، شمارہ ۱، ص۱۰، ۱۱، دہلی، ندوۃ المصنّفین، جولائی ۱۹۷۷ء

۳۷۔ غازی، محمود احمد، محاضراتِ معیشت وتجارت، ص۱۴۰، ۱۴۱

۳۸۔ قاضی، گوہرممتاز، سیرت النبیﷺ اور ہماری زندگی، ص۳۸۳

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ غازی، محمود احمد، محاضراتِ معیشت وتجارت، ص ۱۴۱

۴۱۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہمارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ہے جو اسلام کے نام پر بنا۔ دوقومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان مغربی نظام جمہوریت کا انکار کر کے ہی قائم ہوسکا۔ مغربی تصورِ قومیت کو مسترد کر کے قائم ہوا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران سب سے بڑا حوالہ ملّت مسلمہ، اسلامی شریعت اور مسلم برداری کا حوالہ تھا۔ افغانستان کی ریاست جب احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں قائم ہوئی تو احمد شاہ ابدالی نے افغانیوں کو اسلام کے نام پر جمع ہونے کو کہا تھا پھر سعودی عرب کی حکومت تو خالص اسلامی دعوت ہی کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی موجودہ ایران، موجودہ لیبیا، موجودہ مراکش یہ سب اپنے اپنے اوقات میں خالص دینی دعوت کی بنیاد پر بننے والی ریاستیں ہیں۔ سلطنت بنی عباس اور سلطنت عثمانیہ کا آغاز بھی دینی دعوت سے ہوا۔ مغلوں کے دور کی اسلامی ریاستیں، ایران کی صفوی ریاست خالص مذہبی دعوت کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ سلطنتِ مغلیہ کے بانی بابر کو بھی یہاں کے مسلمان حکمرانوں نے، علماء نے، مسلمان قائدین نے خطوط لکھے تھے۔ ملّتِ مسلمہ کے تحفظ کے لیے اس کو یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ سب ریاستیں مذہب ہی کی بنیاد پر قائم ہوئیں لیکن جب دین کی قوت کمزور پڑی تو لسانی، قبائلی، علاقائی اور مقامی عصبیتوں نے جنم لیا اور اصل مقصد سے توجہ ہٹ گئی لیکن اگر دینی دعوت مضبوط ہوتو پھر مقامی عصبیتیں سر نہیں اٹھاتیں اور سب کی توجہ اصل مقصد کی طرف لگ جاتی ہے ابن خلدون نے تاریخ کے واقعات سے، قادسیہ اور یرموک کی کامیابی سے، موحدین کے پورے دور کی تاریخ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی تاریخ میں وہ ریاستیں کامیاب رہی ہیں جن کے دور میں دینی دعوت مضبوط تھی جو دین کی پابند تھیں اور دین ہی کی مدد سے ان کو قوت مل رہی تھی۔ غازی، محمود احمد، محاضراتِ شریعت، ص ۲۸۸، ۲۸۹

۴۲۔ قاضی، گوہر ممتاز، سیرت النبی ﷺ اور ہماری زندگی، ص ۳۱۱

۴۳۔ اکبرآبادی، سعید احمد، نظرات، جلد ہفتم، شمارہ ۳، ص ۱۶۴، ستمبر ۱۹۴۱ء

۴۴۔ عبدالرشید، ادیان ومذاہب کا تقابلی مطالعہ، ص ۴۴۴

۴۵۔ فاروقی، جمیل الرحمٰن، اسلامی فلاحی معاشرے کا قیام، ص ۵

مسئلہ افراطِ آبادی: اسلامی تعلیمات اور جدید سائنس کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد احسن قریشی☆

Abstract:

"Human society is known by human population, but over population has been discussed as a serious issue of society. Argumentation is given in opposition as well as in favour what is said in Islamic teachings and what is the modern scientific point of view regarding the population issue? An analytical approach has been presented in this article in the light of Islamic teachings and modern science."

Keywords: Population Problem, Inflation, Islamic Teaching Regarding Population Planning.

آبادی میں اضافے کو جدید دور کے بڑے بڑے معاشرتی مسائل میں سے ایک سنجیدہ مسئلہ قرار دیا جاتا ہے۔ بے قید بڑھتی ہوئی آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل سے انکار بھی ممکن نہیں اور کسی منفی مقصد کے تحت انسانی آبادی پر قابو پانے کے لیے مہم جوئی بھی درست نہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی اور سائنسی نکتۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آبادی میں اضافہ کی وجہ سے قابل کاشت رقبہ میں کمی کو بھی ایک بڑا خطرہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یقیناً اللہ تعالی کی قرآن مجید میں بیان کردہ ہر مثال میں حکمت کے خزینے پوشیدہ ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَھُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنۡبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ط وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ"(۱)

ترجمہ: (ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ، اس سے اگیں سات بالیں، ہر بالی میں ہوں سو سو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے۔)

☆ پی ایچ ڈی (اسلامیات) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اس آیت مبارکہ میں زراعت کے بارے میں ایک ہدف کا تعین کیا گیا ہے کہ غلہ دار اجناس کے ایک دانے سے سات سو دانے یا اس سے بھی زائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔[۲]

۱۹۶۰ء کی دہائی میں آنے والے سبز انقلاب کے بعد ماہرین ایک دانے سے تقریباً ۱۰۰ دانے حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اس وقت ہمارے ملک کی مجموعی اوسط پیداوار ۲۷من فی ایکڑ ہے یعنی ایک دانے سے ۱۰۰ دانے حاصل ہونے کی صورت میں پیداوار ۲۷من فی ایکڑ ہے اگر اپنی تحقیق، جستجو اور لگن سے ایک دانے سے ۷۰۰ دانے (یعنی سات گنا) حاصل کیے جائیں تو ہماری اوسط پیداوار ۱۸۹من فی ایکڑ ہو سکتی ہے۔ گویا ارشاد ربانی کے مطابق گندم کی پیداوار میں ۱۶۲من فی ایکڑ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔[۳]

یہ آیت اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ جب آبادی میں اضافہ ہوگا اور قابل کاشت رقبہ میں کمی آئے گی تو کم زمین بھی زیادہ اناج دے کر خوراک کی کمی کا مسئلہ حل کر دے گی۔اس لیے آبادی میں اضافے سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ آبادی میں اضافہ کے بعد رہائشی علاقوں کی کمی بھی ایک مسئلہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔اس مسئلے کے متعلق قرآن نے کئی سو سال قبل ہی بتا دیا تھا کہ:

"لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ"[۴]

ترجمہ: (کہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی۔)

قدیم مفسرین نے اس آیت میں درجات کی تفسیر نظام فلکی سے ہٹ کر انسان کی روحانی زندگی، نیک لوگوں کا ایک جنت سے دوسری جنت کی جانا، ایک حالت سے دوسری حالت میں جانا اور بعض نے انسان کی دنیا میں مرحلہ وار ترقی یا ارتقاء کو بیان کیا ہے۔لیکن آج کی بلند و بالا اور کئی منزلوں پر محیط عمارتیں اس آیت کی حقیقی تفسیر کرتی نظر آتی ہیں۔صرف چند منزلہ عمارت کئی ہزار لوگوں کو رہائش، تمام بنیادی سہولتوں سمیت مہیا کر رہی ہے۔

آج سے ایک سو سال قبل تک انسان بہت سی بنیادی سہولیات سے محروم تھا۔صاف پانی، سیوریج کا نظام اور صفائی ستھرائی کے آلات مفقود تھے۔آج اگر صاف پانی کی کمی ہے تو اس کے لیے واٹر فلٹریشن پلانٹس بھی موجود ہیں۔جب آبادی کم تھی اس وقت فصل بھی کم ہوتی تھی اور انسان کو باجرہ اور مکئی پر انحصار کرنا ہوتا تھا۔۱۹۶۰ء میں پاکستان کی گندم کی پیداوار انتالیس لاکھ نو ہزار میٹرک ٹن تھی جبکہ ۲۰۱۱ میں دو کروڑ پچاس لاکھ میٹرک ٹن تھی۔[۵]

جب آبادی کم تھی تو گندم کی ضرورت بھی کم تھی۔اب آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ گندم کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ ز وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ"[۶]

ترجمہ:(اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور نہیں اتارتے اسے مگر ایک اندازۂ معین پر۔)

پھر اس کی وجہ بھی خود قرآن کریم میں بیان کر دی گئی کہ:

"وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ط اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌ بَصِيْرٌ"(۷)

ترجمہ:(اور اگر اللہ بندوں کا رزق وسیع کر دیتا تو ضرور زمین میں فساد پھیلاتے لیکن وہ اندازے سے اتنا اتارتا ہے جو چاہے، بے شک وہ اپنے بندوں سے خبر دار ہے، انہیں دیکھتا ہے۔)

پاکستان ایگریکلچرل ریسرچ کونسل کی رپورٹ کے مطابق ۹۱۔۱۹۹۰ء میں تقریباً ۲۱.۸۲ملین ہیکٹر زمین قابل کاشت تھی جبکہ ۲۰۰۱۔۲۰۰۰ میں ۲۲.۷۶ملین ہیکٹر زمین کو قابل کاشت بنایا گیا۔ یہ اضافہ صرف دس سالوں میں ہوا کیونکہ اس سے پہلے کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔(۸)

اسی طرح جب تک ایک دانے سے سات سو دانے حاصل نہیں ہو جاتے یہ پیداوار بڑھتی رہے گی۔اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ"(۹)

ترجمہ:(اور اپنی اولاد کو رزق کی کمی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ہم تمہیں بھی (رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی (دیں گے)

مولانا محمد سرفراز خان صفدر اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"۔۔۔ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔اگر انہیں تم رزق کے خوف سے قتل کرتے ہو کہ کھائیں گے کہاں سے تو پہلے خود کشی کرو کہ تم کہاں سے کھاؤ گے؟ جو رب تعالیٰ تمہیں دیتا ہے ان کو بھی دے گا۔"(۱۰)

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ "نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ پوچھا گیا اس کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اولاد کو اس خوف سے مار ڈالنا کہ انہیں بھی اپنے ساتھ شریک غذا کرنا پڑے گا۔"(۱۱)

قرآن میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

"وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ط اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا"(۱۲)

ترجمہ:(اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ہم انہیں بھی (رزق) دیں گے اور تمہیں بھی۔بے شک ان کا قتل ایک بہت بڑی غلطی ہے۔)

مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اس

خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے، بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی یہ بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے، تنے ہی بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں۔"(۱۳)

پیر کرم شاہ الازہری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قرآن کریم نے نسل کشی کو خِطْاً کَبِیْرًا (بہت بڑی غلطی) کہا ہے اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو فرانس وغیرہ ممالک پر نظر ڈالیے۔ جنھوں نے مصنوعی ذرائع سے ضبط تولید کر کے اپنی تعداد کو گھٹا دیا اور جب جرمن فوجیں ان پر حملہ آور ہوئیں تو ان کے پاس ایسے جوانوں کی شدید قلت تھی جو مادر وطن کی حفاظت کے لیے میدانِ جنگ میں سینہ سپر ہوسکیں۔ ایسا اقدام جس سے قوم اور وطن کی آزادی خطرے میں پڑ جائے اس کو اگر بڑی غلطی نہ کہا جائے تو کیا اسے دانشمندی کہا جائے؟"(۱۴)

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"أَنْتَ تَخْلُقُهٗ؟ وَأَنْتَ تَرْزُقُهٗ"(۱۵)

ترجمہ: (کیا تم اسے پیدا کرو گے؟ اور کیا تم اسے کھلاؤ گے؟)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"... لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا ط نَحْنُ نَرْزُقُکَ ط..."(۱۶)

ترجمہ: (ہم تم سے رزق نہیں مانگتے، ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں۔)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا سید احمد حسن محدث دہلوی صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی گئی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"ماں کے پیٹ میں جب بچہ کا پتلا تیار ہو جاتا ہے تو اس میں روح پھونکے جانے سے پہلے اس کی تمام عمر کا رزق اللہ کے حکم سے فرشتہ لکھ لیتا ہے۔ یہ حدیث نَحْنُ نَرْزُقُکَ کی گویا تفسیر ہے۔"(۱۷)

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

"وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا"(۱۸)

ترجمہ: (اور زمین میں کوئی (بھی) ایسا جاندار نہیں مگر اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔)

حافظ صلاح الدین یوسف اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"وہ (اللہ تعالیٰ) کفیل اور ذمہ دار ہے۔ زمین پر چلنے والی ہر مخلوق انسان ہو یا جن، چرند ہو یا پرند، چھوٹی ہو یا بڑی، بحری ہو یا بری، ہر ایک کو اس کی نوعی یا جنسی ضروریات کے مطابق وہ خوراک مہیا کرتا ہے۔"(۱۹)

مزید فرمایا:

''وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا صلے ق اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاکُمْ''(۲۰)

ترجمہ:(اور کتنے ہی جاندار ایسے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی۔)

اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ بھی موجود ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے اور اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ جس ذی روح نے اس دنیا میں آنا ہے اور یہاں پر رزق پانا ہے وہ آ کر ہی رہتا ہے اس کے لیے انسان جتنی بھی کوشش کر لے وہ صرف ایک سعی لا حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''عن ابی سعید الخدری، قال...لَا عَلَیْکُمْ أَنْ لَا تَفْعَلُوْا، فَاِ نَّمَاھُوَ الْقَدَرُ''(۲۱)

ترجمہ:(ابوسعید الخدری سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔۔۔تم ایسا نہ بھی کرو تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ تو تقدیر کی بات ہے۔)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اِصْنَعُوْا مَاشِئْتُمْ فَاِ نَّهُ مَا یُرِدِاللّٰهُ یَکُنْ''(۲۲)

ترجمہ:(جو تم چاہو کرو اور اللہ تعالیٰ جس کا ارادہ فرماتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔)

کیونکہ انسان کی پسند اور اللہ تعالیٰ کی پسند میں فرق ہے۔ انسان کی پسند ظاہری لحاظ سے ہوتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی پسند میں کوئی نہ کوئی بظاہر نہ دکھائی دینے والا فائدہ اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

''اِفْعَلُوْا مَابَدَا لَکُمْ، فَاِنَّ اللّٰهَ یَقْضِیْ مَا أَحَبَّ، وَ اِنْ کَرِھْتُمْ''(۲۳)

ترجمہ:(جو تمہارے لیے ظاہر ہو کرو، پس اللہ تعالیٰ وہی فیصلہ فرماتا ہے جو اسے پسند آتا ہے اگرچہ تمہیں ناپسند ہو۔)

اللہ تعالیٰ جب اولاد عطا فرمانا چاہے تو ساری کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ حضور اکرام ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''مَاکَتَبَ اللّٰهُ خَلْقَ نَسْمَةٍ هِیَ کَائِنَةٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ اِلَّا سَتَکُوْن''(۲۴)

ترجمہ:(قیامت تک اللہ تعالیٰ نے جس روح کو پیدا کرنے کے بارے میں لکھ دیا ہے وہ پیدا ہو کر ہی رہے گی۔)

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

''وَاِذَا أَرَادَاللّٰهُ خَلْقَ شَیْءٍ لَمْ یَمْنَعْهُ شَیْءٌ''(۲۵)

ترجمہ:(اور جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے تو اسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔)

ایک بات تو طے ہوگئی کہ کسی بھی ذی روح کا اس دنیا میں آنا یا نہ آنا پہلے سے طے شدہ ہے اور انسان اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا تصرف نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی کی خوراک کا انتظام کسی دوسرے انسان کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اللہ رب العزت انسانوں کی تعداد اور ضرورت کے مطابق خوراک کا انتظام خود فرماتے ہیں۔

خوراک کی کمی کو پورا کرنے کے متعلق قرآن کریم میں حضرت عزیرؑ کا واقعہ مذکور ہے۔ حضرت عزیرؑ بیت المقدس کے پاس سے گزرے جسے بخت نصر تباہ کر چکا تھا۔ سوچنے لگے کیا اس ہلاک شدہ بستی کا احیاء ثانی ممکن ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سو سال کے لیے موت دے دی اور پھر زندہ کر کے فرمایا:

''فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّهْ''(۲۶)

ترجمہ: (اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا سڑ نہیں گیا۔۔۔)

حضرت عزیر علیہ السلام کے اس واقع میں بیان شدہ اشیاء کو پہلے صرف ایک معجزاتی کام سمجھ کر ایمان بالغیب کے طور پر مانا جاتا تھا۔ قدیم مفسرین نے انہی باتوں کی اپنے اپنے علم کے مطابق وضاحت کی۔ لیکن اس واقعہ میں پوشیدہ سائنسی راز مشتبہ تھے۔ جن کی وضاحت آج سے پہلے ممکن نہ تھی۔ لیکن آج کی جدید سائنس میں اس واقعہ کو مختلف انداز میں پیش کرنا ممکن ہوا۔ مثلاً اس واقعہ میں سائنسی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ دودھ اور انجیر خراب کیوں نہ ہوئے؟ شاید یہ انسان کے لیے ایک پیغام ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء کو زیادہ عرصہ تک محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ماہرین اشربہ اور اغذیہ کو اس مہارت اور قابلیت سے ڈبوں میں بند کرتے ہیں کہ سالہا سال خراب نہیں ہوتیں۔(۲۷)

آج کا انسان سو برس یہ دیکھنے کے لیے زندہ تو نہیں رہ سکتا کہ اس کی محفوظ کی ہوئی اشیاء ٹھیک ہیں یا نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں سائنس اتنی ترقی کر لے کہ خوراک کو زیادہ عرصے تک ذخیرہ کیا جا سکے۔ حضرت عزیر علیہ السلام سے متعلق آیت کے مفہوم کو آبادی میں اضافے کی وجہ سے ہونے والی تشویش کے ختم کرنے یا بڑھتی ہوئی جنگوں اور فسادات کے دوران خوراک مہیا کرنے جیسے مسائل حل کرنے کے لیے بھی زیر بحث لایا جا سکتا ہے اور سائنس ان خطوط پر مزید تحقیق کر کے واقعے میں دیئے گئے اشارات کو مزید واضح کر سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ جدید ترین ذرائع مواصلات کی بدولت خوراک کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ممکن ہو گیا ہے۔ خوراک کو نہ صرف تیزی سے بلکہ انتہائی محفوظ طریقے سے پہنچایا جاتا ہے کہ اس کی تازگی اور غذائیت برقرار رہتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت یوسفؑ کا واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی آیات اور وضاحت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آبادی میں اضافہ کبھی بھی رزق اور قابل کاشت رقبے میں کمی کا باعث نہیں بنا اور نہ ہی بنے گا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کی رائے اپنی اہمیت رکھتی ہے:

''یہ غلط فہمی ہے کہ اگر بچے کم ہوں تو انہیں بہتر تعلیم اور معیاری زندگی مہیا کی جاسکتی ہے تاہم یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ کوئی نہیں جان سکتا کہ کون سا بچہ خاندان کے لیے خالق کی طرف سے رحمت ہوگا، یہ عین ممکن ہے جسے والدین وبال جان سمجھ رہے ہوں وہ والدین اور معاشرے کے لیے رحمت ثابت ہو۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ بہت سے عظیم سائنس دان، مفکر اور انقلابی رہنما اپنے والدین کے پہلے دو بچوں میں سے نہیں تھے، لہٰذا وہ بچہ جو والدین کا ناپسندیدہ ہو، اخلاقی اور معاشی طور پر خاندان کے باعث رحمت ہوسکتا ہے۔''(۲۸)

ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ

ماہرین آبادی، آبادی میں اضافہ کو ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ایٹمی جنگ کے علاوہ ایک اور عامل جو انسانی زندگی کو تباہ اور اپاہج کرسکتا ہے وہ ماحولیاتی آلودگی ہے۔ سورج کی شعاعیں ایک تناسب سے اوزون گیس میں جذب ہوکر زمین کی سطح تک پہنچتی ہیں لیکن فضائی آلودگی کے باعث اوزون کی تہہ میں سوراخ ہوجانے سے زمین کے درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جس سے نباتات برابر متاثر ہورہے ہیں اور نباتات سے آکسیجن کی فراہمی میں کمی آرہی ہے جو یقینی طور پر انسانی زندگی کو متاثر کررہی ہے۔(۲۹)

ایک ایسی صدی اور جگہ پر جہاں ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں آگاہ ہونا بہت ہی مشکل کام تھا لیکن قرآن مجید نے اس کے بارے میں نہ صرف آگاہ کیا بلکہ اس کے ممکنہ خطرات سے بھی خبردار کیا۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے۔ انسان کے لیے اس میں ایک بہت بڑا سبق موجود ہے۔ آج انسان اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے تباہی خرید رہا ہے جس کے بارے میں کئی سو سال پہلے اللہ رب العزت نے واضح طور پر مطلع کردیا تھا۔ ارشاد ربانی ہے۔

''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ''(۳۰)

ترجمہ: (پھیل پڑی ہے خرابی خشکی پر اور دریا میں لوگوں کے ہاتھ کی کمائی سے چکھانا چاہیے ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا تاکہ وہ لوٹ آئیں۔)

انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب نے اس آلودگی میں بے پناہ اضافہ کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اس مسئلے کو پذیرائی ۱۹۷۰ کے بعد ہی مل پائی ہے اور آج ماحولیاتی آلودگی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے بہت ساری بیماریاں جنم لے رہیں ہیں جن کی سب سے بڑی وجہ اوزون کی تہہ میں ہونے والا بڑا شگاف ہے جس کے باعث سورج کی انتہائی خطرناک شعاعیں براہ راست زمین پر آنا شروع ہوگئیں ہیں جن کی وجہ سے جلد کا کینسر بڑھ رہا ہے۔

قرآن کریم نے فساد فی البر اور فساد فی البحر کے الفاظ میں مختلف اقسام کی ماحولیاتی آلودگی طرف ہماری توجہ دلائی مثلاً شور سے پیدا ہونے والی آلودگی جس کے باعث انسانوں میں چڑچڑاپن، ڈیپریشن اور متعدد بیماریوں میں اضافہ دیکھا گیا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے فساد فی البر میں اشارہ کیا اور بحری آلودگی یا پانی کی آلودگی جس کی طرف قرآن کریم نے فساد فی البحر میں میں اشارہ کیا ہے۔تمام کارخانوں کا فضلہ سمندر میں پھینکنے سے سمندری مخلوق کو بھی نقصان ہو رہا ہے اور انسانوں کا بھی۔

فساد فی البر اور فساد فی البحر کے مفہوم کو قدیم مفسرین نے اپنے ماحول کے پیرائے میں واضح کیا لیکن وہ اس میں فضا و سمندر میں فساد کے اصل مفہوم کو واضح نہ کر سکے لیکن اب سائنسی تحقیق سے جب خشکی، فضا اور سمندر مین آلودگی کا مسئلہ پیدا ہونے کی وضاحت کی جو زمین پر بسنے والی ہر زندہ چیز کے لیے خطرہ ہے، تو فساد کا صحیح مفہوم واضح ہوا اور مفہوم کا اشتباہ ختم ہو کر محکم بن گیا۔قرآن کریم کی دیگر متشابہ آیت کو تو نئی سائنسی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے لیکن مذکورہ آیت کی تصدیق کا باعث خود اسی سائنس کی بنائی ہوئی اشیاء ہیں مثلاً کارخانے اور بڑی بڑی فیکٹریاں اور ذرائع مواصلات اور آمدورفت۔

ماحولیاتی آلودگی کا باعث آبادی میں اضافہ نہیں ہے بلکہ سودی نظام ہے جس کے تحت تقریباً تمام بینک گاڑیاں لیز پر دے رہے ہیں اس طرح ایک عام آدمی جو شاید ہی نئی گاڑی خرید سکتا وہ نہ صرف گاڑی کا با آسانی مالک بن گیا ہے بلکہ رینٹ اے کار جیسے بزنس کا مالک بھی بن گیا ہے۔میزان بینک کی رپورٹ کے مطابق صرف ایک بینک نے گیارہ سالوں میں ۱.۵بلین روپے کا بزنس کیا ہے اور اب تک آٹھ ہزار پانچ سو گاڑیاں ایسی ہیں جن کے معاہدے چل رہے ہیں۔ یہ ان گاڑیوں کے علاوہ ہیں جن کے مالکان بینک کو پوری قسطیں ادا کے گاڑیاں اپنے نام کروا چکے ہیں۔میزان بینک نے صرف ایک سال کے دوران ۲۶۰۳ گاڑیاں لیز کی ہیں۔ (۳۱)

یہ معلومات بینک کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ باقی بینکوں کی ویب سائٹ پر رپورٹس تو موجود ہیں لیکن ان میں اتنی تفصیل درج نہیں ہے۔

سٹیٹ بینک آف پاکستان کے مطابق اس وقت ۳۸ بینک پاکستان میں کام کر رہے ہیں۔ (۳۲)

ان میں سے اگر ۳۰ بینک بھی کار فنانسنگ کر رہے ہوں اور ایک بینک ایک سال میں ۲۰۰۰ گاڑیاں لیز کرے تو ۶۰۰۰۰ نئی گاڑیاں ہر سال سڑک پر آ رہی ہیں۔اس طرح ہر سال ۶۰۰۰۰ لوگ سودی کاروبار کر کے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے بڑھنے سے نہیں بلکہ سودی کاروبار کے بڑھنے سے ماحولیاتی آلودگی میں نہ صرف اضافہ ہو رہا ہے بلکہ تیل اور گیس کے ذخائر میں کمی آ رہی ہے اور توانائی کا بحران شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

صاف پانی کی عدم دستیابی

صاف پانی کی عدم دستیابی کو آبادی میں اضافہ کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے۔اس کے لیے تھوڑی تفصیل درکار ہے جس کی مدد سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ پانی کی دستیابی کا کوئی مسئلہ آبادی میں اضافے کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ انتظامی خامیوں کی وجہ سے ہے۔

انگریزی لفظ Tide جس کا اردو میں ترجمہ 'لہر' کیا جاتا ہے پانی میں اتار چڑھاؤ کے لیے مخصوص ہے۔ یہ لہریں چاند کی کشش کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر یہ لہریں بڑی جھیلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

لہروں کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ چاند اور زمین دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ چاند کی کوشش ہوتی ہے کہ زمین پر موجود ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لے لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین میں اتنی قوت رکھی ہے کہ وہ پانی کے سوا ہر چیز کو روک لے۔ پانی چاند کی کشش کی وجہ سے ہر وقت حرکت میں رہتا ہے اور زمین اس کو روک نہیں پاتی اور چاند پانی کو اپنی طرف کھینچ لینے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کشش مخصوص دنوں میں زیادہ ہو جاتی ہے۔[۳۳]

ہر روز زمین پر دو قسم کے مدّ و جزر وقوع پذیر ہوتے ہیں:

۱۔مدّ و جزر اکبر High Tides　　۲۔مدّ و جزر اصغر Low Tides

سمندر ہر وقت مدّ و جزر اکبر اور مدّ و جزر اصغر کی کیفیت میں رہتا ہے۔ دو مدّ و جزر ہونے میں تقریباً ۱۲ گھنٹے اور ۲۵ منٹ کا فرق ہوتا ہے۔ چاند کی کشش کے باعث ہوا اور کشش کرنٹ پانی کی سطح کو تیز چلا کر موجوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ چاند کی کشش سمندر کو چاند کی سمت میں اچھال دیتی ہے۔ سورج، چاند اور زمین کی کشش کی وجہ سے سمندر کی سطح روزانہ تبدیل ہوتی ہے۔ چونکہ چاند زمین کے گرد اور دونوں (چاند اور زمین) سورج کے گرد گھومتے ہیں اس لیے یہ تمام کششیں مل کر دنیا کے سمندروں کے اتار چڑھاؤ کا سبب بنتی ہیں۔ جب چاند اور سورج ایک لائن میں آجائیں تو اس کشش میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو جاتا ہے پھر اس سے بہت بڑی اور بہت ہی چھوٹی لہریں بنتی ہیں جنہیں سپرنگ ٹائیڈز (Spring Tides) کا نام دیا گیا ہے اور جب چاند اور سورج ایک لائن میں نہ ہوں تو کشش کی دونوں بڑی قوتیں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں جس کے باعث عام لہریں وجود میں آتی ہیں جنہیں نیپ ٹائیڈز (Neap Tides) کہا جاتا ہے۔اس طرح مختلف حالات یعنی چاند کی مختلف تاریخوں میں مدّ و جزر کی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔[۳۴]

جدید سائنس نے ثابت کیا ہے پانی کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی چاند کے باعث ہی ہوتی ہے۔ چاند صرف سمندر پر ہی اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ ٹھوس زمین پر بھی اپنا اثر رکھتا ہے اس لیے لازمی طور زیر زمین پانی کی حرکت میں بھی یہی عمل اثر انداز ہوتا ہے اور زیر زمین پانی زمین کی رگوں میں حرکت کرتا ہے اور یوں زیر زمین پانی کا خزانہ مختلف زیر زمین چینل (Channel) میں گردش کرتا ہے۔ان جدید تحقیقات

سے قرآن کریم کی آیت کریمہ کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے جسے پہلے مفسرین نے صرف لغوی معنی سے بیان کیا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

"وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَق"(۳۵)

ترجمہ: (اور قسم ہے چاند کی جب وہ پانی کو کھینچتا ہے۔)

اس آیت میں چاند کی اس حالت کو بطور گواہ پیش کیا گیا جب کہ وہ سقے کا کام کرے۔

سِقَایَة: پانی پلانے کا پیشہ اور سُقْیًا یعنی پانی دینا اور استسقاء کا معنی بارش مانگنا ہے۔(۳۶)

اس لیے بارش کے لیے جو نماز ادا کی جاتی ہے اسے نماز استسقاء کہا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے واقعے میں قرآن میں ارشاد ہے:

"وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ"(۳۷)

ترجمہ: (اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے بارش مانگی۔)

قدیم تراجم اور تفاسیر میں آیت وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَق کا مطلب روایتی انداز میں یہی بتایا گیا ہے 'اور چاند کی (قسم) جب وہ پورا ہو جاتا ہے'

اس روایتی ترجمے میں ایک شاندار کائناتی انکشاف کافی عرصے تک منکشف نہ ہو سکا اور مبہم رہا لیکن جدید سائنسی تحقیق نے قرآن کی آیت کے اس عظیم انکشاف کو سامنے لا کر قرآن کریم کے اصل مفہوم کی وضاحت کی اور آیت کے مفہوم کو کائنات کے ایک عظیم اصول قدرت سے وابستہ کیا۔

اس ساری بحث سے ثابت ہوا کہ پانی کا انتظام کرنا اللہ تعالیٰ نے چاند کی ذمہ داری میں لگا دیا ہے۔ جب تک سورج، چاند اور یہ کائنات رہے گی چاند اپنا کام کرتا رہے گا اور ہر جگہ، ہر علاقے کو پانی فراہم کرتا رہے گا۔ اس سلسلے میں پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اپنے ذرائع ترسیل کو درست کرنے اور اس پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ بڑھتی ہوئی آبادی کو پانی مہیا کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے وسائل کا درست انداز میں استعمال ہی اس کا حل ہے۔

قدرتی وسائل میں کمی

قدرتی وسائل میں کمی کو بھی بڑھتی ہوئی آبادی سے منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

معدنی کوئلہ اور تیل موجودہ دور کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ قرآن کریم میں اس کی طرف لطیف اشارات موجود ہیں لیکن جن آیات میں یہ اشارات تھے ان کی مکمل وضاحت سائنسی تحقیق سے قبل کما حقہٗ ممکن نہ تھی۔ ارشاد ربانی ہے:

"وَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى"(۳۸)

ترجمہ: (اور جس نے نکالا چارا پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ۔)

قدیم مفسرین نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان اشارات کو واضح کیا لیکن پھر بھی ان میں ابہام اور تشابہ موجود رہا۔

عام طور پر اس کی تفسیر یوں بیان کی جاتی ہے:

''یہ بھی اسی (اللہ) کا کام ہے کہ جانوروں کے لیے چارہ زمین سے اگایا پھر اس کو سکھا کر سیاہی مائل اور ہلکا پھلکا کر دیا جسے پانی کی رو بہا کر اِدھر اُدھر لے جاتی ہے۔''(۳۹)

موجودہ دور کی سائنسی تحقیق نے بتایا کہ زمین کے اندر کوئلے کی کانیں، تیل اور گیس کے ذخیرے موجود ہیں جن سے آج کل ہم چولہے روشن کرتے ہیں اور یہ سب کچھ ان جنگلوں کی بدولت ہے جو آج سے کروڑوں سال پہلے زمین میں دبے ہوئے تھے یہی پودے اپنی زندگی میں اپنے پتوں کے ذریعے سورج سے انرجی حاصل کرتے رہے زمین کے اندر دباؤ اور حرارت کی وجہ سے یہ انرجی مذکورہ بالا عوامل کی صورت میں نمودار ہو رہی ہے۔(۴۰)

کوئلہ کے ذخائر دراصل درختوں کی باقیات ہیں قرآن کریم میں غُثَآءً اَحْوٰی (سیاہ کوڑا کرکٹ) کی اصطلاح استعمال کر کے ان معدنیات یعنی کوئلے اور تیل وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو رنگ میں سیاہ ہیں۔ کوئلہ تو سیاہ ہے ہی مگر خام پٹرولیم جو براہ راست زمین سے نکلتا ہے وہ بھی تو سیاہ ہی ہوتا ہے۔(۴۱)

موجودہ سائنسی تحقیق نے بتایا ہے کہ زمین کے اندر کوئلہ، تیل اور دیگر معدنیات کافی عرصہ پہلے زمین پر موجود درختوں، ان کے کیمیاوی عمل اور جانداروں کی لاشوں کی وجہ سے ہیں۔ اس کو Fossil Fuel کا نام دیا گیا ہے۔(۴۲)

موجودہ دور میں خودکش حملے، بم دھماکے اور دہشت گردی کی دیگر کارروائیوں میں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔ جہاں آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں شرح اموات میں بھی تیزی آئی ہے۔ آج سے دو یا تین سو سال پہلے جنگوں میں ہونے والی اموات کی وجہ سے موجودہ دور میں Fossil Fuel مل رہا ہے اسی طرح آج کل کے دور میں ہونے والی تباہی اور ہلاکتوں سے بعد کے آنے والے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس طرح زیر زمین تیل اور معدنیات کے ذخائر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

نئی بیماریوں کی ابتدا، غربت اور جرائم میں اضافہ وغیرہ

ماہرین آبادی، غربت اور اس سے پیدا ہونے والے تمام مسائل مثلاً جرائم میں اضافہ اور نت نئی بیماریوں کے انکشاف وغیرہ میں بھی آبادی میں اضافہ کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جبکہ ان سب مسائل کی بنیاد محض بنیادی اسلامی تعلیمات سے دوری ہے نہ کہ بڑھتی ہوئی آبادی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ لوگ بڑے شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ اگر تمام سہولیات چھوٹے شہروں میں مہیا کی جائیں تو بھی مسائل حل ہو

سکتے ہیں۔کیونکہ:

''ان تمام مسائل کا حل شہروں کی آبادی کنٹرول کرنے میں ہے۔شنگھائی جب آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا تو اس وقت کے حکمرانوں نے اس شہر کی آبادی کا انخلاء کرایا، تب جا کر اس شہر کے مسائل حل ہو سکے۔امریکہ نے بڑے شہروں پر آبادی کا دباؤ کم کرنے کے لیے چھوٹے شہروں میں تمام سہولتیں دی ہیں۔ہمیں اسلامی اصول پر سختی سے عمل کرتے ہوئے ان شہروں کی مزید توسیع پر پابندی عائد کرنی چاہیے تا کہ ان میں کوئی نئی کالونی نہ بنے اور ان میں نئے صنعتی اداروں کے قیام پر بھی پابندی لگادی جائے تا کہ یہ شہر جو پہلے ہی گھمبیر مسائل سے دوچار ہیں، ان میں مزید اضافہ نہ ہو سکے۔''(۴۳)

یہ ایک حقیقت ہے کہ:

''چھوٹے شہروں کے معاشرتی پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ ان میں بسنے والوں میں آج بھی محبت، شفقت، ایثار وقربانی اور بھائی چارے کے جذبات موجود ہیں جبکہ بڑے شہروں میں اجنبیت غالب آچکی ہے۔''(۴۴)

خلاصہ بحث اور سفارشات

مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے بقول:

''۔۔۔رزق تو رب تعالیٰ کے ذمے ہے۔آج سے پچاس سال پہلے تین ارب تھے وہ بھی کھاتے تھے اور اس وقت چھ ارب ہیں تو اب ان کو بھی دے رہا ہے۔پچاس سال بعد بارہ ارب بھی ہو گئے اور عذابوں اور لڑائی جھگڑوں سے بچ گئے تو رب ان کو بھی دے گا۔عالم اسباب میں رب تعالیٰ نے اسباب پیدا کیے ہیں۔پہلے زمین تھوڑی کاشت ہوتی تھی پیداوار بھی کم ہوتی تھی اب زمین زیادہ کاشت ہوتی ہے اور پیداوار بھی زیادہ ہوتی ہے۔جیسے جیسے مخلوق بڑھتی جائے ویسے ویسے اللہ تعالیٰ اسباب بڑھاتا جائے گا۔۔۔''(۴۵)

موجودہ حالات میں دہشت گردی، بم دھماکوں اور حادثات میں ہونے والی ہلاکتوں کی وجہ سے اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اگر کسی کے دو بچے ہوں اور وہ دونوں ہی بڑھاپے کا سہارا بن پائیں گے؟ ان حالات میں اگر کوئی کمانے والا ہی نہ رہے؟ یہ الگ بات ہے کہ روزی تو اللہ تعالیٰ پھر بھی مہیا کریں گے۔

وہ رب جو پتھر میں موجود کیڑے کو بھی رزق فراہم کرتا ہے اس سے ناامید ہو جانا چاہیے کہ وہ، زیادہ لوگ ہوں گے تو رزق نہیں دے گا؟ کیا یہ ناامیدی کفر نہیں؟

مقالہ ہذا اس ساری بحث کے بعد یہ نتیجہ کیا جا سکتا ہے کہ جو اس دنیا میں آچکا ہے اس کا حق زیادہ ہے بہ نسبت اس کے جو ابھی آیا ہی نہیں۔اس لیے جو آچکا ہے اس کو اہمیت دی جانی چاہیے اور اسے

تمام ممکنہ سہولیات فراہم کی جانی چاہیں نہ کہ اس کا پیٹ کاٹ کر اور اس کا حق مار کر مزید کو آنے سے روکنے کی سعی لا حاصل کی جائے۔

وزارت بہبود آبادی پر خرچ کیے جانے والے اربوں روپے اگر تعلیم اور صحت کے شعبوں پر استعمال کیے جائیں تو تعلیمی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

''خاندانی منصوبہ بندی پر صرف ہونے والے مالی وسائل کو اگر ملک و قوم تعلیمی اور اقتصادی بہتری پر خرچ کیا جاتا، تو یقیناً اس اثرات موجودہ صورت حال سے مختلف ہوتے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے جواز کی پرزور حمایت اور وکالت کرنے والے حضرات جن مغربی اور مشرقی ملکوں کی مثالیں دیتے ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ وہاں اس طرح کے بے فائدہ محکمے قائم کر کے، ملکی وسائل کا بے دریغ ضیاع نہیں کیا گیا، بلکہ انہوں نے اپنی ساری توجہ تعلیم، صحت اور صنعتی و اقتصادی ترقی پر مبذول رکھی ہے، جب ان ملکوں میں تعلیم عام ہوئی اور لوگوں کے اقتصادی وسائل بہتر ہوئے تو انہوں نے بلا جبر و کراہ اور خارجی ترغیب و تحریص کے بغیر از خود بچوں کی پیدائش اور ان کی تعلیم و تربیت کو اہمیت دی، جس کے نتیجے میں ان ملکوں کو وہ فوائد حاصل ہوئے، جن کی ہمارے جیسے ملک میں محض مثالیں دی جاتی ہیں۔''(۴۶)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''لَوْ اَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَّ تَرُوْحُ بِطَانًا''(۴۷)

ترجمہ: (اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جو اس پر توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں یوں رزق دے گا جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے، وہ صبح خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔)

اگر اولاد کی پرورش میں رکاوٹیں اور مشکلات بھی آئیں تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ تکلیفیں اللہ کی طرف سے امتحان ہو سکتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ''(۴۸)

ترجمہ: (اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال و جان اور پھلوں کی کمی سے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے۔)

حوالہ جات

۱۔ سورۃ البقرۃ:۲، آیت:۲۶۱

۲۔ ابراہیم،آئی اے،محسن فارانی،اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات،دارالسلام،لاہور،۲۰۰۶،ص۸۹
۳۔ ایضاً
۴۔ سورۃ الانشقاق:۸۴،آیت:۱۹

5. http://www.indexmundi.com/agriculture/?country=pk&commodity=wheat&graph=production

۶۔ سورۃ الحجر:۱۵،آیت:۲۱
۷۔ سورۃ شوریٰ:۴۲،آیت:۲۷

8. http://www.parc.gov.pk/Stats/DataFrameset.htm

۹۔ سورۃ الانعام:۶،آیت:۱۵۱
۱۰۔ محمد سرفراز خان صفدر،مولانا،جمع وترتیب:محمد نواز بلوچ،مولانا،ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن،میر محمد لقمان برادران،گوجرانوالہ،۲۰۱۱،ج۶،ص۳۴۰
۱۱۔ ابن کثیر،عماد الدین ابوالفداء،ترجمہ:محمد جوناگڑھی،مولانا،تفسیر ابن کثیر،مکتبہ اسلامیہ،لاہور۔۲۰۰۹،ج۲،ص۳۱۴
۱۲۔ سورۃ بنی اسرائیل:۱۷،آیت:۳۱
۱۳۔ مودودی،ابوالاعلیٰ،مولانا،تفہیم القرآن،ادارہ ترجمان القرآن،لاہور،۲۰۰۷،ج۲،ص۶۱۳
۱۴۔ الازہری،محمد کرم شاہ،پیر،ضیاءالقرآن،ضیاءالقرآن پبلی کیشنز،لاہور،۱۴۰۲ھ،ج۲،ص۶۵۶
۱۵۔ المسند للامام الاحمد،رقم الحدیث:۱۱۵۲۱،عالم الکتب،بیروت،س ن
۱۶۔ سورۃ طٰہٰ:۲۰،آیت:۱۳۲
۱۷۔ احمد حسن،سید،مولانا،احسن التفاسیر،المکتبۃ السّلفیہ،لاہور،۱۹۷۹،ج۴،۵،ص۲۰۶
۱۸۔ سورۃ ھود:۱۱،آیت:۶
۱۹۔ صلاح الدین یوسف،حافظ،تفسیر احسن البیان،دارالسلام،لاہور،ص۲۸۹
۲۰۔ سورۃ العنکبوت:۲۹،آیت:۶۰
۲۱۔ صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب حکم عزل،رقم الحدیث:۳۶۲۰،دارالآفاق الجدیدہ،بیروت،س ن
۲۲۔ السنہ لابن ابی عاصم،باب فی العزل،رقم الحدیث:۳۶۵،المکتب الاسلامی،بیروت،س ن،ج۱
۲۳۔ ایضاً،رقم الحدیث:۳۶۴
۲۴۔ صحیح مسلم،کتاب النکاح،باب حکم عزل،رقم الحدیث:۳۶۱۷،دارالآفاق الجدیدہ،بیروت،س ن
۲۵۔ ایضاً،رقم الحدیث:۳۶۲۷
۲۶۔ سورۃ البقرۃ:۲،آیت:۲۵۹
۲۷۔ برق،غلام جیلانی،ڈاکٹر،دوقرآن،اسد پبلی کیشنز،لاہور،س ن،ص۱۳۲
۲۸۔ ذاکر نائیک،ڈاکٹر،ترجمہ:محمد شعیب چیمہ،اسلام ایک انسان ایک،الکریم پبلی کیشنز،راولپنڈی،س ن،

ص۱۲۲

۲۹۔ فضل کریم، ڈاکٹر، پروفیسر، کائنات اوراس کا انجام، فیروزسنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۷، ص۱۴۱

۳۰۔ سورۃ الروم:۳۰، آیت:۴۱

31. http://www.meezanbank.com/docs/Annual_Report_2012 .pdf

32. http://www.sbp.org.pk/

33. http://home.hiwaay.net/~krcool/Astro/moon/moontides

۳۴۔ مخدوم زادہ، ابو محمد، قرآن اور تخلیق کائنات، مشتاق بک کارنر، لاہور، س ن، ص۲۱۳

۳۵۔ سورۃ الانشقاق:۸۴، آیت:۱۸

۳۶۔ سجاد میرٹھی، زین العابدین، بیان اللسان، دالاشاعت کراچی، س ن، ص۳۶۹

۳۷۔ سورۃ البقرۃ:۲، آیت:۶۰

۳۸۔ سورۃ الاعلیٰ:۸۷، آیت:۴، ۵

۳۹۔ فضل کریم، ڈاکٹر، پروفیسر، قرآن اور جدید سائنس، فیروزسنز لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۸، ص۳۱۷

۴۰۔ حشمت جاہ، ڈاکٹر، قرآن اور جدید سائنس، سٹی بک پوئنٹ، کراچی، ۲۰۰۹، ص۶۳

۴۱۔ حوالہ سابق، ص۳۱۷، ۳۱۸

42. http://en.wikipedia.org/wiki/Fossil_fuel

۴۳۔ ملک حبیب اللہ بھٹہ، ملک مسائلستان کیوں بنا؟، روزنامہ نوائے وقت، اسلام آباد، ۷/جولائی ۲۰۱۳ء

۴۴۔ ایضاً

۴۵۔ محمد سرفراز خان صفدر، مولانا، جمع وترتیب: محمد نواز بلوچ، مولانا، ذخیرۃ الجنان فی فہم القرآن، میر محمد لقمان برادران، گوجرانوالہ، ۲۰۱۱، ج۹، ص۲۳۳، ۲۴۳

۴۶۔ محمود الحسن عارف، ڈاکٹر، مقالہ: آبادی اور ترقی (خاندانی منصوبہ بندی کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ)، بشمولہ ششماہی 'منہاج'، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، جلد:۲۲، شمارہ:۱۔۲، جنوری تا دسمبر ۲۰۰۶

۴۷۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب الرقاق، رقم الحدیث:۷۸۹۴، دارالکتب العلمیہ، بیروت، س ن

۴۸۔ سورۃ البقرۃ:۲، آیت:۱۵۵

قصص النساء فی القرآن الكريم دراسة وعبر

مريم صديقة[☆]/الدكتور افتخار احمد خان[☆☆]

Abstract:

"This article deals with the stories of women as discussed in the Holy Quran. The Holy Quran is the book of wisdom and guidence which relates number of stories such as stories of prophets. Similarly there are stories of women which embody great wisdom and advice for other. These stories help us to understand how a woman should execute her duties and responsibilities in everyday life and which precaution she should observe.

It is also mentioning that these women stories exemlify great literary style side by side these stories throw ample light on the status and importnce of women in Islam. There are 21 stories of women mentiond in the Holy Quran, here we discussed some of the stories like that of Hazrat Aysha(RA), Hazrat Maryam (RA), Queen Bilqees, Hazrat Zainab (RA), story of the Egyptien king's wife and some others."

Keywords: States of Women in Quran, Limitations of Women, Hazrat Aysha (RA), Queen Bilqees.

القرآن العظيم هو معجزة بيانية خالدة التى لا تفنى عجائبه ودستور الخالق لإصلاح الخلق، وقانون السماء لنظام الأرض. القصّة هى من أحسن طراز النثر، وعمل أدبى تصور حادثة من حوادث الحياة بأسلوب رقيق رشيق تنتهى إلى غاية معينة.

والعرب من الأمم التى أخذت بنصيب من هذا الفن الجميل لا شك أن

☆ الباحثة والمدرّسة ب دى بى ايس و سى بفيصل آباد

☆☆ الأستاذ المساعد بقسم الدراسات الاسلامية والعربية بجامعة الكلية الحكومية بفيصل آباد

العرب كانوا يعلمون الاخبار الأولين وقصص التاريخ وكان النضر بن الحارث يقصّ قصص الفارس وأساطيرهم.[1]

ولما جاء الإسلام وانتشره ضوء ه غير مجرى الحياة الأدبية والشعبية والقصة القرآنية هى عنصر حيوي وأشد تأثيراً وصلت إلينا سليماً.

قال الله سبحانه وتعالى:

" إنّا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون"[2]

إن القصّة القرآنية لا تضاهى قصة ما، كما نجد مساراً في المجال القصصى فالقصة للقصة أو لاستلذاذ الذهن أو لازجاء الوقت بل القصّة القرآنية تحمل غاية سعيدة أعلن القرآن الكريم:

"ما كان حديثاً يفترى ولكن تصديق الّذى بين يديه وتفصيل كل شيء وهدي ورحمة لقوم يؤمنون"[3]

أنزل الله سبحانه وتعالى كتابه تبياناً لكل شيء، وتحيط المعاملات والعبادات، والعقيدة، محور البناء القصصي في العمل الأدبي لكن ما نجد في القصّة القرآنية مثلها.

يقول الأديب محمد شديد:

" إن الاساس في القصة القرآنية هو الموضوع لا الشخصية ولا الأحداث "[4]

قد ذكر الله سبحانه وتعالى فى هذا الكتاب المبين قصص الانبياء والرسل والرجال الآخرين وهكذا ذكر الله سبحانه قصص النساء بالايجاز والاختصار يبلغ عددها حوالى إحدى وعشرين قصة من تلك القصص قصة أم المؤمنين عائشة رضى الله عنها فى سورة النور رقم الآية ١١ . ٢٠ و قصة ريطة الحمقاء فى سورة النحل رقم الآية ٩٢ .٩٣ و قصة أم الجميل الحاقدة فى سورة اللهب رقم الآية ١ .٤ وقصة أم موسى فى سورة القصص رقم الآية ١٣ وقصة امرأة نوح فى سورة التحريم رقم الآية ١٠ وقصة امرأة العزيز فى سورة يوسف رقم الآية ٢٣ .٣٢ و ٥٠ .٥١ وقصة امرأة لوط فى سورة التحريم رقم الآية ١٠ وقصة مريم البتول فى سورة آل عمران رقم الآية ٣٠ .٣٧ و فى سورة مريم رقم الآية ١٦ . ٣٤ وقصة بلقيس ملكة سبأ فى سورة النمل رقم الآية ٢٠ .٤٤ وقصة المرأة التى سمع الله قولها فى سورة المجادلة رقم الآية ١ .٤ وقصة زينب بنت جحش فى سورة الاحزاب رقم الآية ٣٦ .٣٧ وقصة

مارية القبطية فى سورة التحريم رقم الآية ١ وقصة زوجة موسى عليه السلام فى سورة قصص رقم الآية ٢٦، وقصة امرأة فرعون فى سورة التحريم رقم الآية ١١ وقصة ميمونة بنت الحارث فى سورة الاحزاب رقم الآية ٥٠ وقصة مسيكة تائبة سورة النور رقم الآية ٣٣ وقصة حواء أم البشر فى سورة البقرة رقم الآية ٣٥. وقصة سارة زوجة إبراهيم عليه السلام فى سورة هود رقم الآية ٧٢ وقصة أم كلثوم بنت عقبة فى سورة الممتحنة رقم الآية ١٠ وقصة كبيشة بنت معن فى سورة النساء رقم الآية ١٩ وقصة أم كجة فى سورة النساء رقم الآية ١١.

وفى هذا المقال الموجز نذكر وندرس ونعرف ببعض القصص التى تتعلق بالنساء لكى نعلم ما هو الغرض الأصيل والهدف المنشود والحكمة البالغة فيها ونستنبط منها النتائج والعبر.وفيما يلى نلقى ضوءاً على النتائج الهامة المستنبطة منها.نبدأ بذكر قصة مريم البتول .

قصة مريم البتول

عند ما حملت أم مريم فنذرت ما فى بطنها محرراً لخدمة الهيكل وكان فى ذلك الزمان ينذرون الناس لبيت المقدس خداماً من أولادهم فلما وضعت حملها، فإذا هى أنثى فسّمت وليدتها (مريم) أى (العابدة) وأعاذها الله من الشيطان الرجيم ثم لفتها فى الرداء، وحملتها إلى بيت المقدس تقدمتها للأحبار لخدمة الهيكل ورجعت إلى بيتها وكانت راضية برضاء ربّها.

أنتخب الله زكريا عليه السلام لكفالتها وكان زكريا عليه السلام يعرف إتقان الايمان لهذه الفتاة ويدرك مقدار طهارتها، وصدق لهجتها. ترعرعت مريم عليها السلام فى ظلال بيت المقدس على الطهارة والبعد عن الدنس ودامت على ذلك.

فبإذن الله تعالى نفخ جبريل عليه السلام درعها، فحملت مريم عليها السلام بعيسى عليه السلام فهى معجزة من معجزات قدرة الله سبحانه وتعالى.(٥) ويلى نذكر النتائج المستنبطة.

- ☆ ان الله سبحانه وتعالى قادر على كل شيء ويعمل ما يشاء
- ☆ تبين خوارق الله سبحانه وتعالى " كمولد عيسى عليه السلام بدون الرجل و مولد آدم عليه

السلام بدون المرأة وولادة حواء عليها السلام بدون المرأة هذا الأمر

سهل عليه ويسر.

قصة كبيشة بنت معن

كان أهل المدينة فى الجاهلية إذا مات الرجل وله امرأة جاء ابنه من غيرها أو قرابته من عصبته فألقى ثوبه على تلك المرأة، فصار أحق بها من نفسها ومن غيره.

فلما توفى أبو قيس بن الاسلتب الأنصارى، وترک امرأة كبشة بنت معن فطرح ابن له من غيرها يقال لها: حصن ثوبه عليها، فورث نكاحها ثم تركها، فلم يقربها والم يتفق عليها، يضارها لتفتدي منه بمالها. فاستكت إلى رسول الله ﷺ فقال ﷺ لها: اقعدي في بيتک حتى يأتى فيک أمر الله فأنزل الله الآية ۱۹ فى سورة النساء.[٦]ويلى نذكر النتائج المستنبطة.

☆ كانت المرأة قبل الاسلام مسلوبة الحق، فقرر لها الإسلام حقوقاً في شئوون الزواج، ونهى عن الاعتداء عليها.

☆ ليست المرأة متاع الوراثة، فلا يورثها بعد وفاة الزوج، نهي عن تقليد اهل الجاهلية، هم يرثون المرأة كما يرثون الاموال والامتعة.

قصة امرأة العزيز

عند ما ألقى يوسف عليه السلام فى غيٰبت الجب ووصلت هنا القافلة فأرسلو واردهم فأدلى دلوه فوجد يوسف عليه السلام معه وفرحوا. قيل كان عزيز مصر وزوجته لم يرزقا أولاداً وهما اتخذه ولداً ويوسف جعل يسكن فى جو القصر ومرّت السنوات.

وامرأة العزيز أحست أنها رغبت إلى يوسف عليه السلام وذات يوم دخلت فى غرفته وقالت ليوسف هيت لک قال معاذ الله واستبقا الباب وقدّت قميصه من دبر لما رأت سيدها لدي الباب تقدمت الى زوجها باكية. ادخل يوسف فى السجن على غير جريمة أتاها، انتهز يوسف هذه الفرصة ليعلن لهم دينه ويدعوهم إليه. بعد مدة طويلة عند ما خرج يوسف عليه السلام من السجن أعلنت امرأة العزيز أنا رٰودتّه عن نفسه وإنه لمن الصادقين.[۷]ويلى نذكر النتائج المستنبطة.

☆ استحباب الست على المسيء وكراهية إشاعة الذنوب بين النّاس.

☆ فضيلة الصدق وقول الحق ولو كان علي النفس.

☆ شرف أمرأة العزيز بإقرارها بذنبها رفعها مقاما ساميا.

قصہ الافک

نزلت الآيات في سورة النور في شأن المرأة التي عاشت في البيت الّذی يتنوّر بنور الإسلام أولاً ولم تسمع أذنها صوت الكفر والشرک أبداً.هی عائشة بنت أبی بكر رضی الله عنها العتيقة بنت العتيق، حبيبة الحبيب ﷺ المبرّأة من العيوب.

ولمّا أراد ﷺ الخروج إلى بنی المصطلق فأقرع بين أزواجه فخرج سهم عائشة رضی الله عنها فخرجت معه.عند ما فرغ رسول الله ﷺ من غزوته تلک وقفل ودنا من المدينة آذن بالرحيل آخر الليل فلما علمت عائشة رضی الله عنها بذلک خرجت من هودجها وابتعدت عن الجيش لقضاء شأنها وأقبلت إلى هودجها لم تجد العقد فی رقبتها فعادت إلى المكان الذی جاء ت به تبحث عنه حتى وجدته، وجاء القوم إلى الهودج وهم يظنون أنها بداخله فحملوه ووضعوه على البعير.عادت عائشة مسرعة فلم تجد القوم فجلست فی مكانها فغلبت عليها النوم، فمرّ بها صفوان بن معطل السلمی فرأى إنسان نائم فعرفها حين رأها، فاسترجع، واستيقظت عائشة رضی الله عنها بصوت استرجاعه ثم نزل عن ناقته وقرّب إليها الناقة فركبت وسار خلف الناقة بدون الكلام معها. رأى الناس تعود، ففرحوا ولكن كانت هنا قلوب تحمل الضغينة والحقد للإسلام ونبی الإسلام والمسلمين فنسجوا أقوال الباطل وافتروا الأفک والكذب على أم المؤمنين عائشة رضی الله عنها. فبرّأها الله بقوله المذكور فی سورة النور. هكذا السيدة عائشة رضی الله عنها من المحنة بشهادة ربّانية لبراء تها وطيبها ...شهادة لا تمحوها الأيام ولا تبليها الأعوام.(۸)ويلی نذكر النتائج المستنبطة.

☆ قد يكون الابتلاء للمؤمنات المحصنات وذلک لرفع درجاتهن ونحوها.

☆ الإبتلاء قد يكون له خاتمة تجبر ما تتألم المبتلاء.

☆ عفة نساء النبی ﷺ حيث اختارهن الله تعالى لحبيبه وصفيه محمد ﷺ كما قال الله تعالى:﴿ الطيبات للطيبين....﴾ النور: ۲٦

☆ قصة الإفک كانت لحماية عرض النساء جميعا إلى يوم القيامة.

☆ هذه المحنة في أفضل امرأة درساً وعبر لكل امرأة بأنه ليس فی الدنيا امرأة فوق التهم.

قصة مسيكة تائبة

يتعلق هذه القصة ب عبدالله بن أبى بن سلول، رأس المنافقين وكانت له جارية تدّعى معاذة وكان إذا نزل به ضعيف أرسلها إليه ليواقعها، إرادة الثواب منه، والكرامة له، فأقبلت الجارية إلى ابوبكر الصديق رضى الله عنه فشكت إليه ذلک، فذكره أبوبكر رضى الله عنه للنبى ﷺ فأمره ﷺ بقبضها، فصاح عبدالله بن أبي: من يعذرنا من محمد ﷺ ؟ يغلبنا علي مملوكتنا ! فأنزل الله فيهم هذا.(٩)ويلى نذكر النتائج المستنبطة.

☆ نهي عن إكره الفتيات على البغاء إن إردن العفة.

☆ تطهير البيئة الاسلامية وأغلاق السبل القذرة للتصريف الجنسى.

قصة ملكة السبا

كان أبو بلقيس ملک أرض اليمن كلها ولم يكن له ولد لذا صارت بلقيس الملكة لأرض اليمن وبالعكس فى مكان يبعد آلاف أميال عن اليمن وأهل سبأ بعث الله تعالى سليمٰن عليه السلام نبياً وهو النبى الّذى سخر له الجن والانس والطير كان يعرف ما يتخاطب به الطيور.وهو القائد الحكيم ذات يوم جاء الهدهد بخبر عجيب لسيمان عليه السلام، فيخبره بأن فى اليمن مملكة تقوم عليها امرأة أوتيت من كل شيءٍ ملكاً وحضارة، قوة ومتاعاً ولها عرش عظيم فيه أنوا ع الزينة والجواهر. دهش سليمان عليه السلام لهذا الامر العجيب فكتب اليها رسالة بأن تؤمن بالله ورسوله.عند ما وجد بلقيس هذه الرسالة دهشت ففتحت على عجل ولم تجب عاجلة فجمعت رجال دولتها وأهل مشورتها وكل ذي شأن ونفوذ تستشيرهم في أمر هذه الرسالة فنظروا فى الامر. أمرت بلقيس باتخاذ الهدايا، وبعثت بها الرجال من كرام القوم ومضت بالهدايا قافلة كبيرة، ووصلت إلى سليمان فأنكر سليمان عليه السلام لرئيس القافلة قائلاً: بأن ليست الدنيا من حاجتى وأعطاني الله مالم يعط أحداً من العالمين، وأكرمني بالنبوة والحكمة، ارجع إلى صاحبتک بما جئته من الهدايا.وعادت القافلة بلقيس إليها من عند سليمان وأخبروها بالأمر فقالت والله ما هذا بملک، وما لنا به من طاقة. فرحلت مع عدد كبير من قومها إلى سليمان عليه السلام حين وصلت بلقيس وقومها إلى سليمان، واستقبلهم أحسن استقبال عند ما نظرت بلقيسن روعة لمملكة السليمان أحست بأن الله سبحانه وتعالى الأول بلا ابتداء والآخر بلا انتهاء له ملک السموات والأرض. دخل نور الإيمان قلب بلقيس

وأعتنقت الإسلام.(۱۰) ويلى نذكر النتائج المستنبطة.

☆ بين حسن سياسة الملكة بلقيس وفطنتها وذكائها.

☆ عباد الرحمن لا يفرحون بمال الدنيا.

قصة أم كجة

كانت المرأة فى الجاهلية مسلوبة الحق فانهم لم يكونوا يورثون النساء والأطفال قيل هى كانت أم كجة الأنصارية قد مات زوجها أوس بن ثابت الأنصارى وترک ميراثاً يستطيع أن يفي بحاجة زوجته وبنتيه.و لكن أخا له استولي على مالهم وحرم منه بنتى أخيه وزوجته فشكت إلى النبى ﷺ،فقال رسول الله ﷺ ارجعى وانظرى ما يحدثه الله تعالى.فقضى الله سبحانه وتعالى فأنزل آية المواريث وجعله أساساً للمواريث بين المسلمين إلي أن تقوم الساعة.وكانت أم كجة وبناتها أوّل من استفاد نظامه العادل الّذي جعله الله سبحانه وتعالى أساساً لتوزيع التركة في الاسلام.(۱۱) ويلى نذكر بعض النتائج المستنبطة.

☆اعطاء المرأة حق الميراث سواء كانت زوجة أو امّ أو بنت أو اخت صغيرة أو كبيرة.

☆ هذه أول وراثة التى قسمت فى الإسلام للنّساء.

☆ اثبات قدر النّساء في المجتمع وبطلان الفكر الجاهلى فى حقهن.

☆ جواز طلب الحق للنّساء عن طريق الحكومة والعدالة.

قصة زينب رضـ بنت جحش

كانت هى ابنة عمة النّبى ﷺ وزوجة لابن المتبنى للنبى ﷺ تزوجت بزيد بن حارثة بحكم النبى ﷺ لكن فى طبيعتها التفاخر على زيد لشرفها شكا زيد رضى الله عنه إلى النبى ﷺ قائلاً: هى تعظم علي بشرفها وتؤذينى بلسانها وتعصينى لأمري وأريد أن أفارق صاحبتي.

فقضي الله ذلک أن يتزوج رسول الله ﷺ بزينب رضى الله عنها بعد طلاقها من زيد رضى الله عنه لقطع تحريم أزواج الأدعياء. لمّا انقضت عدة زينب رضـ تزوج بها سيدنا محمد ﷺ.(۱۲) ويلى نذكر النتائج المستنبطة.

☆ طاعة الله ورسوله ﷺ شرط الايمان، ومعصية الله ورسوله ﷺ من الفسق والكفران.

☆ ابطال نظام الفوارق فی الحسب والنسب
☆ الحکمة في أن سبب الزواجه ﷺ اياها ليس هو محبته ﷺ لها التی كانت سبباً فی طلاق زيد لها، كما زعموا.
☆ إن هذا الزواج كان أمراً إلهياً، ولم يكن هوی بشرياً.
☆ قطع تحريم أزواج الادعياء.
☆ توضح العلاقة بين رسول الله ﷺ والمؤمنين كافة.

كانت العرب فی الجاهلية يعطون الدعی جميع الحقوق الابن ويجرونها عليه وهی عقيدة فی الجاهلية قبل الاسلام والنّبی ﷺ أوّل من هدم الاعمال الفاسدة وأبطل آثار التبنی.

وأخيراً نذكر الاهداف والاغراض والعبر لجميع القصص.

☆ ان الله سبحانه وتعالی قادر علی كل شيء ويعمل ما يشاء
☆ كراهية إشاعة الذنوب بين النّاس
☆ كانت المرأة قبل الاسلام مسلوبة الحق، فقرر لها الإسلام حقوقاً لها
☆ تطهير البيئة الاسلامية وأغلاق السبل القذرة للتصريف الجنسی.
☆ نهي عن إكره الفتيات علی البغاء إن إردن العفة.
☆ قل الحق ولو علی نفسک
☆ عباد الرحمن لا يفرحون بمال الدنيا.
☆ اثبات قدر النّساء في المجتمع وبطلان الفكر الجاهلی فی حقهن.
☆ جواز طلب الحق للنّساء عن طريق الحكومة والعدالة.
☆ طاعة الله ورسوله ﷺ شرط الايمان، ومعصية الله ورسوله ﷺ من الفسق والكفران.
☆ قطع تحريم أزواج الادعياء.

الهوامش والمصادر

١. دراسات فی الأدب العربی الحديث ومدارسه، د/محمد عبدالمنعم الخفاجی، مكتبة القاهرة ٢/٤٣٧
٢. سورة الحجر، آية ٩
٣. سورة يوسف، آية ١١١

۴. منهج القصّة فی القرآن لمحمد شدید، دار عكاظ، جده: الطبعة الأولی ۱۹۸۴م، ص ۶۴

۵. انظر للمزید، تفسیر القرطبی، أبو عبدالله محمد بن أحمد القرطبی، داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۹۶۶م،۱۱/۹۰.۱۰۳، فی ظلال القرآن، سید قطب شهید، ۴/۲۳۰۵.۲۳۰۹، نهایة الأرب فی فنون الأدب، شهاب الدین أحمد بن عبدالوهاب النویری، دارالكتب العلمیة، بیروت . لبنان، الطبعة الأولی ۲۰۰۴م، ۱۴/۱۵۶.۱۷۰وغیرها

۶. انظر للمزید، التفسیر المنیر فی العقیدة والمنهج ۴/۳۰۰.۳۰۲، وتفسیر النسفی، امام عبدالله بن أحمد بن محمود النسفي، دارالكتب العربی بیروت . لبنان، ۱۹۸۲م، ۱/۲۱۷، وروح المعانی، ۳/۲۴۱. ۲۴۳ وغیرها

۷. انظر للمزید، قصص الأنبیاء،عبدالوهاب النجار، مطبعة مصر، ۱۹۵۶م، ص ۱۲۵.۱۲۹، وقصص القرآن،محمد جاد المولی وأصحابه، مكتبة دارالتراث بالقاهره، ط۲، ۱۹۸۴م، ص ۹۰.۱۱۰، وتفسیر الكبیر ۱۷/۱۱۳.۱۲۹ وغیرها

۸. انظر للمزید، تراجم سیدات بیت النبوة، ص ۲۸۳.۲۸۹، وتاریخ الأمم والملوک ۲/۲۶۴.۲۷۰والسیرة النبویة ۳/۳۰۴.۳۱۰، الصحیح للبخاری كتاب المغازی باب ما جاء فی قول الله تعالی ﴿ الّذین جآ ء وا بالإفک...﴾ وغیرها.

۹. في ظلال القرآن، سید قطب شهید،۴/۲۵۱۶ . ۲۵۱۷ و تفسیر البحر المحیط، محمد بن یوسف الشهیر بأبی الحیان، دارالكتب العلمیّة، بیروت، لبنان: الطبعة الأولی، ۲۰۰۱، ۶/ ۴۱۶. ۴۱۷

۱۰. انظر للمزید، الكشاف عن حقائق التنزیل وعیون الأقاویل فی وجوه التأویل، جار الله الزمخشری، ط.۱۹۴۸م ۲/ ۴۴۹.۴۰۲، فتح القدیر، محمد بن علی الشوكانی، دارالعلمی، بیروت، ۴/۱۳۵، البدایة والنهایة، الحافظ عماد الدین أبو الفداء اسماعیل بن كثیر، مكتبة المعارف بیروت . لبنان، ط۱، ۱۹۷۶م ۲/۱۸. ۲۶ وغیرها

۱۱. انظر للمزید، موسوعة حیاة الصحابیات، ص ۱۸۰.۱۸۲، تفسیر القرطبی ۵/ ۵۶.۵۶، تفسیر القرآن العظیم، ابن كثیر، دارعالم الكتب الریاض، الطبعة الثانیة ۱۹۹۷م، ۱/۵۵۶.۵۶۳ وغیرها.

۱۲. انظر للمزید، أزواج النبی ﷺ، د/موسی شاهین لاشین، مكتبة المعارف الریاض، ط۱، ۱۹۸۷م، ص ۱۰۹.۱۲۹، أضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن ۶/ ۵۸۰.۵۸۳، تفسیر القرآن العظیم ۳/۲۰۲.۲۰۷ وغیرها

فن التفسير عند القاضي ثناء الله بانی بتی

دکتورةعمرانه شهزادی ☆

Abstract:

"The scholors of subcontinent have contributed significally towards the science of Tafseer, Hadith, Jurisprudance and Arabic literature, during the period of British Impire after the war of Independance in 1857, they devoted their lives for preaching the idology of Islam . They complied a huge number of books for the betterment in social and moral life of Muslims. they presented unique commentry of Holy Quran. In this period Qazi Sanaullah Panni Pati, who was one of eminent scholoer, he served as a Qazi in a well known court of Panni pat India, He was a prolifie writer and he penned more 50 books. Tafseer Mazhari is his great work, he completed it before his demise. The said article shed light on the introduction of Qazi Sanaullah Panni pati and the characteristics of his methodology. Qazi Sanaullah not only followed the foot steps of eminant Mufassireen but strickly followed the principles of tafseer. His tafseer is a amemorable work in commentries of Subcontinent."

Key words: Tafseer, Qazi, Quran, Sanaullah.

لاريب فيه إنّ الاعاجم قد خدموا اللغة العربيّة وعلومها اكثر ممّا خدمها العرب ، انهم لم يكونوا عربا إصالة فقد تعلموا اللغة العربية وحصلوا على مهارة تامّة ثم استطاعوا ان يخدموا خدمات جليلة ويتسجلّوا على صفحات التاريخ علوماً شريفة ومؤلفات رائعة جميلة .

☆ الاستاذة المساعدة بالقلم العربی، بجامعة الكلية الحكومية للبنات، فيصل آباد

لم يتأخر ابناء الإسلام في شبه القارة الهندية عن المشاركة في هذا الموكب العلمى فقد ساهموا مساهمة نشيطة فعّالة فألّفوا ودوّنوا فملاء والمكتبة العلميّة الإسلامية بثروة الثقافة العلميّة مازالت هذه السلسلة الذهبيّة تمتدّ وتتوسّع إلى ان وصل طرفها إلى يد المفسّر العظيم القاضي رحمه الله تعالى وكان الشيخ القاضى من هولاء العلماء الجهابذة يجودبهم الزمان الّا نادراً. كان اسمه الكامل القاضي محمد ثناء الله بانى بتى العثمانى الحنفي المجددي المظهرى. إنّه كان من المحدثين والمفسرين البارزين الّذين نشوا في حضن شبه القارة الخصبة(۱) إنّه كان من ذرّية جلال الدين العثمانى ينتهى نسبه من جهة ابيه باثنتى عشرة واسطة إلى عثمان بن عفان رضي الله عنه ومن جهة أمّه باربعين واسطة إلى ابى ايوّب الانصاري رضي الله عنه . ولد في بانى بت في بنجاب الشرقي سنة ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰م في الاسرة الثقافية ، بسبب مولده بانى بت يقال " بانى بتى " ونسبته مظهرى يرجع إلى استاذه مرزا مظهر جانجانان(۲)

بعد وفاة ابيه ربتّه امّه تربية حسنة ، كان والده عالماً جيّداً في عصره وكان قاضياً فى بلدة بانى بت فى عهد محمد شاهى. (۳)

تلقى القاضى رحمه الله تعالى على عدد كبير من الشيوخ الافاضل في زمنه مثل الشيخ غلام على الدهلوي الشيخ ولى الله بن عبدالرحيم الدهلوى، محمد عابد السنامى الشيخ جانجانان العلوى المظهرى.(۴)

كان القاضي رحمه الله تعالى زبدة العلماء ومقرب الله تعالى وكان له يد طولى في العلوم العقليّة والنقليّة وكان مجتهدا في الفقه والاصول يحتل مكانة عالية مفسرا وصوفيا وكان شيخه يفتخر عليه بقوله: "إذ سألني الله عن هدية أقدمها إلا جانبه قدّمت ثناء الله "(۵)

ويقول الشيخ غلام على الدهلوى فى سيرته:

" أنّه كان مع صفاء الذهن ، وجود القريحة ، قوة الفكر سلامة الذهن، بلغ إلى رتبة الاجتهاد في الفقه والاجتهاد والاصول وكان شديد التعبد يصلى كل يوم مائة ركعة، عالم ثقة، اسوة كاملة في العلم والعمل، امتزاج الحسن في الجلال والجمال مزيّن باخلاق الكريمة كان يتبع رسول اللهﷺ فى كل امر شؤون الحياة العامة"(۶)

توجد الكمالات الجملة فيشخصيةالقاضي ثناء الله بانى بتى مثل، الامانة

والديانة والصلاح والتقوي، الطبيعة السليمة يشغل ابداً في قضاء حاجات مخلوق الله تعالى، وأنّه كان مضيفاً مكرمّاً .

أنّه كان يتولى منصب القضاء في بانی بت وله اهمية خاصة في حياته وكان عدالته في قصر بانی بت في قرب مسجد كابل شاه[٧] له عدّة مؤلفات منها: التفسير المظهری، حليه شريفة، الفتاوى المظهرية، السيف المسلول، ارشاد الطالبين، تفسير پنج آية بطريقة صوفية، تقديس والدى مصطفى، تذكرة الموتى والقبور، تذكرة المعاد، تذكرة العلم والمعارف ، وصيت نامه .

مات فی غرّه رجب سنة خمس وعشرين ومائتين والف من الهجرة بمطابق ١٢ اغسطس ١٨١٠ في بانی بت .

قبل ان ننظر إلى منهجه في التفسير ينبغي لنا ان ندرس مختلف المظاهر لتلک البيئة الّتي ضمّته في تفسيره يحيط عصر القاضي ثمانين سنة تقريباً وكان هذا العصر الضوضي والنزاع الشديد في تاريخ الهند، بعد وفاة شاه رنكيلا بدأت الحكومة الانكليزية على الهند كلها سوى بنجاب وبعض الجزائر عاش فی اضطراب سياسى وكان مرهته ابر ز العناصر و اخطرها فی عصر القاضی و احتلت جيوش المرهته على بانی بت و تشن الغارات في هذه المنطقة[٨] وكتب مرزا مظهر جانجانان في احد رسائله إلى قاضي ثناء الله بانی بتی .

''إنّي أخاف على غارة المرهته وراء كنكا واريدان اذهب إلى بانی بت''[٩]

وكان سيخ بنجاب عنصراً مهتماً في سياسة في عصر القاضي بعد وقت قليل تغيرت تحريكهم المذهبي إلى تحريک سياسي يتوجّه احمد شاه ابدالى لتأديب السيخ ، وكانت قيام الحكومة الانكليزية امراً مهما في عصره وزادت قوتهم رويداً وهكذا بدأت عبوديّة الهند والانحطاط السياسى تسبب الرذائل الاجتماعية فلذا اعتنى القاضى رحمه الله تعالى باصلاح المجتمع، بسبب الفساد العلمى والاخلاقي انتشرت في المجتمع ضعف العقيدة، التوهم، عبارة القبور، عقد الإعراس واستولى على اذهان الناس ضعف الاعتقاد موضع اليقين والرسوخ في الإيمان. في هذه الحالة جمع المجدد الف ثانى والشاه ولى المحدث الدهلوى والقاضي ثناء الله بانی بتی استعدادهم الذهنى والعلمى للقضاء على الفواحش الاجتماعية. كان عصر القاضي مظلماً بنسبة الحضارة السياسية ولكن منوراً بنسبة العلم والحركة. ولد المجددون والرواد في هذا العصر[١٠]

مثل شاه ولی الله، عبدالجلیل بللکرامی، مرتضي الزبیدی، نظام الدین السهالوی فلذلک اصرّ القاضي علی الجهاد في تفسیره لأنّه کان معالجة وحیدة في مغلوبیّة وانحطاط المسلمین.(۱۱)

سبب تألیف التفسیر المظهری:

في عصر القاضی کان تفسیر ملّا جیون وتفسیر المهائمی یتداولان في شبه القارة، کتب تفسیر المهائمی في اسلوب تفسیر الجلالین لا یوجد فیه المباحث العلمیة إلاّ قلیلاً وکانت فقدت تفسیر منبع نقائس العیون من العالم العلمی والتفسیرات الاحمدیّة یشمل علی خمسمائة الآیات الفقهیة واکثر التفاسیر الفت في عصره کانت للشوافع وکان التفسیر البیضاوی داخلاً في مقرر المدارس ولکن بلغ ایجازه إلی حد الرمز والکتابة ولم تتضح وجهة نظر الاحناف لکون مصنفه شافعیا وکان اکثر سکان الهند کانوا من الاحناف وهذا الامر یشوش الطلبة خلال المطالعة فلذا احس القاضی رحمه الله تعالی حاجة ماسة للتفسیر الّذي یوجد فیه شرح الالفاظ ومعانیها وتبین فیه الاحکام العقائد فصنّف القاضي رحمه الله تعالی تفسیره في عشرة مجلّدات یأتی هذا التفسیر بعد تفسیر ملا جیون ولکن یفضل علی جمیع التفاسیر بسبب منهجه واسلوبه ومیزاته ویحتل مکانة مرموقة في اللغة العربیة لکونه محتویا اکثر من اربعة الآف صفحة وعشر مجلّدات ، مکانته المفسّر في العلم والحدیث والفقه والتصوف وخبرته في الأدب العربي اعطت التفسیر درجة ممتازة.(۱۲)

یعرف هذا التفسیر ب "التفسیر المظهری" ویسمیه المفسّر باسم استاذه المحترم الفاضل مرزا مظهر جانجانان وبدء المفسر تألیفه بعد شهادة مرزا مظهر جانجانان ۱۰ محرم الحرام ۱۱۹۵ هـ ینایر ۱۷۸۲ وقد فرغ منه تألیفه فی ۲۷ جمادی الأوّل ۱۲۰۸هـ /۳۱ دسمبر ۱۷۹۳م بدأ هذا العمل الجلیل من سورة الفتح اوّلاً دون سورة الفاتحة وختم تفسیره علی سورة محمد دون سوره الناس ویقول بنفسه عن هذا الطریق:

"وقد اتفق ختم تفسیر المظهری بختم سورة محمد ختم الرسل محمدﷺ والمسؤل من الله عزوجل ان یجعل ختمی علی خیر ما ختم به خیار امّة محمد ﷺ "(۱۳)

وکتب المؤلف فی انتهاء کل مجلد تاریخ تکمیله ولا یوجد تاریخ الانتهاء

في المجلد التاسع والعاشر .

مرّ هذا التفسير من مراحل الطباعة العديدة .اوّلاً سعى المحترم ركن الدين بن محمد معز الدين القادري الحصاري لطباعته شاعت المجلد الأوّل (من سورة الفاتحة إلى البقرة) في سنة ۱۲۷۳/۱۸۵۵ ، والمجلد الثاني (من سورة آل عمران إلى سورة النساء) في سنة ۱۲۷۴/۱۸۵۶ ، ثم شاع منشى حافظ عبدالرحمن جزأ يشتمل حزً بانصفاً ، ثم طبع المجلد الثالث (من المائدة إلى التوبة) السيد محمد ياسين ميرٹھی بتعاون مولوی عاشق من مدينة ميرٹھ ثم شاع ابنه الصالح جميل الدين، المجلد الرابع (من يونس إلى الانبياء) من مطبع حمايت الإسلام في سنة ۱۳۱۳ھ /۱۹۴۲م، ثمّ طباعته مكتبة دار المصنفين دهلی بتعاون الشيخ محمد اسماعيل جيون بخش في باكستان طبع هذا التفسير في إقليم بلوتشتان، تحمل نفقاته الشيخ فياض محمد كواشی وعبدالرحمن خانزئی وترجم إلى اللغة الاردية عبدالدائم الجلال، وطبع من دهلی وكراتشی ويكتب عليه الحواشی العديدة.

طريقته في التفسير:

لم يذكر المفسر طريقه كما هو معروف عند المفسرين ولكن خلال دراستی عند ما رجعت إلى هذا التفسير وقرأت فيه ما شأ الله ان اقرء، تتجلى علّى طريقه، بكل وضوح الّذي اتخذّ لتفسيره وبيان معانيه فی الصفحات الآتية اوضح اسلوبه ومنهجه التفسيري واضحةً بين يديكم الّذي وجدت منهجه تفسير القرآن بالقرآن منهج فريد متميز عن باقي كتب التفاسير، سلک فيه الّذي ينبئ عن مدى تفكيره. أنّه يذكر الآية ثمّ يفسرها بعبارة سهلة عذوبة مؤجزة وإن أمكن توضيح الآية بآية الاخرى ذكرها .وقارن بين الآيتين حتى يتبيّن المعنى ويظهر المراد . وهو شديد العناية بهذا النوع من التفسير الّذي يسمونه المفسرون تفسير القرآن بالقرآن. ففي الفاتحة مثلاً فسّر من قوله تعالى ﴿غير المغضوب عليهم والضآلين﴾ بقوله: ﴿غضب الله عليه﴾ وقوله تعالى ﴿فماذا بعد الحق الّا الضلال ﴾ وقال: ﴿ الّذين ضلّ سعيهم فی الحيوة الدنيا ﴾ (۱۴)

وهناک الامثلة الكثيرة في تفسيره تفسير القرآن بالقرآن ولا يمكن في هذا المقالة الموجزة ان اذكر كل الامثلة .

اصح طرق التفسير بعد تفسير القرآن بالقرآن هو تفسيره بالحديث. والمؤلف هنا ياخذ بهذا النوع من التفسير ويورده كثيراً في تفسيره فمن ذلک

تفسيره لقوله تعالى: ﴿ غير المغضوب عليهم والضآلين ﴾ قال: عن عدى بن حاتم قال: قال رسول الله ﷺ إنّ المغضوب عليهم ، اليهود وان الضالين النصارى.[۱۵]
فمن ذلک تفسيره لقوله تعالى:

﴿ ... فى السموات والارض كلّ له قانتون﴾

قال: اصل القنوات القيام ، وقال عليه الصلوة والسّلام افضل الصلاة طول القنوات، عن ابى سعيد الخدرى عن النبي ﷺ كل حرف من القرآن يذكر فيه القنوت فهو الطاعة[۱۶]

وفي تفسير للآية ۳۹ من سورة آل عمران ﴿ قل اطيعوا الله والرّسول ...﴾ يعنى ان اطاعة الله والرسول واحد ... قال رسول الله ﷺ كل امتى يدخلون الجنة الّا من ابى قالوا ... ومن يأبي يا رسول الله ؟ قال من اطاعنى دخل الجنة ومن عصانى فقد ابى ... وقال رسول الله ﷺ من اطاع محمد فقد اطاع الله ...[۱۷]

وقد ذكر المؤلف رحمه الله تعالى كثيراً اقوال العلماء والأئمة وفرمودات المجدد الف ثانى رحمه الله تعالى ، ففى تفسيره قوله تعالى ﴿ فأما الّذين في قلوبهم زيغ ﴾ قال القاضي رحمه الله تعالى : عن ابن عباس في قوله تعالى ﴿ فأما الّذين في قلوبهم زيغ ﴾ أن رهطاً من اليهود ، وهم حي بن اخطب وكعب بن اشرف ... وقال الكلبى هم اليهود... وقال ابن جريح هم المنافقون، وقال الحسن: وهم الخوارج.[۱۸]

وفي تفسيره قوله تعالى: ﴿ كدأب آل فرعون ﴾ قال أبو عبيدة معناه كسنة آل فرعون وقال الاخفش كأمر آل فرعون ، ففي تفسيره قوله تعالى ﴿ من النساء والبنين والقناطير ﴾ قال القاضي رحمه الله تعالى قال: ابن عباس المراد بالقناطير الف ومائتا مثقال أو اثنا عشر الف درهم أو الف دينار، وقال سعيد بن جبير وعكرمه هو الف ومأته من ومأته رطلٍ ومأئة مثقال ومائة درهم. وعن السدى: اربعة آلاف مثقال وقال الحكم: "القنطار" ما بين السماء والأرض، وعن انس رضي الله عن النبي ﷺ القنطار الف اوقيّة .[۱۹]

ويذكر القاضي رحمه الله تعالى اقوال المجدد الف ثانى فى تفسير قوله تعالى من الآية ۱۹۲ من سورة آل عمران: ﴿ ويتفكّرون في خلق السموات والارض...﴾ قال المجدد رضي الله عنه العلم الحضورى ايضاً ساقط من تلک المرتبة العليا لأن جولانه إلى نفس العالم وما هو عينه يعنى اى مرتبة العينية والآتى، وذلک كفر الحقيقة والله سبحانه وتعالى اقرب الينا من انفسنا فهو سبحانه وراء الوراء ثم وراء

الوراء ثم وراء الوراء في جانب القرب لافی جانب البعد فلا سبيل للعلم الحضوري للصوفي المتعلق بحضرة الذات وراء العلمين لا يدرى ما هو ولا يجوز اطلاق التفكر عليه الامجازا كما اطلق عليه بعض الصوفية.[۲۰]

في تفسيره الامثلة لتفسير الصحابة رضوان الله عليهم اجمعين التابعين الكرام وتبع التابعين وآراء العلماء والمفسّرون الّتی اوردها المؤلف رحمه الله تعالى في تفسيره والمطلع على تفسيره يدرک بحق اهتمامه رحمه الله تعالى بتحرى تفسير الصحابة .[۲۱]

ولم يخل تفسير القاضي من ذكر بعض القصص الإسرائيلی الغريب، ولكن انه مقلّ في سرد الاسرائيليات ويتعقب كثيراً من هذه الروايات بالنقد المزعج مثل ذكر قصه هاروت وماروت في تفسيره اجمالاً وعند تفسيره لقوله تعالى في الآية ١٠٢ من سورة البقرة ﴿واتبعوا الشيطين على ملک سليمان ...ولكن الشيطين كفروا يعلمون النّاس السحر وما انزل على الملكين ببابل هاروت وماروت...﴾ نراه يقص لنا قصة غريبة عن هاروت وماروت عن البغوى وعن ابن عباس وعن الكلبى ... ثم بعد ان يفرغ من هذا القول:

"وهذه القصة من اخبار الآحاد بل من الروايات الضعيفة الشاذة ولا دلالة عليها في القرآن بشئ وفي بعض روايات هذه القصة ما يأباه النقل والعقل... أئمة انتقل لم يصحوا لهذه القصة ولا اثبتوا روايتها عن على رضى الله عنه، ولا عن ابن عباس رضى الله عنه، قال القاضي رحمه الله تعالى ان هذه الاخبار لم يرو منها شيئ صحيح ولا سقيم عن النبي ﷺ وقال هذا الاخبار من كعب اليهود وافتراء هم.

وعلى هذا القياس ينقد القاضي رحمه الله تعالى عمل داؤد عليه السلام فی قتل اوريان بالخدعة ونكاح زوجته فهو كذب مفترى حاشاه عن ذلک...[۲۲]

نجده ان الامور لا تعني ولا يفيد القاضي رحمه الله تعالى مقلّ جدّاً عن الإسرائيليات يذكر تفسيره بالإيجاز والاختصار ومثل هذا العمل المذكور نجد في مواضع عديدة ويذكر رأية الخاصة فيهم يقول: بهذه الكلمات ، قال القاضي: وقلت: يذكر الاقوال المختلفة فيه ثم يقدم دليله على هذه[۲۳] وقد ذكر المؤلف في تفسيره التأويلات الصوفية والشطحات والمواجيد والإشارات والاصطلاحات بكثرة كان القاضي رحمه الله صوفيا كبيرا كما نراه فی تاويله الإشاري يمثل الفلسفة الصوفية باعلى انواعها ، مثل فی تفسيره لقوله تعالى:

﴿ كلو ممّا رزقكم الله حللا طيّباً واتقوا الله الّذي انتم به مؤمنون ﴾

وضع المؤلف في تفسيره المراتب يمرّ بها السالک وذلک عند تفسيره لقوله تعالى:

﴿ ليس على الّذين امنوا وعملوا الصلحت جناح فيها طعموا اذا ما اتّقوا وامنوا وعملوا الصلحت ثم اتّقوا وامنوا ثم اتّقوا واحسنوا والله يحب المحسنين ﴾

فسّر لقوله تعالى فى الآية ۱۰۳ من سورة البقرة ۹۳۰ واتبعوا الشيطين على ملک سليمان ...انفسهم لو كانوا يعلمون ﴾

والمختار عندى ان العلم علم يتعلق بظاهر القلب وذلک لا يتتبع العمل ومنه علم اليهود ويعرفونه كما يعرفون ابناء هم لا يجديهم معرفتهم شيئاً كمثل الحمار يحمل اسفاراً وعلم وهن يتخلص إلى صميم القلب بعد انجلائه وإلى النفس بعد اطمينانه وهو المعنى فى قوله تعالى :

﴿ انما يخشى الله من عباده العلماء ﴾

وقوله عليه الصلاة والسلام العلماء ورثة الانبياء. يذكر الابيات للاستشهاد ومن التفاسير السابقة فى زمن الصوفي.[۲۴] يوجد الارتباط بين العقل والنقل في التأويلات الّتي يذكر القاضى رحمه الله تعالى في تفسيره مثل قول الله تعالى فى الآية ۳۱ من سورة البقرة ﴿ وعلم آدم الأسماء كلّها ﴾ قلت المراد ان الله تعالى علم آدم الاسماء كلّها اجماليا فانه لما حصل له معية بالذات تعالت وتقدست حصل له بكل لم من اسمائه وصفة صفاته مناسبة تامة وهبة بحيث انه كلما توجه الى اسم من اسمائه وصفة من صفاته كما أنّه اذا حصل لرجل ملكة في علم من العلوم كان بحيث كلما يتوجه إلى مسئلة من مسائله يحضر تلک المسئلة.[۲۵]

ان المفسر لم يذكر فى تفسيره ان تفسيره الوحيد الّتي كتبت على منهج الصوفية بل يذكر فيه النكات المتصوفات مروى من العلماء الظاهر السابقة مثل يقول فى تفسير الآية ۱۶ من سورة ق ﴿ ... نحن اقرب اليه من حبل الوريد ...﴾

اختلف علماء في تصوير هذه القربة قال البيضاوي حضاه نحن اعلم بحاله ممن كان اقرب إليه من حبل الوريد ....وحبل الوريد مثل يضرب للكمال القرب يقال الموت ادنى لى من الوريد . قال البغوى معناه نحن اعلم به منه وقالت الصوفية بل الله سبحانه وتعالى اقرب إلى المخلوقات من انفسها قربا ذاتيا ولامكانيا ولا متكفيا اصلاً وفي تفسيره عند ما يوضح آراء ہ الصوفي يبدء بكلمات عديدة مثل:

قلت، يحتمل، ان يراد، و لعل.

هكذا نجد مباحثة الصوفية فى مسئلة هيوط الله تعالى من الغمام .وقوله في الآية ٦١ من سورة المؤمنون ﴿ اولئک يسارعون فى الخيرات ﴾ قلت ، لعل المراد بالخيرات الّتي يسارع اليها المؤمنون فى الدنيا .هو الاطمينان بذكر الله تعالى. والالتذاذ به والشبع بالكفاف وعدم الخوف من زوال نعماء الدنيا وعدم الخوف والرجاء عن احد سوى الله تعالى والمبشرات الّتي يدرک بالالهام والمنام .(٢٦)

خلال دراستى هذا التفسير وجدت ان المفسّر يذكر اسباب النزول لتفهيم سياق الآيات مثل قوله فى الآية ٢٧ من سورة البقرة ﴿ إنّ الله لا يستحى ان يضرب مثلاً ما بعوضة﴾ يذكر فيه روايات مختلفة فى اسباب النزول هذه الآية مثل لقاء اليهود عمر بن الخطاب وقوله انّ جبريل الّذي يذكر صاحبكم عدوا لنا ويذكر جواب عمر رضي الله عنه، حق كان عدو الله وملائكته ورسله وجبريل وميكائيل فإنّ الله عدوّه. وايضاً يذكر رواية اخرى حين سال اليهودى النبي ﷺ عن بعض الاشياء.

عند ما يجد المفسر اختلاف الروايات فى اسباب النزول يسعى ان للتطبيق بينهما مثل نجد تطبيقه فى الآية ٩٧ سورة البقرة .

قلت ولعلّ القصتين وقعتاها قبل نزول الآية

كذلک نجد في هذا التفسير يعنى جدّاً العناية بالناحية الفقهية عند ما يتكلم عن آية من آيات الأحكام استطرد إلى مذهب الفقهاء وهو ينتصر لمذهب الحنفي مثلاً عند تفسيره لقوله تعالى فى الآية ٢٢٦ من سورة البقرة ﴿ للذين يؤلون من نسائهم تربص اربعة اشهر فان فاء وا فإنّ الله غفور رحيم ﴾

نراه أنه ينتصر لمذهبه الحنفى ويرد مراراً اقوال ابى حنيفة رحمه الله تعالى(٢٧)

مثل عند تفسيره لقوله تعالى : فى الآية ٢٢٨ من سورة البقرة ﴿والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء﴾ يعرض لمذهب الحنفي ومذهب الشافعى فيما تنقضى به عدّة الحائض .

وعند تفسيره لقوله تعالى في الآية ٢٢٩ من سورة البقرة ﴿ فإن خفتم الاّ يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به ...)

نجد فى تفسير هذه الآية يذكر اختلفوا فى ان الخلع هل هو طلاق أو فسخ...

ويذكر رأى ابى حنيفه و امام مالک وامام شافعى ويذكر رأية الخاصة .

"قلت وهذا مبنى على اصل ابى حنيفة ان العالم قطعى الدلالة فى الشمول

لا يجوز تخصيصة بخير الآحاد ولو قلنا بجواز التخصيص بخير الآحاد لقلنا ان حكم الآية مخصوص بمقدار الصداق وما دون ذلک بتلک الاحاديث والله اعلم .[۲۸]

خلال دراستى هذا التفسير نلاحظ ان المفسر رحمة الله تعالى تتبع في تفسيره المسلک المالکی ويرجع في بعض المقامات المسلک الحنبلي عند الأئمة الثلاثة حدّ الزنا معينة ونجد تصديقه، في الأحاديث وموفق الامام احمد بن حنبل يوافق الآية القرآنية بالجملة ان القاضي رحمه الله تعالى اعتنى المسالک الاربعة في تفسيره بالعناية جدّا، ويرجع في بعض المسائل قياس الشوافع على قياس الاحناف مثل في موجبات الغسل وفى اليمين اللغو، طريقة طهارة الاعضاء البعض، وفى مسئلة التيمم ينتصر المسلک الحنفى ثم رأية الخاصة هكذا نجد في تفسيره بمواضع كثيرة .

وسعيه فى الاجتهاد فى تفسيره تدل على بصيرة القاضي وصلاحيته التخليقية ويظهر منه إن الاجتهاد يوجد في الهند وهذه الامثلة تنوّر الصراط الصحيحة للعلماء والفقهاء فى العصر القادم، قد اصناف المفسر على اجتهاد والفقهاء الكبار اضافة مفيدة بوسعة العلمى وبصيرته الجليلة. وهو يوافق مقتضيات العصر الحديث. يقول في حد النكاح بالمحرمات و ينقل قول سفيان ثوري وامام ابو حنيفة و زفر بن يذيل فى العقوبة البليغة الشديدة لرجل المذكور ثم يقول بنفسه.

” قلت والأولى ان يقال فيه القتل اتباعا بالحديث وفى مسئلة المحارم روى عن جابر انه يضرب عنقه و كذا نقل عن احمد واسحاق واهل الظاهر وقصر ابن حزم قتله على اذ ما كانت المرء ة إمرأة ابيه قصر للحدّ على مورده.[۲۹]

وهكذا يتفق القاضي رحمه الله تعالى على حدّ السحر: أن السحر يكون له حدّ وحدّه يكون القتل[۳۰] يريد القاضي رحمه الله تعالى ان يوافق الفقه الحنفى بالعصر الجديد، وهكذا هناک الامثلة مسئلة الشهادة العادلة، واختلاف بناء المقابر على ضريح الاولياء، يورد اقوال الفقهاء فيه ويرجح منه واحد أو يقول فيه مثل يقول في استدلال على اختلاف بناء المقابر على ضريح الاولياء ”قلت هذه الاحاديث تدل على كراهية تخصيص القبور والبناء عليها وجعل القبور مشرفة ولا دلالة لها كراهة بنا المسجد بقرب منها ومعنى اتخذ واقبور انبياء هم مساجداً انهم يسجدون إلى القبور كما هو صريح فى حديث ابى مرثد الغنوى .[۳۱]

ويوضح موقفه فى مذهب الهنود فى الهند ويبين ان الهنود يغيروا مثل اهل

الكتاب . نجد أنه يخوض في المسائل الكلامية فيذكر مذهب اهل السنة ومذاهب غيرهم مع ذكره لأدلة كل مذهب وانتصاره لمذهب اهل السنة وما بيده له ورد ما يرد عليه من جانب المخالفين ومهما يكتب المفسر فى علم الكلام يذكر معه مصادره استفاد القاضي رحمه الله تعالى في هذا المجال عقائد امام ابو منصور الماتريدى ، اما أبو الحسن الأشعرى ، امام الحرمين الجوينى،[۳۲] حجة الإسلام ابو حامد الغزالى،[۳۳] جلال الدين الدورنى،[۳۴] الحليمى،[۳۵] الطحاوى و تفتازانى[۳۶] فى علم الكلام اعتقد القاضي رحمه الله تعالى مسلكه المختارة أى اهل السنة أنه يطابق بالقرآن والحديث واجماع الامة يقدم فى هذا الضمن حديث، ''ما أنا عليه واصحابى''[۳۷]

اختار القاضى رحمه الله تعالى للتفسير العقائد والتصورات الّتي يتعلق العقائد الابتدائية مثل: عقائد التوحيد الذاتى، والتوحيد الصفاتى، صفات اسماء الهيه[۳۸] والرسالة المصطفوى وما يتعلق بها[۳۹]وحياة ما بعد الممات[۴۰] والحياة البرزخيه،[۴۱] والتقدير[۴۲] و عظمة الصحابة[۴۳] ونجد في تفسيره ترديد المسالک الباطلة وعقائدهم لدفاع عقائد وتصورات مسلكه تقوم هذا الكلام على تقابل الاديان. يرد نظرية العدل في مسلک المعتزلة وعقائد المعتزلة فى وعده وعيده ومسئلة امر بالمعروف ونهى عن المنكر هكذا ترديد مسئلة الشفاعة وسؤال منكر نكير.[۴۴]

كان ظهور الخوارج بسبب السياسة ولكن بعد ذلک صارت الفرقة المذهبية يوجد في التفسير المظهرى ترديد لآراء خوارج فى مسئلة الشفاعة[۴۵]و مسئلة الخلافة[۴۶]و عظمة الصحابة[۴۷] انتشرت مذهب التشيع فى الهند فى عصر القاضي فلذا اهتم لترديد المعتقدات اهتماما شديداً مثل عقيدتهم الإيمان بالأئمة، وعظمة الصحابة، ومسئلة الخلافة وفضيلة ابى بكر، وفرقه جبريه قدظهرت فى الاسلام من اوائله بذل جهوده فى ترديد وابطال افكار هذه الفرقة اختلف اهل السنة معهم في مسئلة النقدية نجد ترديد هذه الفرقة فى سورة يونس الآية ۴۴ يقول القاضي فالآية دليل على ان العبد له كسب وانه ليس مسلوب الاختيار بالكلية كما زعمت الجبرية.[۴۸]

نجد فى المباحث التقديرية نرديد فرقه قدرية يقول القاضي فى توضيح اهل السنة ان الانسان لا مطلقا ولا مختار مطلقا بل هو حر في بعض المعاملات

والمقيد بعضها .[٤٩]

هكذا نجد ترديد افكار فرقة مرجئة مثل يقول في تفسير سورة الزمر "اما استدلال المرجئة بهذا الاحاديث على ان المعاصي صغائر او كبائر لا يقتر مع الايمان كما ان الطاعة لا ينفع مع الكفر فباطل مستلزم لإنكار الحديث الواردة في المناهى.

في رأي القاضي ان علوم الفلسفة والحكمة لا ينفعها فى الآخرة ويستعمل القاضي رحمه الله تعالى لمعتقدين الفلسفة الالفاظ الخشنة. ويقول فيه.

"والحق ان قول الفلاسفة باطل بالكتاب والسنة والاجماع، يظهر منه ان المفسر الفاضل له مطالعة عميقة فى علوم الفلسفة والحكمة والهيئة وهو يكره ان يفسّر القرآن بالاستمداد هذه العلوم .[٥٠]

كذلک نجد ان القاضي رحمه الله تعالى يرجع إلى شواهد من الشعر القديم بشكل واسع متبعاً وفى تفسيره يورد اشعار اللغة العربية والفارسية المنتخبة ويراد به ان يقدم شواهد لمفهوم المعانى واللفظي ايضاً وهذا دال على سعة علمه وذوقه الشعرية والأدبية: مثل يأتى الأشعار لتوضيح الآية ﴿ لا تحزن إنّ الله معنا ﴾ لابى بكر صديق رضى الله عنه خليفة النبي ﷺ .

اقسمت بالقمر المنشق انه له   من قلبه نسبة من الكفار عنه[٥١]
فالصدق في الغار والصديق لم ير ما   وهم يقولون مايا لغار من ارم

وايضاً ياتى اشعار حسان بن ثابت:

وثانى اثنين في الغار المنيف قد   طاف العدو اذ صاعدو ا الجبلا[٥٢]

ويذكر رجز النبى ﷺ أنشده يوم الحنين الجبلا .

أنا النبى لا كذب   انا ابن عبدالمطلب[٥٣]

علم قرأت له اثر بارز فى تفسير القرآن وتوجيه المعانى القرآنية المفسر الجليل يذكر القراء ات وبهذا نعرف المعلومات الهامة لعلوم القراء ات. فمثل عند قوله تعالى فى الآية ١ من سورة يسٓ. ﴿يسٓ يقول فيه ، قرأ حمزه وابوبكر بأمالة الفتح ...وورش وابوبكر وابن عامر والكسائى يدغمون نون الهجاء في الواؤ ويبقون الغنة فمثلاً عند قوله فى الآية ١٧ من سورة الرمز ﴿ والّذين اجتنبوا الطاغوت ...﴾ يقول فيه قرأ ابو شعيب بياء مفتوحة وصلا ساكنة وقفاً .فمثلاً عند قوله تعالى فى الآية ٢٩ من صورة فصّلت: ﴿ وقال الّذين كفروا ربنا ارنا الّذين اضلّنا من الجن والإنس ﴾

.... قراء ابن عامر وابن كثير ويعقوب وابوبكر بالتخفيف اى بسكون الراء ...وقرأ الدورى باختلاس كسرة الراء والباقون باشباعها .(۵۴)

فمثلاً عند قوله تعالى فى الآية ۳۵ من سورة الشورى ﴿ويعلم الّذين يجادلون فى ايتنا﴾

قرأ نافع وابن عمر بالرفع على استيناف والباقون عطفاً على علة مقدره...(۵۵)

وايضاً نجد في تفسير معلومات هامّة فى علم التجويد مثل قوله فى تفسير سورة الفاتحة ذكر اشمام روم ، اظهار ، يقول القاضي رحمه الله تعالى في توضيحه.

"والاشمام عبارة عن ضمّ الشفتين كقبلة المحبوب إشارة إلى الضمّة والروم عبارة عن الإخفاء والتلفظ ...والله اعلم (۵۶)

هكذا في سورة البقرة في الآية التالية ﴿يقميون الصلوة﴾ تجد قوله فى كيفية الهجائية وقراء لها

....قال ورش بتغليظ الام إذا تحرك بالفتح بعد الصاد، أو الطاء والظاء، نحو الصلوة، ومصلّى وأظلم والطّلاق، ومعطّلة وبطل ونحو ذلک وقرء الباقون بالترقيق الاّ فى لفظه خاصّة إذا انفخ او انضمّ ما قبله فيخمونه اجمعون .(۵۷)

ويذكر القاضي رحمه الله تعالى القصص في تفسيره بالاسناد والرواية ومنهجه جامع للتبويب والتبيين لوقائع الحقائق والتاريخ ويسعى ان ينبعث صلاحية الفهم فى التاريخ مثل قصه تخليق آدم وقصه نوح وآدم، وقصة ابراهيم عليه السلام ويذكر رأيه الخاصة فى توضيح القصص و شرحها وهذا العمل تدل على تبحر العلمى وفهم فى الدين، يظهر منها اثباته فى عصمة الانبياء وفهمه فى التخالف والتضاد فى الافكار القرآنية، واختار الطريق المحققة لتوضيحاتهن ويردّ آراء المفسرين السابقين فى طوفان نوح .

مثل ذكر شجرة ممنوعة في القرآن، تأثرت منه، عصمة آدم ويقول فى توجيهه ﴿ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظلمين﴾ أو فعله بسبب خطاء فى اجتهاده حيث ظنّ النهى للتنزهية او الاشارة إلى النوع وانما جرى عليه ما جرى طريق الشبيه المقدرة دون المؤاخذة كتناول السم على الجهل فى هذه العبارة يسعى أن يسلم عصمته.

هكذا ينقل بعض المفسرين في تفاسيرهم الاقتداء الكذبه من اساطير اليهود يردّ القاضي هذه القصص، يثبت بطلانه، مثل قصة عوج بن عنق ولا يؤيد

هولاء الاساطير الّتي تورد في كتب التفاسير السابقة يقول القاضي رحمه الله تعالى فيه:

"يقول وقصة عوج بن عنق ذلک يخالف ظاهر النصوص حيث قال الله تعالى قال نوح ربّ لا تذر على الارض من الكفرين ديّاراً، وقال: قيل، بعداً للقوم الظالمين وقال: لا عاصم اليوم من امر الله إلّا من رحيم: فتخصيص عوج من العمومات القاطعة لا يجوز الاّ بقاطع ولم يوجد القصة.(۵۸)

عند ما يفسّر القاضي الآية الّذي يتعلق برسول الله ﷺ يظهر انّه يفسّر سيرة رسول الله ﷺ بمحبّة واحترام يقدم في خدمة رسول الله ﷺ العبارة المزينّة والمرصعة(۵۹)تجد فی تفسير واقعات سيرة النبي بترتيب الزمانی مثل يذكر العهد الجاهلی،(۶۰) ولادة النبي ﷺ (۶۱)طهر والد رسول الله ﷺ(۶۲)

ويذكر الاشعار فی فضيلة الرسول ﷺ ورضاعة النبي ﷺ حضاتته،(۶۳) و بعثة النبی ﷺ(۶۴)واخلاق النبي موضوع هام نجده فی تفسيره ولما نجد التفصيل على هذا المنهج في التفاسير الاخرى وهذا تدل ان بصيرة القاضي رحمه الله تعالى في التاريخ عميقة ويذكر الباحث مدّلاً نجد حاجة التفسير الاخرى بعده ولا كتب السيرة بعده.

يذكر فی تفسيره فضائل السورة مثل يذكر فضيلة سورة الفاتحة. عن ابی هريرة رضی الله عنه قال، قال رسول الله ﷺ والّذي نفسی يده: ما انزل فی التوراة ولا في الانجيل ولا فی الزبور ولا في القرآن مثلها .(۶۶)

وايضاً يذكر فضيلة سورة البقرة "عن ابی مسعود رضی الله عنه قال، قال: النبی ﷺ الآيتان من آخر سورة البقرة من قرأ بهما في ليلة كفتاه، ويذكر فی فضيلة آل عمران: عن عثمان بن عفان من قرء آخر آل عمران فی ليلة كتب له قيام ليلة.(۶۷) وفی فضائل سوره الكهف:

عن ابی الدرداء عن النبی ﷺ قال: من حفظ عشر آيات من اوّل سورة الكهف عصم من فتنة الدجال.(۶۸)

هناک الامثلة الكثيرة فی فضائل سورة القرآن خلال دراسة نجد فهو خلاصة كل ما سبق من التفاسير مثل تفسير ابن حيان، وتفسير الكشاف، وتفسير البيضاوی وتفسير الفخر الرازی والطبری و تفسير ابن كثير، تفسير معالم التنزيل للبغوی و احكام القرآن للجصاص الرازی، وتفسير مدارک التنزيل نسخفی وهواذ

ينقل عن هذه التفاسير ينصب حكما عدلا بينها ويجعل من نفسه نقادا مدققا ثم يبدي رأيه حرّاً فيها والتفاسير الّتي كتبت بعد المظهرى سلک سلکه فی فن التفاسير ومنهم هذين تفسيرين تفسير ضياء القرآن لمحمد كرم شاه الازهرى.

قد اعتمد القاضى رحمه الله تعالى فى تاليف تفسيره على التفاسير المتداولة الشهيرة ومصادر علم الحديث و رواية الحديث مصادر دراية الحديث ونقد الرواة، ومصادر اللغة والاشتقاق، مصادر علوم القراء ة والتجويد مصادر الفقه، مصادر التاريخ والسيرة والمغازي مصادر التصوف والسلوک، مصادر الفلسفة وعلم الكلام قد اعترف العلماء التبحر العلمى للقاضى ثناء الله بانى بتى فى تفسيره باقوالهم عديدة، يقول الشاه غلام على الدهلوى فى تفسيره يكتب تفسير جامعاً لإراء العلماء المفسرين القدامى والجدد ومع هذا عبّر عن العواطف والاخيلة الّتي الهمها الله على قلبه و[٦٩] في التفسير المظهرى ،أنه صنف تفسيراً بسوطاً يدل على سعة علمه ويوجد فيه النوادر.[٧٠]

بعد دراسة التفسير تبيّن لی ان القاضي رحمه الله تعالى البا ع الطويل فی الفقه والتصوف وعلم التفسير هذا هو واسطة العقد والنموذج المختار لمقدرة قاضى رحمه الله تعالى عن اللغة العربية وكما يراعى دائماً ان يخرج التطبيق بين القواعد تتعلق بالقرأت أو المسائل الفقهية او الصوفية، وهذا التفسير سهل المأخذ ممتع العبارة ليس بالطويل ولا بالقصير وأنه كان كثير العناية بسبک العبارة وظهر تفسيره الصوفي المليئ باصطلات ورموز وإشارات الصوفية والحق القاضي رحمه الله تعالى أحسن فی هذا التفسير وابدع حتى صار صيته، كل مطار وصار اصدق مشاهد لمولفه بامامته بالعربية من النواحى العلمية المختلفة .

فهرس الهوامش والمصادر

١. عبدالحي الكهنوى الحسنى، نزهة الخواطر وبهجة السامع والنواظر مكتبة دار عرفات، رائے بريلی الهند، ج ۷، ص ۱۳۷

٢. محمود الحسن عارف، تذکرۂ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مطبع طیّبۃ پرنٹر لاھور، سنة ١٩٩٥م

٣. صديق حسن خان، قنوجی، نواب، اتحاف النبلاء والمتقين بأحياء مأثر الفقهاء والمحدثين، ص ٢٤٠، مطبع نظامی کانپوره ١٨٧١

۴. تذکرہ علماء ہند، تحقیق وترجمہ محمد ایّوب قادری، ص۱۴۴، کراچی ۱۹۱۹م

۵. نزهة الخواطر ج ۷ ص ۱۱۹

۶. المصدر السابق، س ۱۲۹

۷. تذکرہ قاضی ثناء اللہ بانی بتی، ص ۱۵۴

۸. اشتیاق حسن قریشی، برصغیر پاک وہند کی ملّت اسلامیہ، کراچی، ۱۹۷۱، ص۸

۹. عبدالرزاق، قریشی (مرتب) مکاتیب مرزا مظہر جانجاناں الشہید، بمبئ، ۱۹۶۶، ص ۴۸م ۲۵

۱۰. برصغیر پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ص ۲۳۱

۱۱. محمد ثناء اللہ بانی بتی، قاضي، التفسير المظهری، ندوة المصنفين دهلی الطبعة الثانية ۱۲۷۲، فضل في الجهاد ج ۱ ص ۲۵۷ . ۲۵۹

۱۲. ڈاکٹر سالم قدوائی ہندوستان مفسرین اور انکی عربی تفسیریں ، برقی پریس دهلی، ۱۳۵۵، ص ۱۰۸

۱۳. التفسير المظهری ، ج ۸ ص ۳۸۲

۱۴. انظر بالتفصيل التفسير المظهری ، ج ۱ ، ص ۱۰ ، ج ۲ ص ۱۶ ، ج ۹، ص ۸۴

۱۵. التفسير المظهری ، ج ۱ ص ۱۰

۱۶. التفسير المظهری ، ج ۱ ص ۱۱۸

۱۷. التفسير المظهری ، ج ۲ ص ۳۸ ، ۹۳ ، ج ۳ ص ۱۹ ج ۴ ص ۲۶۴ م ج ۵ ص۳۵ ، ۳۶

۱۸. التفسير المظهری ، ج ۲ ص ۹

۱۹. التفسير المظهری ، ج ۲ ص ۱۸

۲۰. التفسير المظهری ، ج ۲ ص ۹ ، ۱۰

۲۱. التفسير المظهری للتفصيل ، ج ۱ ص ۵ ،ج ۲ ص ۲۴۸ ، ج ۲ ص ۱۹۹ ج ۴ ص ۱۰۴ ج ۱۰ ص ۱۰۷ ،ج ۲ ص ۱۹۱

۲۲. التفسير المظهری ج ۳ ص۳۷

۲۳. التفسير المظهری ،ج ۱ ص ۱۰۲، انظر للتفصيل، النمل:۲۰ سورة ص:۱۱، الصافات:۲۳، المائدة:۱۲، آل عمران:۹۳، هود:۳۸، المائدة:۱۲

۲۴. ج ۱ ص۱۱۰، ج ۲ ص۵۲۴

۲۵. ج۱ ص۵۱
۲۶. ج۶ ص۳۸۹
۲۷. ج۱ ص۲۹۲
۲۸. ج۱ ص۲۹۶
۲۹. ج۱ ص۴۳۳
۳۰. ج۱ ص۱۰۶۔۱۰۷
۳۱. ج۶ ص۳۳، ۳۴
۳۲. ج۴ ص۱۹
۳۳. ج۸ ص۵
۳۴. ج۶ ص۱۱۸
۳۵. ج۶ ص۱۱۸
۳۶. ج۶ ص۱۱۸
۳۷. ج۱ ص۳۱
۳۸. ج۱۰ ص۸۴، ۱۴۱، ۱۶۰
۳۹. ج۱ ص۵۶، ۲۴۹
۴۰. ج۱ ص۴۴، ۱۵۳
۴۱. ج۸ ص۳۶۱، ج۳ ص۳۲۶
۴۲. ج۱ ص۳۵۱، ج۳ ص۳۱۳
۴۳. ج۱ ص۴۴۱، ج۸ ص۳۱۹
۴۴. ج۱۰ ص۴۷۷
۴۵. ج۵ ص۴۷۷۔۴۷۸
۴۶. المصدر السابق
۴۷. ج۶ ص۵۵۲، ج۸ ص۳۵۲
۴۸. ج۵ ص۳۰
۴۹. ج۶ ص۳۰، ج۱۰ ص۱۳۷
۵۰. ج۸ ص۱۰۶، ج۸ ص۱۰۷
۵۱. ج۴ ص۳۱۳
۵۲. ج۴ ص۳۱۳
۵۳. ج۴ ص۱۶۵
۵۴. ج۸ ص۲۰۳
۵۵. ج۸ ص۲۹۲
۵۶. ج۱ ص۷
۵۷. ج۱ ص۲۰
۵۸. ج۵ ص۹۰۔۹۱
۵۹. **کلمات طیّبات، ابو الخیر محمد بن احمد مراد آبادی مجتبائی، دهلی، ۱۳۰۹ھ ص ۱۳۳۔۱۵۶**
۶۰. ج۱ ص۲۵۲
۶۱. ج۴ ص۲۷۹
۶۲. ج۷ ص۸۹
۶۳. ج۷ ص۱۲۴
۶۴. ج۷ ص۸۹
۶۵. ج۵ ص۶۹۔۷۰
۶۶. ج۱ ص۱۱
۶۷. ج۱ ص۲۸
۶۸. ج۶ ص۷۰۔۷۹
۶۹. **مقامات مظهری ص ۵۷گ**
۷۰. **وقائع علم وعمل، عبدالقادر آفاق ترجمه معین الدین افضل، ص ۱۷۹۹**

A Critical Study of Western Agenda in the Perspective of Cultural War

Dr. Muhammad Akram Sajid☆/ Dr. Umer Hayat☆☆

Abstract

"Orientalism new or old has many aspects. The scene they show the world has double edges, the picture which is shown to the people does not reveal the fact rather it conceals. Today west in the coalition of NATO, under the supervision of United States depicts the Muslim World by many terms like fundamentalists, terrorists, conservators, backward and suicidal attackers. If one looks into the matter impartially it comes out that west has its own targets. They can be listed as, to create a new culture that suits the present secular and agnostic western civilization and weaken Muslim states by getting control over oil reservoirs. Tightening the clutch of debts and arms embargo. Creating misunderstandings towards Muslim countries particularly neighboring states. Highlighting sectarian differences and propagating it into horrible scenes. Putting economic sanctions by creating a storm in the tea-cup. Destabilizing Muslim states, by the name of establishing democracy. Banning Muslim raw material and goods to the western markets. This paper is going to unveil this alarming situation and show the true picture of this."

Keywords: Western Agenda, Cultural War, NATO, Economic Sanctions, Fundamentalism and Islamic Bomb.

Introduction

In the first phase of Orientalism, Orientalists discussed Quran, Hadith, the life of Prophet (Peace be upon Him) teachings of Islam, Muslim scientists, Muslim Jurisprudence and Muslim sects. With the passage of time they found many new topics[1].

☆ Ph.D Scholar, Islamic Studies and Arabic, Government College University, Faisalabad

☆☆ Assistant Professor, Islamic Studies and Arabic, Government College University, Faisalabad

The indulgence of Muslim rulers in pleasures and eventually their demise provided the west a walk over to criticize Islam and its belongings, particularly its civilization. With the dismemberment of United Soviet Socialist of Russia, the idea of clash of civilizations emerged[2].

The American think tank took it like a hot cake, U.S. Press coloured it with their own meanings and formed the agenda to crush Muslim Army in strongholds of Muslim states. New World Order had already decided to deprive sources of the Gulf-States particularly, and man-power and mineral resources in the Muslim states commonly. American led western press took the responsibility to make western civilization superior and Muslim culture inferior[3].

This is not much important if Muslim intellectuals and scholars would have unveil western agenda and disclose this conspiracy at world forums. It is important if the fellows of the same minds oppose their fellow minded that the negativity of their nationals that they are merely looters, black-mailers and have sheward targets. Yes, there are such positive approaches who criticize the west particularly American led NATO and the aggressive Alliance, that Allies are liars, wolves and cowardly nations who merely run around imaginary framed and self-made stories. So we have a long list of such persons, at the moment there are three brave persons. George Galloway, Robert Fisk and Seymour Myron Hersh who unveil the totally self-framed terms of terrorism, fundamentalism and Islamic bomb. The coming lines are going to highlight their views alongwith the contemporary analysts.

Seymour Myron Hersh with an interview to Spiegel online, conducted by Charles Hawley and David Gordon Smith stresses as American Government need not to ban Iranian nuclear programe as it is for civil and peaceful purposes. United States wants to reshape Middle East. Hersh is of the view this all propaganda will be ended up on an oil deal. Though in the press, president declares that he is doing according to God's will. He desires to Balkanize the Middle East[4].

He says that Vietnam was a tactical mistake and Iraq a strategical. This wound is got by stupid acts. He says, he is writing, "an alternative history of Bush war". The government is hijacked by neoconservatives. The result is state is losing but personalities wining, so I say openly that I am an anti-war

person. American aim is not to democrize Middle East but to protect Israel from Iraq and to protect the flow of oil to America. It has not cynical reasons but ideological. Even the president claims that God talks to him so he will do to crush the world for the sake of this “talk”. He even sets the directions of democracy in Egypt, Jordan, Saudi Arabia, Syria and Pakistan[5].

What kind of democracy and welfare, they brought it Iraq, Herold, writes, that Tony Blaire, advised, “kill all the women and rape all the men” is this a civilized west?

The aim is to get all the persisting sources from the Gulf States and more especially oil riched countries, i.e. Iran, Iraq, Kuwait. By knowing this someone can find the mind setup of Europe and its neo-allies, i.e. United States and North Atlantic Treaty organization, cooperating countries. Western Civilization secular and atheist is widespread all over the three continents America, Australia and Europe.

Western Civilization and Widespread Atheism

Atheism means denying God’s existence and his concept, which of course does involve rejecting His commandments, as well as religious reflection, and believing in the possibility of total self-independence that is apart from God. As such beliefs negate the concept of sin, people consider that they can live as they please. Therein lies in the corruption of people's arts and minds. Atheism gets a circle as education is misused, young people are neglected by the elders, and schools actually defend and foster it.

Ignorance about the essentials parts of faith and religion is the fundamental reason why atheism initiates to grow and develop. People whose minds, and souls have not been yet directed to the truth automatically become vulnerable. Only God's help and His grace can save them. If a society does not confront the trend decisively and successfully; its members' hearts and minds become open to this influences that lead to deviation[6].

Religion, science, nature and human mind is unanimously agree that all the universe has a vivid and delicate harmony with one another. Nothing clash can be seen in between two things. If there is no clash between two matters why man has a contrast view about his creator. Moreover why manipulating different ideas man, differ from each other. This serial gets ahead and the

day comes there is an armed contradiction between a man to man[7].

This gulf is widened by media, little knowledge rather illiterate people, having little knowledge are blowing the hatred into heavy fire. This develops them, instead preparing into positive mindedness, a pleasure seeker triviality and banality loudness and vulgarity[8].

So the need is to opt deeper ways of religious life, the ways that lead them refraining from anxiety and going towards righteousness and right. Without the true path of religion people become hasty, lusty and pleasure seekers, this ultimately leads them in a situation where they find no way but to be negotiate it. Moreover this develops imbalance and disharmony in the life, then atheism is developed agnostic and at the end no need of religion. As a result the ignorant culture spreads darkness, this darkness brings destruction. One can be saved from such wild activities by organizing society by the beautiful hold of balanced life provided by the religion. So the worst habits may not develop themselves in the youth, obviously the youth of west is directly hitted by this situation. They must be led to systematic, straight and honest way of thinking. Where, such qualities do not exist such community and native or nations get a moral and spiritual corruption until it can be rescued[9].

This theory, regardless of where it has been applied, has never produced sane, caring, and compassionate human beings. Rather, it has intensified misery and selfishness by isolating individuals from their families, traditions, and even from themselves. Its adherents do not cultivate their morals or tastes, rather live shallow, private lives and make no effort to find the truth. In short, they simply survive from moment to moment in the illusory hope that they may not find happiness.

These few reflections do not cover the whole subject. Let's I hope that future guides, teachers, and leaders with discernment and foresight will consider them when trying to stop the spread of deviation and atheism. I have presented a brief insight into the problem, with the prayer that some people may be alerted to the truth, conquer the self, and regain the means to do what is good.

Islamic Jehad and misunderstandings of the West

Amitabh Pal writes, Jihad is not war: Grappling with the most controversial aspect of Islam; everyone depicts that pillar of Islam in his own picture while the truth is as under.

"In actuality, the notion of jihad has much more complex overtones, with the word "jihad" meaning to strive or to struggle. This may be a struggle against your own evil proclivities or for the sake of Islam, nonviolently or violently. 'The Arabic word, Jihada, found throughout the Qur'an, basically means 'striving,' 'effort' or 'to try one's utmost".

Gulan explains, the major subtext of Jihad is to do with social justice, scholars have contended, and stripped of its violent overgrowth, the term has a lot of positive things to offer. "Jihad has come to mean the advocacy of social justice in a widening circle that also includes economic participation and prosperity for Muslims," Professor Bruce Lawrence says, and goes so far as to assert that "the future may yet belong to those who learn to wage economic jihad in English."

As examples, he cites "jihad of the heart," which involves struggles against your own sinful inclinations, and "jihad of the tongue," which requires speaking good and banishing evil. And what will astonish a lot of people is that the term jihad is used in Arabic to describe the best-known nonviolent movement in history[10].

Roland E. Miller, a Lutheran minister and Islamic scholar, compares "jihad" to the word "crusade." Many Muslims realize that it has a disturbing connotation for non-Muslims in spite of its many innocuous undertones. But similarly, many Christians use "crusade," even if they comprehend the enormous negative baggage it carries in the Middle East.

So, there are multiple meanings here, too. As you can launch a crusade against poverty, you can also wage a jihad for, say, affordable housing. In fact, there is an Iranian organization called jihad-i-sazandigi a campaign for housing. Professor Nasr asserts that the West has carried out more wars in the nature of crusades either the "civilizing mission" of the French in the past or the war against communism more recently than Muslim countries have carried out sanctioned or unsanctioned Jihad[11].

Karen Armstrong writes, a very illuminating passage on jihad: "The root JHD… signifies a physical, moral, spiritual and intellectual effort. There are plenty of Arabic words denoting armed combat, such as harb (war), siras (combat), nzaraka

(battle) or qital (killing), which the Qur'an could easily have used. Instead, it chose a vaguer, richer word with a wide range of connotations. The only country where a majority interpreted jihad in an aggressive way was Indonesia, generally thought to have a very relaxed version of Islam. In addition to these dominant understandings of jihad, there were many others, such as "a commitment to hard work" and "achieving one's goals in life," "struggling to achieve a noble cause," "promoting peace, harmony or cooperation and assisting others," and "living the principles of Islam." As can be seen, the interpretations of jihad are really multifaceted and almost as varied as the number of people responding"[12].

Professor John Esposito and Dalia Mogahed. "The word jihad has only positive connotations. This means that calling acts of terrorism jihad risks not only offending many Muslims, but also inadvertently handing radicals the moral advantage they so deeply desire"[13].

Professor Nasr claims that no word from Islam has been as distorted as Jihad, both in the West and by extremist Muslims. "To wake up in the morning with the name of God on one's lips, to perform the prayers, to live righteously and justly throughout the day, to be kind and generous to people and even animals and plants one encounters during the day, to do one's job well, and to take care of one's family and of one's own health and well-being all require jihad"[14].

The Prophet Muhammad (peace be upon him) himself preached, a multifaceted notion of jihad. Very famously, he is said to have stated, "We return from the minor jihad to the major jihad," on leaving a battlefield and resuming normal life. Here, the greater jihad was meant to be an internal battle within the soul against evil tendencies of the self, such as selfishness and greed. This is the sense in which the Sufis (and numerous other Muslims) have understood Jihad.

He also gave many other connotations to jihad. After [true prophets] came successors who preached what they did not practice and practiced what they were not commanded," the Prophet Muhammad (peace be upon him) is quoted by Professor Firestone. Whoever strives (jahda) against them with one's hand is a believer, whoever strives against them with one's tongue is a believer, whoever strives against them with one's heart is a believer." He is also reported to have said, "Pilgrimage is one of

the highest forms of jihad." Muhammad (peace be upon him) also said in a Hadith quotation that 'the ink of the scholar is more precious than the blood of the martyr"[15].

So, there is a whole span of activities that is encompassed under the notion of jihad. This ranges from being ethical and speaking well to defending Islam and/or spreading the faith. Even under this last category, taking up arms is just one way. "Jihad cannot be equated semantically with holy war, for its meaning is much broader," explains Professor Firestone. "Even 'jihad of the sword' is not quite equivalent to the common Western understanding of holy war".

Abdul Aziz Sachedina, a Muslim scholar educated in India and Iran currently a professor at the University of Virginia, has an understanding of jihad that he claims is firmly grounded in Islamic texts and sources. He says that in certain special circumstances when security cannot be guaranteed to Muslims for the free practice of their religion, Muslims can take up jihad as a defensive measure. Here the key notion is security, however, and it includes the rights of followers of other faiths and nonbelievers alike to practice their faith. As long as the rights of Muslims and other believers are respected, there is no justification for jihad, Sachedina says.

Even here, the unbeliever is meant to be granted protection: "If any one of those who join gods with Allah ask an asylum of thee, grant him an asylum, in order that he hears the word of God, then let him reach his place of safety. This, for that they are people devoid of knowledge". The overriding principle is that there should be no coercion in religion[16].

The Americans and Islam

Mr. Ata Rabbani touches the core issue in this way; Obama said that it is time of tension between the United States and Muslims around the world. This has been due to fear and mistrust. America and Islam are not exclusive and need not be in competition, Islam has always been a part of America's story. Muslims have fought in our wars, served in government and stood for a civil rights. There are nearly eleven million American Muslims and there are over 1200 mosques within America. He emphasized that let there be no doubt: Islam is a part of America[17].

Terrorism: He referred to the events of 9/11 where nearly

3000 people were killed. "These extremists have killed people in many countries, they have killed people of different faiths more than any other, they have killed Muslims". He showed his determination to fight till the complete elimination of Al-Qaeda and the Taliban.

President Obama's Cairo address was received with mixed reactions. It was a clean divide: the West, particularly the media called it empty rhetoric to gain prominence amongst the world of Islam and the Middle-East; whereas the Muslims in general and the Arabs in particular viewed it with sceptical hopes. It stirred the world all right in talking and commenting upon it.

Three major points confronting America, Islamic World and the Arabs stood out in his address. These were:

A - Terrorism and 9/11

B - Israel, Palestinians and the Arabs.

C - America, vis-a-vis Iran.

Obama was forthright and clear in his observations and confident to solve these issues. He even gave road maps for the solution.

These three knotty complicated problems had been defying solution for the past many-many decades and to resolve them now would be great but even if any progress is made towards their final amicable settlement, then all credit will go to President Obama. It will be like his dramatic entry as the first non-white President into the Oval Office and his name will go down in history as a land mark.

President Obama was positive that with good will and honest intentions and given time he could and certainly would deliver. It must be remembered that the 'American objectives and priorities' are all worked out by respective "think tanks" and finalised by both the houses and no matter which party is in power it has no authority to make any changes in it. The President at his discretion in any particular case and in extreme American interests may make a minor deviation from the laid down objectives? priorities but no more[18].

Emergence of Taliban and America's Role

There are some measures for the cure:

A: It may be categories as under; Since 2001, AI-Qaeda and Taliban were spreading their tentacles in many countries of

the world including Europe. Afghanistan and Pakistan were their hot beds. Taliban were American creations during Russian occupation of Afghanistan. American dollar and resources were used to indoctrinate and train "Mujahids" present day "terrorists' who are now creating havoc all around particularly in Pakistan. According to American administration America is also threatened. Unless the Americans dry up Al-Qaeda and Taliban sources of supply of funds and weapons, it would be difficult for Obama to exterminate the danger.

B: Israel has a powerful lobby in America. The Jews virtually dictates the economy and politics of both Republicans and Democrats. President Obama in his opening gambit when talking about Israel stressed about the strong bonds that exist between the two countries. "This bond is unbreakable" he said. With this categorical admission he goes on to boldly propose "two independent states of Israel and Palestinians". It is a declaration of intents by a US President against all Israel odds working against it. What would be the eventual outcome, will have to be watched and seen.

C: America vis-a-vis Iran. History bears it that due to geostrategic reasons America never relished Iran to be dominant in the Gulf. It invariably tried to destabilize Iran's legitimately established governments. In 1953 the US undermined and overthrow the democratically elected government of Prime Minister Mussadegh. Their latest effort was to manipulate world opinion and isolate Iran by propaganda against the re-election of President Mehmoud Ahmadinejad.

President Obama offered Iran an olive branch by declaring, "My country is prepared to move forward. Forget the past and let us talk without preconditions on the basis of mutual respect". Referring to Iran's nuclear quest Obama observed that "any nation should have the right to access peaceful nuclear power if it complies with its responsibilities under the nuclear "Non-Proliferation Treaty."

What could be expected!

With all the sincerity of President Barack Obama the prospects of an encouraging outcome are not bright. As far as terrorism is concerned the Americans are known to charge their stance as and when required by their interests. At one time Osama bin-Laden was their favourite and they lavished favours

on Taliban but it apparently does not suit them anymore[19].

As regards B; and C; these two are chronic problems ailing relations between America and the Muslim World for the past many decades. Call them whatever you may but the fact is that oil and geo-strategic factors, are at the core of it. Added to it is the American commitment to Israel both in the Mid East and in Iran. Only the other day the US. Vice President said, "We cannot stop Israel from making a nuclear attack against Iran because Israel is an independent country." Partially contradicting Vice President's statement on 6th July the State Department spokesman Ian Kelly remarked that Washington would not dictate Israel how to deal with Iran's nuclear ambitions. But we are committed to Israel's security and we share Israel's deep concern about Iran's nuclear programme.

In the existent scenarios in Palestine and Iran with all his pious declarations President Obama is unlikely to make much head-way unless there is a miraculous change of heart and in the American policies.

Scenario in Middle East and Western Interests

R.D McLaren writes about the situation: For the purposes of this discussion and analysis, Egyptian objectives and policies may be grouped into four categories; political, military, economic and social. This classification, however, should not be constructed to mean an independent existence of these categories. The military, economic, and social objectives and policies are generally formulated to achieve a set of political goals that provide the reasons for all other objectives and policies pursued by the state. And often the success or failure of the military, economic, and social policies is a direct reflection of the success or failure of political objectives and goals for example, in 1961. Nasser established a set of economic goals to be achieved during the next two decades. Although some of these goals were considered to be economically unrealistic, in political terms they were essential for the continuous existence of the regime, which wanted to establish its credentials as a revolutionary socialist state.

Egypt, however, failed to achieve its economic goals not necessarily because they were economically unrealistic but because Nasser's political goals and policies at the systemic and regional levels proved to be incompatible with the country's

economic needs. A successful completion of the economic projects depended largely on a massive infusion of foreign capital and technology and a sharp reduction in defense expenditure. Egypt failed to attract enough foreign capital because the country's new laws, promulgated under the socialist decrees, did not provide enough incentives and guarantees to private foreign capitalists. Also, Egypt could not reduce its defense expenditure because of its conflict with Israel and its military involvement in the Yemen civil war. Although the socialist decrees were designed to broaden the regime's popularity, they proved to be a serious impediment to achieving the country's economic goals which in turn would have strengthened its political objectives and policies. In other words, it may be said that the politically essential goals may prove to be politically difficult to achieve. That was essentially true of Nasser's Egypt.

In addition to such general and obvious objectives as maintaining territorial integrity, political independence, and national defense goals that all independent states are obliged to pursue Egypt's current policies are formulated with a view to achieving the following political objectives:

Recovering the Egyptian (the Sinai Peninsula) and other Arab lands (the West Bank of the Jordan, including the Arab section of Jerusalem, and the Golan Heights) under Israeli occupation since the June War; Restoring the political and territorial rights of the Palestinian people; accelerating the rate of economic and industrial development; modernizing political, economic, and social institutions; strengthening inter-Arab ties that have recently been forged on the basis of political consensus and economic cooperation among the Arab states; enhancing Egypt's regional and extra-regional prestige and role in international affairs. The above objectives are being pursued by means of political, military, economic, and social programs.

Although the Egyptian political objectives have changed little since the July 1952 revolution, Egyptian policies under President Sadat have shown remarkable differences in substance and style compared with those of Nasser. Unlike his charismatic predecessor, whose rhetoric and alleged intrigues often created apprehension and militancy among his Arab opponents, Sadat has accepted a pragmatic approach to resolving the major problems confronting the country. Recognizing Egypt's military

and economic inadequacies for regaining the Egyptian and Arab lands, Sadat offered, as early as December 1970, to recognize the existence of Israel as an independent and sovereign state if it would return the Sinai Peninsula to its rightful previous owner. Sadat was the first Arab leader of stature to publicly indicate his willingness to recognize Israel and to resolve the conflict by peaceful means. It should be noted that at this stage Sadat linked his willingness to recognize Israel only with the recovery of the Sinai Peninsula. This was his first condition for resolving the Egyptian-Israeli dispute. In addition, he offered to enter into immediate negotiations with Israel on the question of the freedom of passage for Israeli ships through the Strait of Tiran. This was Sadat's "step-by-step" approach to resolving the Arab-Israeli dispute. The second step in this process, he indicated, would involve the settlement of the Palestinian problem, which he linked with a promise that a just solution of this issue would give Israeli ships the right to use the Suez Canal.

In summary, it may be argued that Sadat's strategy achieved its main goals: it reactivated the U.S. role as a peacemaker in the Arab-Israeli conflict; it further isolated Israel from a number of European and African states: it achieved a substantial degree of Arab unity, expressed in the form of an oil embargo and increase in oil prices; and it strengthened the argument that the security Israel sought could not be obtained and maintained by military force alone. Since the end of the hostilities and the disengagement agreement between Egypt and Israel, Sadat has endeavored to strengthen Egyptian-U.S. tics by publicly voicing his approval of Secretary of State Kissinger's diplomatic efforts; by reestablishing diplomatic ties with the United States; and by providing a rousing reception for President Nixon during his visit to Egypt.

Recognizing that Saudi Arabia, because of its oil and monetary resources, is destined to play a much more decisive and significant role in regional and extra-regional affairs, Sadat made deliberate efforts to move politically and ideologically closer to Riyadh than to Tripoli, which publicly expressed disapproval of Sadat's reliance on the United States for a peaceful solution of the Arab-Israeli dispute. Saudi Arabia, along with Kuwait, Qatar, Bahrain, and the United Arab Emirates, provided hundreds of millions of dollars for Egypt's war-shattered economy; and collectively these donors promised even

larger amounts in economic and military aid. In addition, under the terms of the 1974 Rabat Conference, the Arab oil-producing states promised Egypt annual aid of $1 billion for the indefinite future.

How the Israel is aggressive to crush the Iranian peaceful nuclear programme, shows the views of Dana and Steven in these lines; Visitors to Israeli air force headquarters in Tel Aviv report frequent sightings of a striking poster. Emblazoned with the words "IAF Eagles over Auschwitz," it depicts three Israeli F-15 aircraft above the iconic gate of Birkenau, the huge death camp adjacent to Auschwitz. The poster celebrates the 2003 flyover of a Polish-Israeli commemoration of Holocaust victims 60 years earlier[20]. The appearance of the aircraft, which left observers divided on the question of whether a show of military prowess was appropriate to the contemplative nature of the memorial service, had been more or less impromptu: the three planes were in Poland for air unrelated air show. The inspiration for joining the air force presence to the concentration camp ceremony belonged to then-brigadier general and future air force chief of staff Amir Eshel, who piloted one of the F-i5s. He and his and Israelis more serious about seeking peace. It was, according to Kissinger, an extremely rare case of a statesman who fought a war "to lay the basis for moderation in its aftermath" and it worked[21].

Similar happy results from air strikes against Iran even if they lead to a wider war implicating the United States cannot be ruled out. Iran's prestige could be usefully tarnished. Fearful Arab regimes might be secretly or openly gratified. The Iranian regime already fragile might even fall to a Green movement eager to end Iran's international isolation.

All of these consequences are possible. They are not, however, predictable. It is worth remembering, in this regard, the predictions of a positive, democratizing, regional domino effect that supporters of the Iraq war made for it in 2003. Some of those same supporters now claim vindication in the fact that Iraq in early 2010 is far more peaceful than the Iraq that was sinking into civil war in 2006.This is true enough, just as it is also true that the removal of Saddarn Hussein was a great benefit to the Iraqi people and the wider world. It can obviously be compared, the peace, prosperity democracy and scientific development in American revolutionized Iraq! Of course, things

were likely to get better sometime. Meanwhile, the carnage and chaos was-imhense, and the costs in Iraqi, American, and other coalition lives, treasure, American prestige, and Arab and Islamic anger have been huge.

A war launched by Israel against Iran might have similar strategic costs. Rallying millions of Muslims, whether Sunni or Shi'ite, to the Iranian cause could revive the specter of a civilizational war between Islam and the West, inspire fresh recruits to global terrorism, draw in Arab states both allied with and against Iran, and doom Obama's initiatives in the Middle East and beyond[22].

Afghanistan, Soviet Union and Central Asian States

The Soviet Union was not less behind the American from Islamic Afghanistan, Hofmann writes; From all accounts, including some from Moscow, the Kremlin was motivated purely by the cold calculations of Realpolilik. As an Islamic border state, backed against the formerly Islamic regions of Soviet Central Asia, Afghanistan has long been a neuralgic point for Russia's rulers. In the 19th century, the czars fenced with the British to insure that Afghanistan would be a friendly buffer state. But what appears new is the Kremlin's current effort to incorporate Afghanistan as an outright satellite of Moscow.

A high-level Soviet military mission to Kabul this past fall apparently concluded that the Soviet-backed military campaign against the Islamic tribal insurrection was on the brink of an embarrassing defeat, barring massive Soviet intervention. According to American specialists, Soviet leaders feared that unless they acted forcibly, they would be faced with hostile Islamic Government in Kabul.

By Soviet reckoning, the Kremlin had little to lose by invading Afghanistan. Washington was handcuffed by the Iranian crisis and no longer offered the major attractions of détente. Relations with the United States had been souring steadily, and there were only dim prospects for ratification of the strategic-arms treaty. To the east, China was hostile, and in the west, the Europeans had just agreed to deploy more modern nuclear- armed missiles rather than grasp the Soviet carrot of regional arms talks. Better to take a quick gain by converting Afghanistan into a satellite than risk rebellion at the Soviet back door[23].

Montgomery Watt calls back the change, Muhammad

(Peace be Upon Him) brought in Arab society; in the social sphere also, when people became Muslims, life 'went on much as before. This statement must be qualified somewhat, however. At the period when Muhammad was forming his state at Medina Arabian society was already experiencing certain changes, some of which will be mentioned presently. In addition to this Muhammad's activities slightly altered the character of society in the oasis of Medina. To begin with he brought the Emigrants with him from Mecca, and this had certain social repercussions; for example, the Emigrants found the position of women slightly different in Medina from what they had been accustomed to in Mecca, and there had to be read justificants. In the closing years of Muhammad's life many nomads also settled in Mecca, attracted by Muhammad's success; and this meant further adjustments. Thus in Qur'anic passages revealed at Medina there are many regulations affecting the social life of this new mixed population at Medina[24].

Two points may be selected for implication, namely, the regulations about inheritance of property, and the regulations about marriage. There is a set of complex arithmetical rules for dividing up the property of someone who has died. These appear to be designed to ensure that all the close relatives of the deceased, male and female, receive an appropriate share of what he leaves. Now this is very appropriate to the situation of the embryonic Islamic community. As was noted in an earlier chapter, the growth of commerce at Mecca had led to greater individualism; men used what had been communal property to advance their own commercial schemes, and then regarded the profits as belonging to themselves personally. Those women and children who had no honour- able adult male to look after their interests were often defrauded. The matter was further complicated by variations between matrilineal and patrilineal family structure. Qur'ãnic regulations maybe said to have accepted the trend towards individualism by regarding all property as individually owned; yet at the same time they acknowledge that relatives have certain rights in a man's property so that he is in a sense only a steward of it on behalf of his family. The arithmetical proportions make the right of each relative quite definite, and in a way that seems perfectly fair[25].

Saba Mehmood once again elaborates the situation; Focusing on the Middle East, in what follows I analyze how the discourse on religious freedom from its inception has been

intertwined with the exercise of Western power first in its Christian and later secular modalities, shaping its formulation in contemporary national and international Key in this alternative genealogy of the right to religious liberty is the figure of the "minority" in Middle Eastern history that has served as a site for the articulation and exercise of European power. As I will show, from the seventeenth century onward the discourse on religious liberty in the Middle East has been intertwined with European projects of extending "protections" to non-Muslim minorities (primarily Christian) as a means of securing European interests in the region. As I will argue, such a historical project cannot simply be understood as an instrumentalization of religious minorities for geopolitical ends. Instead, one must ask as to how the very concept of "religious minority" its spaced of problematization is indebted to this history. viewed from-this perspective, "religious minorities" do not just signify a demographic entity that are accorded a space of freedom and immunity by the institutionalization of religious liberty, but are also produced through the process of the legal confrontation of this principle. One of the key questions that guides this essay is that of how the discourse on religious liberty has participated in the production of "the minority problem" in international law, and how this "problem" has unfolded in the history of the modem Middle East.

She writes; while the fundamental relationship between religious liberty and the doctrine of modem sovereignty in European history is widely acknowledged, far less appreciated are the exceptions this narrative enacted as the discourse of religious liberty traveled to non-European shores. Notably, the introduction of the principle and practice of religious freedom to non-Western lands was often predicated upon the violation and subjugation of the principle of stale sovereignty instead of its consolidation[26].

This history of the interrelationship between religious liberty, minority rights, and geopolitics that I have traced here is often read as the cynical instrumentalization of otherwise noble principles in the service of real politik, or as the distribution of a moral good that Western Europeans discovered for themselves that they slowly introduced to less enlightened cultures sometimes through imperial force and sometimes through soft means such as international diplomacy. Seen in this way, the principle itself its logic, its aim, and its substantive meaning

remains unsullied by the impious intentions of the empires and states that sought to promote or subvert it. Such an argument needs to be complicated for several reasons. First, it is important to understand that European efforts to subject weaker states to accept provisions for religious freedom for minorities (since the seventeenth century) cannot be understood as a simple extension of a "culture of tolerance" to non-Western peoples and lands, if this were so, the European powers would have accepted similar provisions in regard to their own minorities, which they refitted to do throughout history[27].

How the conspiracy was netted around the Muslim world, rather its centre, David Ghanim explains the true story.

There is, however, a strong tradition of cross-border smuggling in the north of Iraq. Smuggling has been the business of choice for the, Kurds for a very long time. In fact, the control of the transit trade and smuggling was one of the crucial factors igniting the intra-Kurdish fighting for four years in the 1990s. This fighting stopped only when the UN program of oil for food allocated 13 percent of the receipts of this program to the Kurdish enclave, which meant in reality new corruption opportunities for the ruling Kurdish politicians.

It transpired in July 2010 that hundreds of millions of dollars in crude oil and refined products were smuggled from Iraqi Kurdistan to Iran, in contravention of international sanctions on Iran. The scale and organization of this operation is alarming. Hundreds of tankers, each with a capacity of at least 226 barrels, enter Iran every day. The operation is supported by an estimated 70 mini refineries, many of them unlicensed. Officials in the two ruling Kurdish parties and the KRG denied these accusations of smuggling. However, an electronic website run by the opposition Gorran posted an official document issued by the regional Ministry of Finance, which was acting upon instructions from the regional Ministry of Natural Resources, instructing customs officials to allow the fleet of tankers to cross the border with Iran without paying customs duties.

A paper published by Gorran estimates that the revenues derived from this smuggling reach a level of $264 million a month, and these revenues do not reach the budget of the regional government. A newspaper affiliated with the opposition Gorran, Rozhnarna, published a story on July 20 claiming that the two ruling parties, KDP and PUK, have made millions of dollars from oil smuggling in Iraqi Kurdistan. In response, the

KDP has filed a $1 billion defamation lawsuit, which is the biggest compensation request in the history of Iraqi journalism[28].

Watt tells how the social set up can be framed; The setting of social life is provided by material factors. These include the geography of the country in which the society lives, the techniques known to it, and its relations to neighbouring societies. In a sense these are all economic factors, though the wider term 'material' seems preferable. It is more important to notice that there is a certain inevitability about them. If the society next to yours has a better kind of cereal and a better way of growing it, so that it can feed a larger population more adequately, then (assuming similar geographical conditions) your society will be defeated and perhaps exterminated by this other society unless you adopt their technique and get seed from them. The change of grain and technique is in one sense a matter of choice, but in another sense your society has no alternative, since it cannot contemplate extermination[29].

The conscious attitudes on which the life of a society is based have deep, and so partly unconscious, roots. Because of this they are firmly held, and it is usually impracticable to eradicate them. To produce new attitudes, equally firmly held, would take several generations. Men therefore try to modify rather than uproot the basic attitudes in making adjustments in a social system. They do so by making slight modifications in the accepted set of ideas and by analyzing the new situation in terms of these ideas. This leads to the propounding of a goal which is in accordance with the analysis. Thus, where there is adjustment to a new material situation, religious ideas not merely provide a positive goal but also harness traditional attitudes in the pursuit of this goal. In this way religious ideas provide a focus for a social movement. Without ideas there would not be a movement at all in the strict sense, but only social discontent without a single clear direction[30].

Conclusion

To conclude it can be said that the roots of civilizational clash between Christian and Islamic identities are very deep. It can be traced out in religious circles in the very initial stages. With the passage of time it developed into many phases and spheres i.e. cultural, defence, scientific fields, economy and much more in the war arsenals. Several complicated reasons can

be counted behind this wrestling. One aspect remained always superior and that is spiritual entity as compared to Christianity, towards Islam. Instead of improving this side the west laboured in war techniques that rolled over the monitorial powers towards it by hook or by crook!

References

1. Orientalism, Edward W, Said Geo-9 Roohani Art Press Islamabad, 1994, P. 4.
2. The Daily Telegraph, Oliver Roy, January, 2005, P. 3.
3. Paul Todd and Jonathan Bloch, Global Intelligence, The World's Secret Services, 175 Fifth Avenue, New York United States of America, 2003, P. 129.
4. Hersh, M, Seymour, The Samson Option Israel's Nuclear Arsenal and American Foreign Policy, Random House, New York, 1991, P. 139.
5. Ibid., P. 155.
6. Gilbert Achear, Perilous Power, Paradigm Publishers, London, 2007, P. 16.
7. Ibid.
8. Gulan, Muhammad, Fetullah Questions and Answers about Islam, V-I New Jersey, United States, 2010, P. 59.
9. Ibid., P. 61.
10. Ibid.
11. Miller E; Roland, Islam and Jehad Penguine Books, London, 2009, P. 101.
12. Karen Armstrong, Muhammad Oxford University Press, United States, 200, P. 79.
13. Esposito, L. John, Muslims and the West Encounter and Dialogue, Penguine Books, Vigo Street London, 1996, P. 131.
14. Nisar Ahmad Dr., Islam and Mustashriqeen, Dar-ul-Musahafeen, Azam Garh Bharat, 2003, P.7.
15. Douglas Pratt, The Independent, London, September 21, 2012, P. 4.
16. Amitabh Pal, Islam Means Peace, Understanding the Muslim Principle of Non-Violence Today, Senta Barbara, California, United States of America, 2011. P. 121.
17. Atta Rabbani, The Daily DAWN, Karachi, Pakistan, August 21, 2011, P. 11.
18. Ibid.
19. Ibid.
20. Mclaurin R. D., Muhammad, Oxford University Press, London, United Kingdom, 1977, P. 31.
21. Robert Fisk, Pity the Nation, Lebanon at War Andri Doutsch, Limited, London, 1990. P. 377.
22. Allien H. Dana and Steven Simon, The Sixth Serial. Iran, Israel, America and The Rumors of War, Oxford University Press, New York, 2010. P. 131.

23. Hoffmann, Erik, P. and Fleron, Frederic J, Jr The Conduct of Foreign Policy, Aldine Publishing Company, New York, 1971. P. 299.
24. Montgomery, Watt Muhammad, Prophet and Statesman, Penguine Books, London, 1981. P. 121.
25. Saba Mehmood, The Economist, Singapure, January 16, 2014, P. 11.
26. Ibid.
27. John Freely, Light from the East, I.B. Tauris & Co. Ltd. 6 Salem Road, London, 2011. P. 110.
28. David Ghanim, Iraq's Dyfunctional Democracy, Santa Barabara, California, United States of America, 2011. P. 208.
29. Montgomery Watt, P. 21.
30. Ibid.

The New Muslim Generation in Japan: Challenges and Future

Muhammad Arif Mateen, Dr. Sher Ali ☆

Abstract

"As Muslim immigration trends continue to make Japan a religiously diverse country, Japan's global claim of peace policy multicultural society has been facing various challenges. The new non-indigenous Muslim generation is being nurtured to compete with an array of identity dimensions in their lives and various others including Islamic faith, ethnic culture heritage of their parents, their exposure to the standards and practices of Japanese culture through school, politics and the media.

Thus, they seem as a matter of fact, to be "caught between two worlds," in between the religious and cultural identities and experiences of their parents and those of the mainstream Japanese culture, on the other.

This paper aims to examine the problems and challenges faced by the new Muslim generation in Japan, finding some measures and suggestions based on realistic experiences for the better future of Muslims in Japan."

Keywords: Religion, Japan, Muslims, Problems, New Generation

1.1 Conspicuous features of Muslims in Japan

In order to better understand and examine the contemporary problems faced by the new Muslim generation in Japan, it is necessary first to study the circumstances under which the Muslims are living in Japan and investigate the integration and acculturation experiences of the first Muslim generation within the Japanese context. The salient features of Muslims in Japan are as follows:

☆ Ph.D Scholar, Islamic Studies and Arabic, Government College University, Faisalabad

☆☆ Assistant Professor, Islamic Studies and Arabic, Government College University, Faisalabad

- Provoked principally by financial, cultural and economic reasons, a bulk of Muslims populace in Japan have migrated from different Asian countries for instance India, Pakistan, Bangladesh, Sri Lanka and Iran and Middle East.[1]
- Roughly eighty percent of the Muslims in Japan belong to the working class. They endure many problems starting from being deficient for the employment opportunities largely due to the reality that they are not well educated or qualified to properly adjustment to the situation of Japan, which enjoys a rich traditional heritage and different religious traditions.
- A huge number of overseas Muslims are living in Japan beyond their visa periods.
- Muslim population in Japan is scattered, living far away from one another, perhaps not even hundred in one place all within a walking distance of half an hour.
- There are the Japanese and the foreign Muslims, with a variety of “brands” of Islam: Saudi, Egyptian, Iranian, Southeast Asian, Indo Pakistani, etc.
- The local Muslim population is far less in number than those from abroad. Moreover, there is no close communication between them and there is something like a cultural gap.[2]
- The Japanese people in general Japanize everything before adopting it. Christmas is commercialized and made a Japanese festival although the Christians constitute not even one percent of the Japanese population. This goes for language, foods, western dress and fashion, and even inventions from abroad. Many would like to do the same with Islam.[3]
- Muslims living in Japan can be categorized into the following five groups: The first group includes of trainees who stay in the country for a short term (three months). The second category is of people who live in Japan and do unskilled jobs. Admitting the fact that some of these have higher educational degrees or qualifications colleges or universities in their home country. The third group is composed of businessmen such as traders. They are mainly engrossed in exporting second-hand cars and importing halal foods or commodities from Islamic countries for the local Muslim communities in Japan.

Commonly they speak fluent native language, become easily familiar with Japanese traditions, marry Japanese women, and even become naturalized Japanese citizens in many cases. The fourth group is characterized by their professional knowledge, qualifications, and higher degrees in Japanese or Western universities. They are the elite Muslims or students in Japan. The last group is made up of indigenous people who have converted to Islam, personally, by international marriage or by invitation.

- A great number of Muslims in Japan are married to indigenous Japanese women.
- Learning and then mastering the native language to a fluent degree is quite hard as compare to mastering Western languages such as English and French.
- Japanese speaking Muslim Dawah workers, teachers and scholars are very limited in number as well as on the other hand the vast majority of second generation of Muslims in Japan is not adequately proficient in their mother tongue so that they could understand sophisticated religious literature.[4]

1.2 The Contribution of Muslim Community to Japanese society

This is, no doubt, unfair not to mention the contribution of Muslim community, more or less to the civil society of Japan. This aspect, in general, is not given much attention in the books and the articles by scholars working on Islam and Muslims in Japan.

There are many elements of Muslim community in Japan which can be studied such as their role in dynamic process of democratization and Islamic teachings to follow the authority and law and order etc.

For example, the khutbaat and the sermons delivered in the mosques and various other religious ceremonies mainly address the Islamic principles, which are strongly related to ethics and values in order to become a good citizen, similar to Buddhism and Shintoism. Indeed, these are also the principles of civil society. Fulfilling the spiritual requirements of people, facing challenges in family life on social or economic levels, can also be helpful to reduce the number of suicides, which has been

an increasing problem of post modern industrialized Japanese society.

Although, other religions like Buddhism and Shinto are also providing their services in tackling this social problem. However, well balanced Muslim approach having strong family system, certainly a distinct feature of Muslim community needs to be shown up. Moreover, humanitarian aid provided to the victims by Muslim community on different catastrophic incidents like earthquake and tsunami in Japan is also admirable.

Bakti mentions the links between Muslim religious learning and study group and potential businessmen or wealthy Japanese people in order to encourage the channeling of their prosperity and affluence while encouraging piety among their employees as well as a strong work ethos to expand their new business networks.[5]

The Muslims in Japan commonly own used car export businesses, trade Islamic food, own restaurants and staple stores. Thus, they can also provide employment to new immigrants. As Japan is a Centre of the automobile industry and since cars are abundant and need to be exported, the Muslims of Southern Asia in particular have started exporting these cars to their countries, a business which has led hundreds of car dealers including devoted Muslims to prosper.

Consequently, they are able to sponsor the building of mosques and other activities, and can accommodate new immigrants. Many Muslims also open food businesses, in particular *halal* food and restaurants, which also employ Muslim immigrants.[6]

In short, it is vital to examine the relevance of Islam with civic values as well as the importance of Muslim associational life style for post-modern Japanese society.

1.3 Main Problems Encountered by New Generation of Muslims in Japan

Muslims living in Muslim minority countries all over the world are facing almost similar problems. However, the intensity rose when these encountered by next generations of Muslims. The case of Japan for second generations is too similar some ways but different in many others. These challenges are same on the subject of racism, discrimination, misconceptions, stereotyped image of Islam and prejudice in workplaces, public

transit, and shopping centers and in their neighborhood etc. Nonetheless, the problems are diverse in terms of educational, intellectual and social levels.

For example, as mentioned above that the greater part of Muslim migrants in Japan are married to indigenous Japanese, while Muslim migrants in the West have a tendency to marry from amongst themselves rather than natives.

Learning and mastering the local language to a fluent level is another obvious problem in Japan as Japanese language is not an easy language to master in it as compare to Western languages including English, French and German. Therefore, the scholars and the teachers who can speak in fluent Japanese are not many in numbers. Moreover, the mainstream second generation of Muslims in Japan is not satisfactorily proficient in their mother language to read and understand the religious texts which is most of time found in more sophisticated form. On the contrary, English or other occidental language speaking scholars are numerous and therefore it seems to have good links between second and third generations of migrants and scholars in their countries of origin.[7] Keeping these differences in mind, we are now able to examine the main challenges faced by the new Muslim generation in a better way.

1.3.1 Islamic Education

It is an admitted fact that providing an adequate Islamic education to Muslim children has been one of the major problems. Although, in order to resolve the issue, numerous individual efforts without official assistance on various levels have been made such as Sunday classes and Arabic language classes but there is no school with Islamic teaching under Muslim control.

In addition, unsurprisingly the content about the Islam and Muslim world taught in Japanese educational schools and institutions from elementary level to university level is traditionally very little.[8] To make the picture clearer it should be noted here that the official education policies have the tendency to endorse assimilation into Japanese norms keeping this in mind that official Japanese attitude is that Muslims should be grateful for being able to attend Japanese public schools. It is due to the reality that the Japanese recognition of Islam is tremendously low at the education ministry and in local governments. [9]

Indeed, in terms of building constructive relations with Muslim world some serious initiatives have been taken in university programs but one might reasonably expect more to expand the relevant content about Islam in school textbooks as well for a stronger and long-term Japanese interest. This will certainly increase on one hand, Japanese capacity to deal with cultural differences on grass root level and make on the others side, foreign Muslims send their children to Japanese school comfortably. Due to the fear of receiving influence, contemporary Japanese youth culture and many other problems like clothing and school meals many parents do not wish to send their children to Japanese schools.

To reduce the cultural influence on their children as much as possible is one of the major wishes of parents during the educational process of their children. They are much concerned about receiving the ideas and bad influence from contemporary Japanese youth culture. In order to educate their children as Muslims the parents can take full advantage of the support from the mosques located in their local community. Children can learn for example, about fundamental beliefs, values, and teachings pertaining daily life affairs such as the doctrine of oneness of Allah, Prophethood, life after death, heaven and hell etc. There is a fear of experiencing a psychological conflict in case of contradictions and inconsistency in what they are learning at home, what they are learning from school and what they are learning through daily contact with friends. Therefore, Muslim parents in Japan feel that it is essential to establish Muslim schools many in numbers where they can maintain consistency among their home, their education and their community.[10]

Moreover, the concerns of Muslims in terms of Islamic education are not confined to only above mentioned but this list further goes to many others including clothing, physical education, language, school meals, and non-Japanese teachers. Among these, the unique problems which are very much linked with essentials of their religions such as school uniforms, school lunches, co-education for physical education activities like swimming, and the lack of teachers from Muslim countries.[11]

However, when a non-Japanese Muslim mother discuss about problems for Muslims, such as school meals and sex education with a class teacher or school management and asks

the school to realize religious needs of their children, the school authorities tend to accept their requests as special cases.

Furthermore, it is much more difficult to receive special consideration for a Japanese Muslim mother.[12] Generally, a teacher would ask to the requesting mother "what nationality are you?" and she would have a dilemma deciding between her Muslim identities and traditional Japanese. Often their requests are ignored because of the perceived norms of being "Japanese" in society.

To resolve the problems, the dispatch of teachers from Islamic countries and their acceptance into Japanese public schools should be considered by the government. It is also required to identify that contact with "unknown" Islam has just started, and there is no reason to stop the creation of Muslim private schools when all required legal conditions are fulfilled.

Another positive point, which needs to be highlighted, is that keeping order in the classroom for Muslim students is much easier to handle than to other foreign students. Because Muslim children, as they are taught to respect and not question elders and those in authority, are willing to accept teachers' orders in school. This quality is largely admired in Japanese culture.[13]

1.3.2 Familial Problem

While it is generally true that Muslim families are stronger by many measures than their non-Muslim counterparts, nevertheless there are problems that Muslims face in their family lives.

The Multidimensional familial problems are intensified in the cases where spouses are from different cultures. We know that a large number of Muslims married Japanese women converting them to Islam. It is also notable here that the percentage of foreigners with a spouse/child visa increased rapidly through the early 1990s and was the highest at 18.5% in 1997 before declining to 13.0% in 2004.[14]

As most foreign Muslim husbands are not well-educated and probably come to Japan for economic opportunity and the peaceful stability of Japanese society, this consequently resulted in forming numerous issues like domestic violence, weak relationship between husband and wife, unwillingness of accepting spouse's culture and life style, etc.

The familial problems are not confined to husband and wife but the real victims are their teenager children especially in terms of their Islamic education as mentioned above.

In order to provide an Islamic education to their children they relocate to an Islamic country. Most of the time non-Japanese father remains in Japan to work.

However, the most trendy third-country location for Japanese wives and children to relocate for education to Muslim countries is UAE and Sharjah.[15] Although in the beginning, many of the husbands want to nurture their children in their original countries such as Pakistan, India or Bangladesh, but their wives disagree with the idea and as a compromise eventually relocation to UAE come about. The wives consider hard to live in the countries of their husbands and thus resist relocating to such counties. Admitting the fact that in most case, living with the husband's kin, many wives who returned to Japan after relocating the countries of their husbands are noted to have an inability to adapt to the local lifestyle.

There are many factors in these results. For example sometimes the family refuses to respect Japanese culture and customs with regard to question of how to raise child. This happens often even in the cases when it is allowed by Islam teachings or sometimes excessive interference from the husband's kin. As a woman and because of their position as a foreigner they have to face significant intervention from the husband's family members with regard to the ways they raise their children and thus they are expected to bear the major burden of childcare. Consequently, as a result of being a complex minority with the twofold factors of ethnicity and gender these women experience many issues and conflicts in the countries of their husbands. However, in the case of a nuclear family living in UAE this problem is reduced to a great extent.[16]

In addition to that, towards explaining the details of the various requirements of Islam some Japanese wives complain about the reticence and silence of their husbands. As Muslims should be concerned about the need to elucidate Islam but perhaps these husbands just neglect their duty and responsibility in this regard or on the contrary perhaps their wives do not listen well to their explanations. In spite of all this, the other side of the picture should not be neglected that without any doubt there are many Japanese converts ladies who

are proud of their husbands who treat them as well as their parents better than Japanese men.

In short, the problems can be overcome or at least minimized through education, mutual assistance, counseling, liaison and supportive services. Families can only be successful and flourished on the base of Islamic teachings. This will pave the way to up bring second generation in the peaceful, healthy and stable environment of a Muslim house.

1.3.3 Acculturation Issues and Transnational Identities

Comparison between the situation of acculturation in Japan and West may appear easy for some people on the base that nations like Italy and Germany also for a long time had an image of themselves as more or less ethnically "homogeneous".

Nevertheless one major difference is as Eskil O. Vestre mentions, that Japan has not processed its former role as an Axis power in the same way, possibly indicating historical and regional differences between European and East Asian nations that cannot be ignored.[17]

This is why issues regarding acculturation faced by the new Muslim generation in Japan are not the same as in other countries where Muslims are in minority, particularly Europe.

As a matter of fact adolescence is a tumultuous time for second generation as they are trying to discover a sense of their real self. It is crucial for them to establish their sense of identity. The process of development of identity becomes more complicated for second generation because, on one hand they are often in their daily life matters, educational institutions or in society in general and feel pressured to suppress or discard their original culture and assimilate to Japanese culture and on the other hand their parents especially fathers do not allow them to do so for religious concerns. Thus they feel lost between two cultures and two countries.

In her qualitative research on Muslim immigrant workers in Japan, Onishi found that many of them developed a stronger Muslim identity or faith after having stayed in Japan for some time. She argues that they did this to regain some sense of control over their lives and to relieve stress by leaving their destiny in the hands of God while just doing their best in an everyday life filled with challenges such as prejudice and discrimination. She argues that when faced with discrimination and when failing to make Japanese friends, Muslim immigrants

give up on becoming integrated and turn to religion and/or stronger ties to their original country or culture.[18] As a result of failure in being accepted in mono cultural society, their ties are increasing to their home country.

Exploring the reasons behind this Shipper says that the lack of "structural assimilation" of foreigners in Japan can potentially lead to seclusion from society and long-distance nationalism. Foreigners face problems participating in Japan's political life and reasons include lack of policies to actively integrate them into society and institutional hindrances. As foreigners cannot vote or run for public office and are unable to become members in local welfare or human rights commissions and more, the political focus of most immigrants and their associations turns to long-distance nationalism.[19]

Arguments of Sakurai perhaps seems more practical as he says that because the second generation of Muslim immigrants in Japan - who are yet to become adults for quite a few more years - are unlikely to take collective action, being too ethnically and geographically divided.[20] Growing up spread across Japan, and being part of a very weakly organized minority, issues of Long-Distance nationalism and radicalization among young Muslims in Japan is not likely to become a problem. Onishi, employing Berry's concept of four strategies for acculturation, in her qualitative study of Iranian, Bangladeshi and Pakistani foreign workers found that they chose assimilation, separation or marginalization, but never integration.

1.4 A Better Future of Islam in Japan

Indeed, Muslim community over all is much concerned about these problems faced by second generation and are trying their best to meet the challenges. However, the most important aspect of their efforts is that they are not yet doing so in one integrated and unified effort. Until they must endeavor to overcome the challenges on collective level, the situation is not going to change easily. To solve the problems ensuring a bright future particularly for the new Muslim generation in Japan and the Muslims in general, the following measures and suggestions based on realistic experiences may also be considered:

- Muslims must be moderate and sensible in propagation of Islam and should never be rushed, aggressive, and

sentimental. They also must be law-abiding people in Japan and never over react even when instigated.

- The Japanese and foreign Muslims should invite one another`s families to their functions when possible.
- Successful Dawah in Japan needs a radical change in strategy and methodology which, indeed, requires a wise, charismatic and visionary leadership.
- As a matter of fact modern advancement in the communication technologies, from the phone to Internet, has changed the landscape of youth learning, culture, sociability and political engagement. This "e" or "internet generation" in a more interactive and less hierarchical way, and there is a greater scope for mutual influence. Muslims in Japan need to strap up efficiently the influence of mass media TV and Radio channels to present the information about Islam.
- By cheering up Muslims to shift near to the surrounding area of a Mosque, it is necessary for Muslim to deepen their efforts in creating a real Muslim community around a Mosque.
- To establish an educational system to cater the needs of the native Japanese converts. New members of the Muslim community should be supported and nurtured ensuring that they are taking the responsibility of front line Dawah activities, and eventually culminating in a wealth of Japanese Muslim Dawah worker as well as prominent Scholars. This would help certainly to counter and defeat the wide-ranging notion spread amongst indigenous Japanese citizens that Islam although beautiful, but for them and is only for foreigners who came to Japan.
- To secure as many living examples among Japanese speaking Muslims as possible for both growing generations and new Muslim reverts.
- Because Japanese belong to one of the world's most literate and well educated societies. They are very receptive as well as sensitive to superficial connotations, and for propagation of Islam only old fashioned Dawah is not appropriate for them. They lose interest in Islam when they view that the Muslims themselves are not applying in their live what they propagate. This is why; Muslims have to demonstrate an ideal image by their conduct rather than only routine Dawah work.

- Islam could be better appreciated by the Japanese better only if they are approached in an intellectual and logical manner with accurate Islamic literature. No doubt that recently, valuable works on Islam including Seerah of Prophet Mohammed (PBUH) and Tafsir of the Holy Qur'an by some highly educated Islamic scholars have produced
- The roots of Japanese religiosity, culture and lifestyle of Japanese people must be taken into consideration in order to form ways of the propagation of Islam in Japan. For example Muslims should elaborate and highlight not only the universal Islamic principles like equality, justice and ethical values but also fashion and designing, natural phenomenon and social networking.
- I would like to suggest here that, in order to draw the attention of Japanese populace towards the true message of Islam, Muslim communities can organize several memorial ceremonies in their own style on different Japanese festivals or days like "the Day of Mourning for the War Dead on 15 August. This will certainly give a sense of solidarity and unity to Japanese people.
- Last but not least, a real and good image of Islam can also be presented by taking part in works of charity and relief. After the tragedy of the earthquake and tsunami last year, the Muslim community proved that Muslims in Japan genuinely share the joys and sorrows of Japanese society. Members of the Muslim community contributed immensely to the relief efforts and they continue to help the affected communities in the *Tohoku* region. Islam teaches its followers to generously offer humanitarian aid wherever the need may arise. Muslims have gone on supporting relief efforts in Japan along with Japanese and foreign relief agencies.

In short, with the efforts of the vivacious community devoted and enthusiastic Muslims will soon be able to lead in Japan towards an era where its Muslim minority community will provide a model and an inspiration for the other Muslim minorities worldwide. Just like Japan as a country, which has performed exceptionally well in cultural, economic and technological areas for the rest of the world to admire and emulate.

References

[1] - Anis, B. (1998). The emergence of Islam and the status of Muslim minority in Japan. *Journal of Muslim Minority Affairs* [Electronic version], 18(2): 329-345.

[2] - Siddiqi, M.A.R. (2001). Problems of Muslim unity and leadership: A Japanese perspective. Islamic Guidance Society, proceeding of the IGS-ICOJ International conference, Kobe. P-100.

[3] - Hisham, Kuroda. (2007). Muslims in Japan: a preliminary report, Institute of Muslim minority Affairs Journal [Electronic version], 7 (1): 187-192.

[4] - Maeno, Ahamd, Abu Hakeem. (2011). Islam in Japan. Sacred knowledge. P- 8.

[5] - Bakti, A. F. (2009). Islamic religious learning groups and civil society: How do Muslims contribute to civil society in Japan and the Philippines? In *Confluences and Challenges in building the Asian Community in the Early 21st Century*. Tokyo: the Nippon Foundation, Japan. P- 43.

[6] - Bakti, A. F. (2009). Islamic religious learning groups and civil society: How do Muslims contribute to civil society in Japan and the Philippines? In *Confluences and Challenges in building the Asian Community in the Early 21st Century*. Tokyo: the Nippon Foundation, Japan. P- 43.

[7] - Maeno, Ahamd, Abu Hakeem. (2011). Islam in Japan. Sacred knowledge. P- 8.

[8] - Hideki, Maruyama. (2007). Diversity as advantage in a "Homogeneous" society: The educational environment for Muslims in Japan, *Shingetsu Electronic Journal of Japanese-Islamic Relations* [Electronic version] 75: 157-78.

[9] - Hideki, Maruyama. (2007). Diversity as advantage in a "Homogeneous" society: The educational environment for Muslims in Japan, *Shingetsu Electronic Journal of Japanese-Islamic Relations* [Electronic version] 75: 157-78.

[10] - Shiro, Ito. (2012). Educational Issues of Muslim Migrants in Japan, *Asian Social Science* [Electronic version], *8*(1): 104-106.

[11] - Hideki, Maruyama. (2007). Diversity as advantage in a "Homogeneous" society: The educational environment for Muslims in Japan, *Shingetsu Electronic Journal of Japanese-Islamic Relations* [Electronic version] 75: 157-78.

[12] - Hideki, Maruyama. (2007). Diversity as advantage in a "Homogeneous" society: The educational environment for Muslims in Japan, *Shingetsu Electronic Journal of Japanese-Islamic Relations* [Electronic version] 75: 157-78.

[13] - Hideki, Maruyama. (2007). Diversity as advantage in a "Homogeneous" society: The educational environment for Muslims

in Japan, *Shingetsu Electronic Journal of Japanese-Islamic Relations* [Electronic version] 75: 157-78.

[14] - Hiroshi, Kojima. (2006). Variations in demographic characteristics of foreign "Muslim" population in Japan: A preliminary estimation. *The Japanese Journal of Populati*on [Electronic version], 4(1): 118-119.

[15] - Shuko Takeshita. (2007). Muslim Families Comprising Pakistani Fathers and Japanese Mothers: Focusing on the Educational Problems of their Children. *Journal of Women of the Middle East and the Islamic World*, Brill [Electronic version], 6 (1): 202–224.

[16] - Shuko Takeshita. (2007). Muslim Families Comprising Pakistani Fathers and Japanese Mothers: Focusing on the Educational Problems of their Children. *Journal of Women of the Middle East and the Islamic World*, Brill [Electronic version], 6 (1): 202–224.

[17] - Eskil, O. Vestre. (2011). Japan as an Emerging Multicultural Society Exploring Contemporary Minority Issues Through the Case of Muslim Immigrants. Thesis, (M.A). The University of Oslo. P- 76.

[18] - Onishi, Akiko. (2008). Becoming a better Muslim. In David Blake Willis, D. B., & Murphy-Shigematsu, S., (Eds.), *Transcultural Japan: at the borderlands of race, gender and identity*. NY: Routledge. pp- 224- 239.

[19] - Shipper, Apichai, W. (2008). Fighting for foreigners. Cornell University Press. p- 68

[20] - Sakurai, K. (2008). Muslims in Contemporary Japan, *Asia Policy* [Electronic version], 5(1): 69-87.